ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO. 891-43905 1685J9URD
Accession No. ۲۵۹۹۰

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO. ______________

Accession No. ______________

انجمن ترقی اردو (ہند) [illegible] ۱۱

Call No.............. Acc. No....................

شبلیہ دار

[illegible] JA

ناشر

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

انجمن کی مطبوعات

۱- اردو ہندی لغت	مرتبہ انجمن	۲۰٫۰۰
۲- حیات اجمل	قاضی عبدالغفار	۸٫۰۰
۳- حیات سرسید	نورالرحمٰن	۳٫۵۰
۴- یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	۴٫۲۵
۵- احوال غالب	مختار الدین احمد	۹٫۰۰
۶- نقد غالب	″	۱۰٫۰۰
۷- محاسن کلام غالب	ڈاکٹر بجنوری	۱٫۰۰
۸- ذکر حافظ	سجاد ظہیر	۲٫۲۵
۹- میر تقی میر	خواجہ احمد فاروقی	۱۲٫۰۰
۱۰- ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۳٫۷۵
۱۱- ادبی و قومی تذکرے دو حصے	پنڈت کشن پرشاد کول	۱۱٫۰۰
۱۲- پرچھائیں	آصف علی	۴٫۰۰
۱۳- ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵٫۵۰
۱۴- اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ		۵٫۵۰
۱۵- باپو کے قدموں میں	راجندر پرشاد	۱۵٫۰۰
۱۶- سیاسیات کے اصول	ہارون خاں شروانی	۵٫۰۰
۱۷- دھمپد	ترجمہ منور لکھنوی	۳٫۰۰
۱۸- مدرا راکھشس	″	۳٫۵۰
۱۹- قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶٫۰۰
۲۰- ہندوستانی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسین	۴٫۵۰
۲۱- اطلاقی سماجیات	″	۴٫۵۰
۲۲- اسلامی فن تعمیر	مبارز الدین رفعت	۶٫۰۰
۲۳- ایک مشرقی کتب خانہ	″	۳٫۰۰
۲۴- مرقع افغان	ابرار فاروقی	۳٫۲۵

۲۵- تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۴٫۵۰
۲۶- کچھ زر کی بابت	ابو سالم	۴٫۵۰
۲۷- مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴٫۰۰
۲۸- کاروان معیشت	نجم الدین شکیب	۶٫۵۰
۲۹- شوپنہار	مجنوں گورکھپوری	۱٫۵۰
۳۰- تاریخ جمالیات	″	۲٫۰۰
۳۱- زندان نامہ	فیض	۲٫۲۵
۳۲- سن ستاون	پنڈت سندر لال	۴٫۰۰
۳۳- ہندستانی اخبار نویسی	عتیق صدیقی	۱۲٫۰۰
۳۴- مقالات حالی حصہ اول		۳٫۲۵
۳۵- تذکرہ شعرائے جے پور		۶٫۵۰
۳۶- چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	۱٫۲۵
۳۷- اردو صرف	″	۱٫۰۰
۳۸- انتخاب کلام میر	″	۲٫۵۰
۳۹- نفسیات افواہ	ولی الرحمٰن	۱٫۷۵
۴۰- انواع فلسفہ	ظفر حسین خاں	۵٫۵۰
۴۱- اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام		۱٫۰۰
۴۲- انتخاب جدید	مرتبہ آل احمد سرور	۳٫۰۰
۴۳- نوائے ظفر	مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی	۳٫۲۵
۴۴- شکنتلا	کالی داس	۲٫۰۰
۴۵- انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۲٫۵۰
۴۶- نئی روشنی (ڈراما)	فضل الرحمٰن	۱٫۲۵
۴۷- مشترکہ زبان	مہاتما گاندھی	۴٫۵۰

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

جلد ۸

سنہ ۱۹۵۹ء

اُردُو اَدَب

آزاد نمبر

ک ... اسلامیہ دہلی

(بیادگار مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم)

انجمن ترقّیٔ اُردُو (ہند) کا شش ماہی رسالہ

اڈیٹر

پروفیسر آل احمد سُرور

شائع کردہ

انجمن ترقّیٔ اُردُو (ہند) علی گڑھ

قیمت پانچ روپے

علاوہ محصول ڈاک



[illegible] دہلی

اُردُو اَدَب

آزاد نمبر

فہرست مضامین

[illegible]

مولانا آزاد ــــ ایک تاثر

آل احمد سرور

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کو دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اس عرصے میں خود مولانا کے حالاتِ زندگی جو اُنھوں نے پروفیسر ہمایوں کبیر کو لکھوائے تھے اور جن پر انھوں نے خود نظر ثانی کی تھی، "ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے" کے نام سے انگریزی میں شایع ہوئے۔ ہمایوں کبیر کے جمع کئے ہوئے مضامین کا ایک مجموعہ بھی انگریزی میں نکلا۔ مولانا کے متعلق دو کتابیں عبدالرزاق ملیح آبادی کی شایع ہوئیں ایک ملیح آبادی کی زندگی میں اور دوسری اُن کے مرنے کے بعد۔ ایک کا نام ہے، "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" دوسری کا نام ہے 'ذکرِ آزاد'۔ پہلی کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں مولانا کی بول چال قلم بند کی گئی ہے، دوسری میں ملیح آبادی نے مولانا کی رفاقت کے اڑتیس سال کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ نقشِ آزاد کے نام سے مولانا کے وہ خطوط بھی منظرِ عام پر آ گئے ہیں جو اُنھوں نے غلام رسول مہر کو لکھے تھے۔ مولانا کی یاد میں مختلف اخباروں اور رسالوں نے خاص نمبر نکالے۔ ان میں آج کل دہلی، صبا حیدرآباد اور الجمعیۃ دہلی کے خاص نمبر خاصی اہمیت رکھتے ہیں، مولانا کی شخصیت، اُن کی مذہبی، سیاسی، ادبی اور تہذیبی خدمات پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی اُن کی ساری اُردو تحریروں کو گیارہ یا بارہ جلدوں میں شایع کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔ ان میں سے ترجمان القرآن کی دو جلدیں طباعت کے لئے تیار ہیں۔ مولانا کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط پہلی دفعہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان میں وہ خط بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھے گئے تھے۔ پروفیسر مجیب نے مولانا کے 'تذکرہ' کا انگریزی میں ترجمہ کر لیا ہے۔ پروفیسر مجیب انگریزی میں اُن کے مذہبی افکار پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے مضامین کا مجموعہ عنقریب شایع ہونے والا ہے۔ پاکستان میں رئیس احمد جعفری نے مولانا کی کتاب 'ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے' کے حسبِ منشا اقتباسات کا ترجمہ اپنے طول طویل حواشی کے ساتھ تیار کر کے اپنے دل کا بخار

نکالا ہے اور اپنے زعم میں تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ الہلال کے بعض مضامین کے متعلق بحث شروع ہوگئی ہے کہ وہ مولانا کے تھے یا سید سلیمان ندوی کے۔ غرض مولانا کی تعریف و توصیف، تحسین و ستایش میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اُن پر اعتراضات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ یہ سب قدرتی ہے۔ مولانا کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ اُن کے کارنامے ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہیں۔ مذہب، سیاست، ادب، صحافت، خطابت اور کتنے ہی دوسرے شعبوں پر اُنھوں نے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی جی کے رفیقوں میں ان کا نام سرِفہرست ہے۔ وہ پیری مریدی کے ماحول میں پیدا ہوئے مگر زاہدِ خشک نہ بن سکے۔ اُنھوں نے قدیم علوم کی فضا میں آنکھ کھولی مگر اس فضا کی تنگی سے گھبرا کر جدید علوم کی دنیا کی طرف آئے۔ سرسید کے اثر نے اُنھیں شبلی کی طرف مائل کیا اور پھر شبلی سے آگے چلنا سکھایا۔ پین اسلامزم کے دھندلکے سے نکل کر وہ قومیت کی شمع کی طرف بڑھے۔ قومیت کے جذبے نے اُنھیں ہندوستان کی جنگ آزادی کی صفوں میں پہنچا دیا۔ مطالعے نے تحریر کا شوق دلایا۔ کچھ دنوں شعر سے جی بہلاتے رہے مگر پھر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوگئے۔ الہلال کے ذریعے سے اُنھوں نے اُردو صحافت کو معیار اور مقصد دیا۔ اپنی دل ہلانے والی تقریروں سے اُنھوں نے ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک ایک ہلچل مچا دی۔ قومی زندگی کے ہر موڑ پر اُن کا نقشِ قدم ملتا رہا۔ جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھری سے وزارت کی مسند تک، دار و رسن کے سائے سے اقتدار کے بام تک، بت شکنی سے بت گری تک، بغاوت سے حکومت تک، اُن کی زندگی ایک ایسا کرشمہ ہے کہ برابر دامنِ دل کو کھینچتا رہتا ہے۔

اُردو ادب کا یہ خاص نمبر جو بڑی تاخیر سے شایع ہو رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ نمبر بھی جامع نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد پر آیندہ کام میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔ ابھی تو مولانا کی قد آور شخصیت کا سایہ ہمارے ذہنوں پر پڑ رہا ہے۔ یہ تاثرات کا دور ہے۔ تنقید کا دور کچھ دن بعد آئے گا۔ مگر یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آیندہ تنقید میں ان تاثرات سے ضرور مدد ملے گی۔ تاثر کی منزل سے گزرے بغیر تنقید ایک بے روح فیصلہ ہو جاتی ہے۔ تاثر کی حرارت سے تنقید میں گرمی اور روشنی آتی ہے۔

میرے نزدیک مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تقریر و تحریر، افکار و اعمال سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نادر مثال قایم کی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اِسی ملک کا ایک اہم جز ہیں۔ اُنھوں نے اس کی تاریخ بنائی ہے۔ اس کی تہذیب کو ایسی قدریں دی ہیں جنھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اس کی رنگا رنگی میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے نگار خانے کو اپنے آئینوں سے سجایا ہے۔ اس کی چمن بندی میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ مگر کچھ

اپنوں کی ناسمجھی سے، کچھ دوسروں کے بہکانے سے، کچھ ہمسایوں کے ستم سے، انھوں نے اپنی ڈیڑھ کی اینٹ کی مسجد الگ سی کر رکھی ہے۔ سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کو عقلیت کی شاہراہ پر لانا چاہتے تھے۔ اس شاہراہ میں کچھ دیر وقتی ضروریات کے لیے ستانے کا پروگرام بھی تھا۔ مگر سرسید کے جانشینوں نے وقتی پروگرام کو پالیسی سمجھ لیا اور اس پالیسی کو مسلک بنا لیا۔ اگرچہ علما اور جدید نسل کے کچھ نمایندوں نے قومی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دیا، مگر مسلمانوں کی بڑی تعداد یا تو ماضی کے نشے میں گرفتار رہی یا پالیسی سامراج کی مشین کا پرزہ بنی رہی۔ سرسید کے راستے میں بھی مذہب کا مروجہ تصور حائل ہوا تھا۔ انھوں نے اس کی روح کی طرف اشارہ کر کے اپنی بات کہی۔ مگر روح کا تصور مشکل ہے۔ انسان خوگر پیکر محسوس ہوتا ہے۔ اسی سے عام طور پر مذہبی ضروریات کا نام لے کر مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد کو محفوظ رکھنے کی کوشش ہوتی رہی۔ مسلمانوں کے لیے ایران اور توران کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ سے زیادہ جاذب نظر رہی۔ ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کی آمد سے قبل ان کے لیے ایک پرچھائیں رہی۔ جاگیرداری نظام کے کمزور رشتے اُن کے لیے سب کچھ رہے۔ جدید علوم جن میں نئی دنیا اور نئی فضا تک پہنچنے کی کنجی تھی، اُن کے لیے صرف روزی کا وسیلہ بنے۔ مغربی تہذیب جو بہت سی خرابیوں کے باوجود خدمت خلوص اور خودشناسی کے کتنے ہی سبق رکھتی تھی، 'بیکاری'، 'مے خواری اور افلاس' کے مترادف سمجھی جاتی رہی۔ "عشق" کے نام پر سستی جذباتیت کو فروغ دیا گیا اور عقل کی نارسائی کی داستان چھیڑ کر صوفیت 'اپنے سے آنکھیں چار کرنے اور اپنے نقابوں کو اتار پھینکنے سے باز رکھا گیا۔ جگر کے ایک شعر میں یہ کیفیت بڑی خوبی سے قلم بند ہوئی ہے ؎

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے

سرسید کی تحریک ہندوستان کے اس نئے جیون کا ایک حصہ ہے جو مغرب کے اثر سے ظہور میں آیا اور جس کے نقوش سب سے پہلے رام موہن رائے کے یہاں ملتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر اب بھی ہماری فکر پر نہ تو ہندوستان کے افکار کا بھرپور اثر ہے نہ مغرب کا۔ ہم نہ مکمل ہندوستانی ہو سکے نہ مکمل مغربی۔ بیچ میں معلق رہے۔ اگر ہمارے افکار کی جڑیں ہندوستانی افکار کی زرخیز مٹی میں پیوست ہوتیں تو مغرب کی تند و تیز ہواؤں کا زور ہم برداشت کر سکتے۔ ہمارے افکار کی جڑیں اسلام کی حقیقی اور جمہوری تعلیم میں بھی نہ تھیں۔ اس تقلیدی تصور میں تھیں جو شرح اور تعبیر کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے جو فروعی اور بنیادی خیالات میں فرق نہیں کر سکتا، جو قرآن سے زیادہ فقہ کی جزئیات کو اہمیت دیتا ہے۔ ہم نے مغربیت سے بہت سستا مفاہمہ کر لیا، یعنی روزی کے لیے جو وسائل وہ مہیا کرتا تھا، اُنھیں اختیار کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ کلرکوں کی ضرورت ہوئی تو ہم نے کلرک مہیا کیے۔ بچوں کے لیے اُستادوں کا مسئلہ آیا تو ہم نے خراد پر چڑھا کر اُستاد ڈھالنے شروع کیے۔ جب سائنس کی ضروریات کا احساس ہوا تو ہم نے سائنس کی روح کو جذب کیے بغیر اُس کے ہنر کا استعمال کرنا بہتر سمجھا۔ ہندوستان میں مسلمان

فاتح کی حیثیت سے آئے تھے ۔ مگر وہ یہاں ایک اقلیت تھے ۔ اقلیت کی اپنی ہر اچھی بری چیز کو محفوظ رکھنے کی عادت بھی ہم میں آگئی ۔ تاہم ان پر ہر وقت یہ خوف مسلط رہا کہ اکثریت ہمیں پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے ۔ دنیا جاگیرداری کے تمدن کو خیرباد کہہ کر سرمایہ دارانہ دور سے گزر کر اشتراکی سماج کی منزل اور سرمایہ دارانہ اور اشتراکی تصورات کی کشمکش اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش تک پہنچی، مگر ہندوستان کے مسلمان ان حقایق سے صرف جذباتی طور پر ہی متاثر ہوئے ۔ ان کا مزاج جاگیردارانہ تمدن کا مظہر رہا ۔ ان کا تہذیبی تصور لطافت ، نزاکت ، دوپہری تیسرے شام بھرم بھاری اور پٹارا خالی ، طنز کے نشتر اور خیال کی بزم آرائی سے وابستہ رہا ۔ ان کی سیاست موقع پرستی ، سودے بازی ، حقوق طلبی کے چکر سے باوجود چند اشخاص کی مخلصانہ کوشش کے نکل نہ سکی ۔ جب بیسویں صدی کے آغاز میں ابوالکلام آزاد نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں ، گھر پر نہیں عالم اسلامی پر دیکھیں یعنی لڑائی تھی اور ہاتھ میں تلوار نہ تھی ۔ مولانا کی دور بین نظروں نے بہت جلد دیکھ لیا کہ جب تک گھر کے دکھ درد میں شرکت نہ ہو اور گھر میں طاقت نہ آئے ، دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے کچھ نہیں ہوتا ۔ الہلال نے اسی نسخے کو مذہب کی زبان میں پیش کیا کیونکہ لوگ یہی زبان سمجھتے تھے ۔ وہ سرسید سے بہت متاثر ہوئے تھے ۔ انھوں نے سرسید کے انقلابی پیام کو سمجھ لیا تھا ۔ سرسید جانتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اسلام کے ایک محدود ، جامد اور رسمی تصور سے پہنچا ہے ۔ ان کا ایمان تھا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی زندگی کے ہر تقاضے کو پورا کر سکتا ہے اور ہر دور میں اس کی صداقت واضح ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کی روح کو سمجھا جائے اور اسی روح کی خاطر رسم و رواج کا جو خس و خاشاک جمع ہو گیا ہے اُسے دور کیا جائے ۔ مذہبی اور معاشرتی مسایل میں عقلیت ۔ تہذیبی اور ادبی معاملات میں افادیت ، سرسید کا مسلک رہی ۔ سیاست کو سرسید نے چونکہ تمام چیزوں کا نچوڑ سمجھا اس لیے اس کے لیے پہلے مناسب تیاری یعنی تعلیم کی ضرورت محسوس کی اور اسی تیاری یعنی تعلیم کے لیے مغربی تعلیم کی حیات آفریں قدروں کو اپنایا ۔ اسی سے فوری فایدے بھی مد نظر تھے ، مگر یہ کہنا سرسید کی توہین ہوگی کہ سرسید صرف فوری نفع کو دیکھتے تھے ۔ سرسید کے فوری اور وقتی پروگرام سے انگریز پرنسپلوں ، حکومت اور سرسید کے جانشینوں نے فایدہ اٹھایا اور اسی کی تقلید کو کافی سمجھا ۔ مگر سرسید کی انقلابی تحریک صرف انگریز پرستی یا ملازمت یا تجدد نوازی کی تحریک نہ تھی ، یہ زندگی کا ایک جامع تصور رکھتی تھی اور اسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ یہ جدید تعلیم کے ذریعے سے تہذیبی تصور کو بدل کر مسلمانوں کی قیادت کے بجائے جدید تعلیم یافتہ نسل کے سپرد کرنا چاہتی تھی ۔ مولانا آزاد گھر کے مذہبی ماحول سے مطمئن نہ تھے ۔ ایک بے چین روح اور گہرے تجسس نے مطالعہ کا عادی بنا دیا ۔ وہ اپنے والد کے عقاید سے اس درجہ بیزار ہوئے کہ انھیں اسی ماحول میں ایک گھٹن محسوس ہونے لگی ۔ رفتہ رفتہ وہ سرسید کے قریب پہنچے اور گو سرسید کی سیاسی پالیسی اور انگریز پرستی سے

انھیں ہمیشہ اختلاف رہا۔ مگر سرسید کی عقلیت کو اُنھوں نے واقعی اپنایا۔ اُنھیں ایک طرف علما کے فرقے کی مناظرہ بازی اور باہمی چپقلش پسند نہ آئی دوسری طرف جدید نسل کی حقوق طلبی، انگریز کی خوشامد اور مفاد پرستی۔ اُنھوں نے الہلال کے ذریعے سے بدیشی سامراج کی مخالفت کی، ہندوستان اور ہندو اکثریت سے دوستی پر زور دیا، ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی جب ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی تو گاندھی جی کے ساتھ علی برادران کی مخلصانہ مگر جذباتی کاوشیں بھی تھیں، مگر ابوالکلام آزاد ان سے زیادہ گہرا شعور اور بلند نظر رکھتے تھے۔ علی برادران ہنگاموں پر جیتے تھے اور جب فرقہ وارانہ فسادات نے آزادی کی تحریک کو کچھ دن کے لیے دبا دیا تو یہ لوگ ایک ہنگامے سے دوسرے ہنگامے کے ساتھ لگ گئے۔ ابن سعود کے خلاف معرکوں میں محمد علی جیسے ذہین اور قابل آدمی کا اپنا بہترین وقت صرف کرنا اور آزادی کے مردِ مجاہد کا اکثر مولویوں کے مناظروں کے لیے صفیں آراستہ کرنا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

مولانا آزاد اگرچہ اسی زمانے میں گوشہ نشین رہے مگر اُنکے خیالات میں تبدیلی نہ ہوئی۔ نہرو رپورٹ پر مسلمانوں کے اعتراضات بہت زیادہ وزنی نہ تھے۔ اسکی مخالفت میں شخصی جذبات بھی کام کر رہے تھے۔ مولانا آزاد بھی نہرو رپورٹ کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اُن کا یہ خیال ضرور تھا کہ یہ سمجھوتے کی ایک اچھی بنیاد ہے جس میں جزوی ترمیم ہو سکتی ہے۔ مولانا کو بہت سے مسلمان کانگریس کا پٹھو کہتے تھے اور جیسا کہ نقشِ آزاد کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے انقلاب اور بہت سے اخبار اُنھیں کانگریس کے ہاتھوں میں کھلونا سمجھتے تھے۔ حالانکہ مولانا قومی تحریک کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے مناسب سہولتوں اور اُنکے حقوق کی پاسداری کو ضروری جانتے تھے مگر وہ مسلمانوں کے مسئلے کو بھی ہندوستانی قومیت کے پس منظر میں دیکھتے تھے۔ اُردو کے مسئلے میں بھی مولانا کی رائے عام رائے سے ہٹ کر تھی سرحد کے مسلمانوں کو وہ اسلیے اُردو کے سلسلے میں من مانی کرنے سے روکتے تھے کہ اسکا اثر یو۔پی اور بہار کے اُردو دوستوں پر پڑے گا۔ مولانا کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ محبت میں خودداری ہو سکتی ہے مگر سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ساری تحریک لیگ کے عروج کے زمانے میں اسی سودے بازی کی تحریک تھی۔ یہ بالائی طبقے کے چند افراد اور متوسط طبقے کے ایک تعداد کی خاطر سارے مسلمانوں کے مفاد کو خطرے میں ڈالنے والی تحریک تھی۔ مذہب سے اِس کا رشتہ اسلیے تھا کہ اسی کے نام پر لوگوں کو اُبھارنا ممکن تھا۔ اِس تحریک کو مدد بعض ہندوؤں کی اُس ذہنیت سے بھی ملی جو قدامت پرستی یا احیا پرستی کی شکار تھی اور جسے مشترک تہذیب کا تصور ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اُردو سے بھی اس کی ہمدردی جذباتی تھی حقیقی نہ تھی۔ اسکے پیچھے کوئی واضح اقتصادی شعور نہ تھا، کوئی مرتب تہذیبی لائحہ عمل نہ تھا، کوئی سنجیدہ علمی نظریہ تھی۔ اس میں نفرت زیادہ تھی، محبت کم، منفی پہلو واضح تھے، مثبت پہلوؤں کے متعلق ابہام تھا۔ انگریز اس میں اپنا فایدہ نظر آیا، اسلیے اس نے اس کی حمایت کی۔ مجھے یاد ہے کہ علی گڑھ میں دوسری جنگ کے زمانے میں جب لیاقت علی خاں آتے تھے تو جنگی تیاریوں کی حمایت کرتے تھے اور جب نواب اسمٰعیل خاں آتے تھے تو ان کی مذمت کرتے تھے۔ مولانا آزاد قدرتی طور پر اس جذباتی سیلاب سے علٰحدہ اپنے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں گاندھی جی کے دستِ راست بنے رہے

جس وقار اور متانت کا انھوں نے اسی زمانے میں ثبوت دیا وہ اُنکے کردار کی پختگی اور اُنکی نظر کی صحت کی روشن دلیل ہے۔ اُن کی زبان کبھی طنز سے آلودہ نہ ہوئی۔ اُنھوں نے مخالفوں کے زہریلے اعتراضات کا جواب بھی نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اپنے راستے پر گامزن رہے۔

آزادی کے بعد مشترک خوابوں کو حقیقت بنانے کا وقت آیا تھا۔ مگر فسادات کی لہر نے ایسی تلخی پیدا کر دی تھی تقسیم کی وجہ سے فرقہ داریت کی لے اتنی بڑھ گئی تھی، ملک میں اتنے مسایل اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، در خود کانگریس کی خاصی تعداد فرقہ داریت سے اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ مولانا اپنا پورا زور استعمال نہ کر سکے۔ مگر جو بھی اس زمانے کے واقعات کو غور سے دیکھے گا وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ مولانا کے اثر سے جدید ہندوستان کی تشکیل میں غیر مذہبی جمہوری ریاست کے تصور کو فتح ہوئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اہمیت کو محسوس کیا گیا، اردو کے ساتھ انصاف کا جذبہ بڑھا۔ ایسا نہیں تھا کہ مولانا کنگ ایڈورڈ روڈ کی ایک عالی شان عمارت میں گوشہ نشین تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے وہ حکومت کے ہر اہم فیصلے پر اثر ڈالتے رہے۔ اُن کے یہاں آخر میں جو افسردگی آگئی تھی وہ اس وجہ سے نہیں تھی کہ اُنکے سارے خواب شکست ہو گئے تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جس تہذیب کے پروردہ تھے، وہ رخصت ہو رہی تھی اور حکومت میں جو نئے لوگ شریک ہو گئے تھے، اُن میں سے بہت سوں سے وہ ذہنی طور پر اپنے کو الگ اور مختلف محسوس کرتے تھے۔ مولانا کے یہاں جنبش ابرو سب کچھ تھی، ان لوگوں کے یہاں اظہار میں خروش، مولانا کے یہاں ہر چیز کے آداب تھے، ان لوگوں کے یہاں آداب بے وقت کی راگنی۔ مولانا بہر حال قدیم دبستاں کے فرد تھے، اسلیے وہ قدیم اور جدید دونوں کا سنگم چاہتے تھے اور قدیم کے معنی صرف قدیم ہندوستان کے نہیں لیتے تھے۔ یہ لوگ یا قدیم ہندوستان کے دلدادہ تھے یا سستی مغربیت کے اسیر۔ مولانا عوام کے دکھ درد کو سمجھتے تھے، عوام سے محبت رکھتے تھے۔ وہ جھگڑے کو نہیں سنجیدہ گفتگو کو پسند کرتے تھے۔ نفاست، لطافت، شائستگی، تہذیب میں ڈوبے ہوئے اشخاص کے لیے قدروں کی یہ اتھل پتھل قدرتی طور پر افسردگی کا باعث ہوتی ہے۔

میرے نزدیک مولانا ہندوستانی مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے۔ اُنھوں نے ان کی سچی خدمت کی۔ کم مسلمانوں نے اُنکی قدر کی۔ اُنکے عہدے اور اقتدار کی وجہ سے خاموش رہے، ان سے فائدہ بھی اُٹھایا مگر اُنکے مسلک کو سمجھنے کی کوشش کم کی۔ انکا ساتھ کم دیا، اُن سے کام حسب ضرورت لیا۔ آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور انجمن ترقی اُردو ہند کو اُنھوں نے نئی زندگی عطا کی۔ اُنھوں نے غلط فہمیوں کے دور میں، ان اداروں کے استحکام اور ترقی کی سبیل کی۔ اب یہ ادارے آزادی سے نئے ہندوستان میں ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اپنا صحیح رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان اداروں کے چلانے والوں سے مولانا ثاقب کی زبان میں کہہ گئے ہیں۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو　　بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

ہاں یہ ضرور ہے کہ اداروں اور قوموں کی منزل مقصود ایک فرد کے بس کی نہیں ہوتی۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے پوری قوم اور سارے ادارے کی توانائی درکار ہوتی ہے۔ صرف گاندھی جی نے ہندوستان کو آزادی نہیں دلائی۔ گاندھی جی کے ذریعہ سے قوم کا خوابیدہ ضمیر بیدار ہوا۔

گاندھی جی اس ضمیر کے رہ نما تھے۔ اُن کی عظمت یہ ہے کہ اُنھوں نے ہندوستان کو اتنی طاقت عطا کی کہ وہ آزادی کی منزل سے ہم کنار ہوسکا۔ یہ آزادی زیادہ دن نہیں رک سکتی تھی۔ اس صدی کی یہی خصوصیت ہے کہ صدیوں کے کام برسوں میں اور برسوں کے دنوں میں ہو رہے ہیں۔ آج ایشیا آزاد ہے۔ افریقہ کل آزاد ہو جائے گا۔

ہندوستانی قومیت میں مسلمانوں کی مناسب جگہ محفوظ ہے۔ اس جگہ سے اُنھیں کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ کچھ ہندوؤں کی تنگ نظری سے حقایق کا احساس کچھ دن کے لیے مدھم ہوسکتا ہے مگر حقایق اپنے کو منوا ہی لیتے ہیں۔ مولانا اس حقیقت سے باخبر تھے۔ وہ واقعی عام ذہن سے آگے دیکھتے تھے۔ عام ذہن سے آگے دیکھنے والا مقبول اور ہر دلعزیز نہیں ہوسکتا۔ مولانا بھی مقبول اور ہر دلعزیز نہ ہوسکے۔ عظمت اور مقبولیت میں یہی فرق ہے۔ عظمت فوراً مقبول نہیں ہوتی اسے پہچاننے میں دیر لگتی ہے۔

مولانا کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے مذہب کے متعلق ایک صحیح نقطۂ نظر پیش کیا۔ ہندوستان میں مذہبی دیوانگی ملتی ہے۔ یا مذہب کی آڑ۔ حقیقی مذہبی جذبہ کم ہے۔ ہندوستان کو روحانیت کا وطن کہا جاتا ہے۔ مگر روحانیت کے معنی اگر جوانی میں مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے اور بڑھاپے میں کافر تواں باشی ناچار مسلماں شو پر عمل کرنے کے ہیں تو ہندوستان میں واقعی روحانیت ہے۔ پھر ہمارے یہاں روحانیت کے نام پر پیروں اور فقیروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو لوگوں کی عقیدت اور جذباتیت اور سادگی سے برابر کھیلتا رہا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام کی سادہ، فطری، ترقی پسند، عالمگیر تعلیم کم رائج ہوئی۔ تقلیدی مذہب جو فروعات، جزئیات اور العیات کے لات و منات میں گرفتار تھا زیادہ مقبول رہا۔ مولانا آزاد نے جس مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ اس میں بیشتر مسلمانوں کے عقاید مشکوک سمجھے جاتے تھے۔ وہابی ہونا یعنی قبر پرستی اور نذر و نیاز سے بیزار ہونا بہت بڑا جرم تھا۔ سرسید کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک مولوی اپنی بستی کے بنیے سے ہر چیز اُدھار لیا کرتے تھے اور کبھی دام نہ دیتے تھے۔ بہت دن تک بنیا خاموش رہا، مگر ایک دن ہمت کرکے تقاضا کر بیٹھا۔ مولوی صاحب غصے سے سرخ ہوگئے اور کہنے لگے اچھا بچہ تجھ سے سمجھ لوں گا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز کے بعد انھوں نے حاضرین کو یہ اطلاع دی کہ ہمارا بنیا وہابی ہوگیا ہے۔ اب مسجد سے جو پٹھان نکلتا ہے وہ بنیے کو گھورتا ہوا اور تلوار کھڑکھڑاتا ہوا۔ بیچارے نے فوراً جاکر مولوی صاحب کی خوشامد کی۔ بڑی مشکل سے راضی ہوئے اور دوسرے جمعے میں انھوں نے یہ خبر فرحت اثر سنائی کہ سب خیریت۔ بنیے نے وہابیت سے توبہ کرلی ہے۔ مولانا آزاد کے والد اپنے علاوہ حضرت مولوی احمد رضا خاں اور مولوی عبدالقادر بدایونی کو راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتے تھے۔ اور مولوی احمد رضا خاں سے ملنے کے بعد اُن کی طرف سے بھی مشکوک ہوگئے تھے۔ پائجامہ ٹخنوں سے اونچا ہو یا نہ ہو۔ آمین زور سے کہی جائے یا نہ کہی جائے۔ معراج جسمانی ہے یا روحانی۔ قبروں کو سجدہ کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ شیعہ مسلمان ہے یا نہیں۔ ایسے ہی مسایل پر بحث ہوتی تھی اور مخالفوں کو کفر کے فتووں سے سرفراز کیا جاتا تھا۔ اقبال نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اس ذہنیت پر بڑی گہری طنز کی ہے۔ ابلیس اپنے

مشیروں سے کہتا ہے ۔۵

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ؟ ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اِس دور میں یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

مولانا کو فطرت سے ایک بیدار ذہن ملا تھا۔ وہ اپنے گھر کے ماحول سے جلد بیزار ہوگئے۔ کچھ دن ایسے بھی گزرے کہ مذہب پر سے عقیدہ اُٹھ گیا۔ مگر پھر اُن پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ سچی مذہبیت کے بغیر انسان کی روح پیاسی رہتی ہے اور یہ منزل صرف عقل کی راہ سے نہیں بلکہ پرخلوص جذبات اور وجدان کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے نزدیک "جس مذہب کو دنیا، اسلام کے نام سے پہچانتی ہے فی الحقیقت وہی مذہبی اختلافات کے سوال کا اصلی حل ہے۔ اسلام دنیا میں کوئی نیا مذہب قائم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا مشن خود اُس کے بیان کے مطابق صرف یہ ہے کہ دنیا میں تمام مذہبوں کے ماننے والے اپنی اصلی اور بے میل سچائی پر قائم ہو جائیں اور باہر سے ملائی ہوئی جھوٹی باتوں کو چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو جو اعتقاد اُن کے پاس ہوگا اُس کا نام قرآن کی بولی میں اسلام ہے" گویا مولانا تمام مذاہب کی سچائی کو مانتے تھے اور ہر ایک کو تلقین کرتے تھے کہ وہ اپنے مذہب کے راستے سے حقیقت کا عرفان حاصل کرے۔ وہ توحید کے عقیدے کو تمام بڑے مذاہب میں مشترک دیکھتے تھے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں انھوں نے اسی لیے وحدتِ اَدیان کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ ممکن ہے اس سے بہت سے مسلمانوں کو اتفاق نہ ہو، مگر اسلام کی حقیقی تعلیم یہی ہے کہ دوسرے مذاہب کا احترام کیا جائے۔ رنگ و نسل کے امتیازات کو دُور کیا جائے۔ امیروں اور غریبوں کے فرق کو کم کیا جائے۔ دنیوی کاموں میں اجتماعی مفاد کو پیشِ نظر رکھا جائے اور فتنہ و فساد کے امکانات کم کیے جائیں۔ عقاید اور عبادات کی صحت کے ساتھ معاملات میں اعتدال، توازن اور میانہ روی کو ملحوظ رکھا جائے۔ مولانا سرسید سے بہت متاثر تھے، مگر سرسید کی طرح محض مذہب اور سائنس کا مفاہمہ نہیں چاہتے تھے۔ دونوں کو حقیقت کی علیحدہ علیحدہ راہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان میں بسنے والے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو ایک قوم جانتے تھے۔ اُنھوں نے علمائے شام کے اس خیال کی تائید کی تھی کہ فقہ میں حسب ضرورت ترمیم ہو سکتی ہے۔ وہ تصویر کشی کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ اُن کے سامنے حضرت عمر کی مثال تھی جنھوں نے منصوص قانون طلاق میں ترمیم کر دی تھی۔ اور قحط کے زمانے میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کیا تھا۔

مولانا نے رام گڑھ کے خطبۂ صدارت میں واضح طور سے کہا تھا کہ ہندوستانی ہونے کے ناتے وہ ہندوستان کی

ساری تاریخ اور تہذیب کے وارث ہیں اور اپنے اس حق سے کسی حال میں دست بردار ہونے والے نہیں۔ اسی طرح مسلمان ہونے کے ناتے، اسلام کی حیات آفریں اور آفاقی تعلیم سے انھیں جو کچھ ملا ہے اُس کا حقیر سے حقیر جز بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔ مولانا اسلام اور قومیت کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں رشتوں کی اہمیت کے قائل تھے۔ اُن کا اسلام انھیں مجموعی قومی مفاد سے علیحدہ نہیں لے جاتا تھا، بلکہ اس میں باعزت اشتراک کی دعوت دیتا تھا۔ مذہب کے سچے تصور نے ہی انھیں ایک غیر مذہبی ریاست کا حامی بنایا تاکہ ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے پر ظلم نہ کر سکیں۔ اس نے انھیں جمہوریت کا پرستار بنایا تاکہ ملک کی نعمتیں سب کے لیے عام ہو سکیں اور ذمہ داریوں میں شریک ہونے والے، فوائد میں بھی حصہ پا سکیں۔ مسلمانوں کی وہ سیاست، جو حقوق طلبی، علیحدگی اور تحفظات کی سیاست تھی، دراصل خوف کا شکار رہی۔ مولانا کی سیاست میں ایک اخلاقی پہلو تھا۔ یہ بے خوفی، رواداری اور اعتماد سکھاتی تھی۔ جب ہر طرف خوف طاری ہو تو بے خوفی خطرے سے خالی نہیں۔ مولانا نے یہ خطرہ مول لیا۔ مگر مولانا کے نقطۂ نظر کی صحت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی راہ میں جو مشکلات ہیں وہ صرف اُن کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں۔ اکثریت بھی ان کی ذمہ دار ہے، مسلمانوں کی حکومت کی تلخ یادیں ابھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہیں۔ نئی طاقت کا نشہ ہے۔ مذہب کی حقیقی روح عام نہیں ہے، اس کا مروجہ تصور عام ہے جس میں اپنی برتری اور دوسرے کی کمتری کا احساس چھپا ہوا ہے۔ پھر تعداد کی بھی ایک منطق ہوتی ہے اور وہ منطق بعض اوقات اخلاق کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس لیے مولانا کی راہ میں دشواریاں ہیں اور ابھی کافی عرصے تک رہیں گی، مگر کیا کیا جائے ملک کی نجات کا راستہ یہی ہے اور افراد کی طرح قومیں بھی ٹھوکریں کھانے کے بعد صحیح راستے پر آجاتی ہیں۔

مولانا کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے قدیم نسل کی صلابت، جامعیت، وضعداری اور پختگی کے اس دور کی برق رفتار زندگی پر بھی نقش جما دیا۔ وہ پرانے تھے اور اُن میں پرانوں کا وزن و وقار تھا مگر اس کے باوجود وہ محدود اور جامد ذہن نہ رکھتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں لبرل تھے۔ نئے خیالات و میلانات کی خوبیوں کو بھی دیکھ لیتے تھے گو اُن سے پوری طرح متفق نہ ہو سکے۔ اُن کے یہاں وہ تنگ نظری نہ تھی جو موجودہ دور کی نظریاتی کشمکش کی وجہ سے کچھ لوگوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ زندگی اُن کے نزدیک سیاہ اور سفید خانوں میں تقسیم نہ تھی۔ انھیں اس وسیع رقبے کا بھی احساس تھا جس میں سیاہی اور سفیدی مل جل جاتی ہیں۔ وہ نوجوانوں سے بدظن نہ تھے۔ وہ نئے نظریوں سے بھڑکتے نہ تھے۔ اُنھیں اپنے اوپر اعتماد تھا اور اُنھیں دیکھ کر پرانے دیوزادوں کی نسل یاد آجاتی تھی۔ اُن کے دم سے ہمارے ماضی کی بہت سی قدروں کا بھرم قایم تھا۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مکتبوں اور پاٹھ شالوں کی محدود فضا سے بھی زندگی کے چشمے اُبل سکتے ہیں اور

سارا قصور مکتبوں اور پاٹھ شالوں کا نہیں، بلکہ نظامِ تعلیم کا ہے۔ جواہر لال نہرو نے "ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ مولانا شخصیتوں پر زیادہ توجہ کرتے تھے، واقعات وحالات کے بہاؤ پر کم۔ یہ پوری حقیقت نہیں ہے۔ مولانا اُن شخصیتوں سے ضرور متاثر ہوتے تھے جو کردار کی آب وتاب رکھتی ہیں، جو زمانے کی بھٹی میں تپ کر کندن بن جاتی ہیں۔ وہ حالات وواقعات کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ مگر وہ حالات وواقعات کے دریا میں تنکے کی طرح بہنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ ایسی گئی گزری نہیں تھی۔ اس نے افکار واقدار سے یا شخصیتوں سے عشق ضرور کیا تھا اور اس عشق نے اس میں ایک نظیر بھی پیدا کی تھی۔ یہ نظیر بھی ہمارا ایک قیمتی ورثہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی سمت کو پوری طرح نہ اپنائیں مگر اسے نظر انداز کرنا یقیناً بے جا ہوگا۔

مولانا کا چوتھا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تقریروں سے اُردو زبان کو سارے ہندوستان میں پھیلایا اور اپنی تحریروں سے اس میں علمیت اور مردانگی پیدا کی۔ مولانا عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ اُنھوں نے دونوں زبانوں کے کتنے ہی الفاظ اُردو تحریروں میں عام کر دیے۔ الہلال اور تذکرہ کا طرز خطیبانہ ہے، اُس میں نثر کا اصلی جوہر کم ہے۔ اس میں تکرار ہے، ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے کہا گیا ہے۔ اس میں 'میں' کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ اس میں مغز کم ہے چھلکا زیادہ۔ مگر ترجمان القرآن اور رابعہ کی تحریروں میں مولانا کے اسلوب میں خاصی تبدیلی ہوئی۔ ترجمان القرآن کا اسلوب علمی نثر کا اچھا نمونہ ہے۔ یہ علمی بھی ہے اور شگفتہ بھی۔ مولانا اپنی تحریر پر بار بار نظرِ ثانی کرتے تھے۔ اُنھیں الفاظ کی قدر وقیمت کا احساس تھا اور وہ اسی لیے ایک لفظ کی جگہ اکثر دوسرا لفظ رکھ دیتے اور تحریر کے حسن اور تاثیر میں اضافہ کر دیتے۔ اُردو دنیا کی جذباتیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا نے خود اپنا طرز بدل دیا، مگر اس کے نزدیک صرف الہلال اور تذکرہ والے مولانا ہی قابلِ ذکر رہے۔ خطبات اور ترجمان القرآن والے مولانا کو اس نے غور سے نہیں دیکھا۔ 'غبارِ خاطر' محض خطوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ خطوں کی شان 'نقشِ آزاد' میں ملے گی۔ 'غبارِ خاطر' میں مولانا جیل کی تنہائی میں سنہری یادوں کی ایک بزم سجاتے ہیں۔ یہاں مکتوب الیہ سے یوں ہی کی غرض ہے، کاتب اپنے دل کے داغوں کی بہار دیکھنا چاہتا ہے۔ غبارِ خاطر، خطوں کا مجموعہ نہیں، مضامین کا مجموعہ ہے اور مضمون نگاری کے لحاظ سے اس کا اسلوب بھی ہے۔

مولانا بہت بڑے خطیب تھے۔ جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں وہ ان کی کیفیت کو کبھی بھول نہیں سکتے۔ مولانا نے اپنی تقریروں سے بڑے بڑے کام لیے۔ انھوں نے جوش دلایا، جادو کیا، نشہ بخشا اور قایل کر لیا۔ ان کی ہر تقریر میں ایک واضح مرکزی خیال ہوتا تھا۔ مگر خیال سے زیادہ اُن کے طرزِ بیان کی اہمیت ہوتی تھی۔ وہ بڑی قطعیت سے بات کرتے تھے۔ اُن کا پُر اعتماد لہجہ، اور پُر اثر بیان دونوں سننے والوں کو بہالے جاتے تھے۔ انھوں نے استعاروں سے خوب کام لیا ہے،

کہیں کہیں برمحل اشعار بھی استعمال کیے ہیں۔ اچھے شعر میں بسا اوقات کوئی نئی بات نہیں ہوتی، مگر اس یقین اور اعتماد اور اس خوبصورتی سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ دل میں گھر کر جاتی ہے۔ رام گڑھ کے خطبے کا آغاز دیکھیے کس طرح انھوں نے ہندوستان میں اسلام کے شاندار رول کو واضح کیا ہے۔ اُن کی وہ تقریر پڑھیے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے خونیں حالات میں جامع مسجد دہلی میں کی تھی۔ میں نے وہ تقریر نہیں سُنی، ہاں اخباروں میں پڑھی ہے لیکن اسے پڑھ کر ہی دل سے خوف اور ہراس دُور ہو جاتا ہے اور ایک ناقابل بیان عزم اور حوصلہ بیدار ہوتا ہے۔ خطابت کو آج کتنا ہی بُرا کہا جائے، مگر مولانا آزاد نے اُسے ایک آرٹ بنا دیا تھا۔ اُردو میں اُن سے پہلے خطیبوں کی کمی نہ تھی، مگر اُن میں اپنے لیے ایک جگہ بنا لینا اور بڑے بڑے مرکزوں میں اپنی فضیلت مخالفوں تک سے منوا لینا معمولی بات نہیں ہے۔ میں نے مولانا سلیمان اشرف اور مولانا آزاد دونوں کی تقریریں سُنی ہیں اس لیے عبدالرزاق ملیح آبادی کے اس بیان کو تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ بریلی کے ایک جلسے میں جب ہجوم ہوتا، اسٹیج پر بار بار دیکھی ہوئی ہے۔ مولانا سلیمان اشرف کی دھواں دھار خطابت کے بعد مولانا آزاد کا میدان جیت لینا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

خطابت کے لیے مقرر اور سامعین دونوں کو بڑی فرصت درکار ہوتی تھی۔ اب اس کا دور ختم ہو گیا۔ اب مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بات صاف اور واضح الفاظ میں اور کم سے کم وقت میں ادا کر دے۔ سننے والے بھی اب مقرر سے پینترے نہیں وار چاہتے ہیں۔ وہ یا تو دفتر سے لوٹتے ہوتے ہیں اور گھر جانے کے لیے بے چین ہوتے ہیں یا گھر سے زیادہ دیر تک غائب نہیں رہ سکتے۔ اب خطابت کے لیے ریاض کون کرے اور کیوں کرے۔ مگر خطابت اب بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اُردو میں خطابت کے مظاہرے اب صرف جلسوں میں دیکھنے میں آتے ہیں مگر ان کے دن بھی زیادہ نہیں۔ تحریر نے تقریر کو دبا لیا ہے۔ جوں جوں خواندگی بڑھتی جائے گی، تقریروں کا اثر کم اور تحریروں کا زیادہ ہوتا جائے گا۔ مگر مولانا کی تقریروں کی گونج فضا میں باقی رہے گی۔

مولانا آخر آدمی تھے فرشتہ نہیں تھے۔ اُن میں کمزوریاں بھی تھیں۔ شروع شروع میں محمد علی کے سامنے اُن کا چراغ نہیں جلا۔ اُن کی تحریروں کو غور سے پڑھیے تو صاف یہ رشک جھلکتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے فوجیوں کو بغاوت کی طرف مائل کیا مگر مقدمہ محمد علی پر پہلے چلا اور اُن کی طرف بعد میں توجہ ہوئی۔ جانبازوں کی صف میں بھی وہ امام رہنا چاہتے تھے مقتدی نہیں۔ چونکہ محمد علی زیادہ عوامی آدمی تھے اور مولانا سے زیادہ جدید علوم سے واقف تھے اس لیے کچھ عرصے تک گاندھی جی کے ساتھیوں میں وہی ممتاز رہے۔ مگر اُن کے تلوّن اور جذباتیت نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا۔ چند ہی دن کے بعد قومی جدوجہد کے اسٹیج پر مولانا آزاد حریفوں سے آگے تھے اور محمد علی دوسری

وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔

پھر مولانا اپنے ہی بنائے ہوئے ایک بُت کے پرستار تھے۔ یہ بُت آن بان کا بُت تھا۔ جس میں سوار ہوتے کوئی انھیں نہ دیکھ لے۔ ان کی تنگدستی کا حال کسی پر نہ کھلے۔ بیوی کی خطرناک علالت کے باوجود فیس میں چہرے سے تشویش ظاہر نہ ہو۔ آنکھ کی علالت کے باوجود نظام اوقات میں خلل نہ پڑے۔ یہ کوشش کس بات کی غماز ہے۔ مولانا کو آدمی سے نہیں "فوق البشر" سے انس تھا۔ وہ بھی اپنی دانست کے مطابق بنتے تھے۔ اس سے اُن کے کردار کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے مگر اس مضبوطی میں کچھ محرومی بھی ہے۔ آخر آدمی کے دل پر چوٹ لگے تو وہ آنسو کیوں نہ بہائے؟ آنسوؤں کے سیلاب کو روکے کیوں؟ چھپائے تبسم میں سینے کے زخم کیوں چھپائے۔ مردانگی کا یہ تصور ممکن ہے کچھ لوگوں کو مرعوب کرتا ہو مجھے تو مصنوعی اور بس نمائشی معلوم ہوتا ہے۔ زندگی نہ صرف آنسو بہانے کا نام ہے، نہ صرف آنسو پی جانے کا۔ سیرت فولاد اور حریر دونوں کے لیے صرف متضاد نہیں ہے اور شبستان محبت ازل سے مقرر نہیں ہوئے ہیں۔ بہر حال یہی دونوں کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مولانا نے بڑی کاوش سے اپنے کو ایک لیڈر اور رہنما کے رول کے لیے تیار کیا تھا اور پھر یہ اُن کا مزاج بن گیا تھا۔ اس سے قوم کا بھلا ضرور ہوا مگر اُن کی ذاتی زندگی کچھ سونی سونی اور اداس اداس ضرور رہ گئی۔ وہ ایک نقاب کے عادی ہو گئے اور کسی حال میں اس نقاب کو اتارنے کے لیے اپنے کو آمادہ نہ کر سکے۔ نقاب شخصیت بن کر رہ گیا۔

مگر مولانا نے اس پبلک لائف میں ایک ایسے ظرف کا ثبوت دیا جو ان کے ہم عصروں میں بہت کم ملتا ہے۔ اُن کی مخالفت میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ کچھ گمراہ اور سر پھرے نوجوان بدتمیزی اور گستاخی سے بڑھ کر بدسلوکی پر بھی اتر آئے۔ مگر مولانا نے کبھی مخالفوں کو جواب نہیں دیا اور نہ اُن سے کوئی انتقام لیا۔ اپنے مسلک سے اختلاف کرنے والوں کے ساتھ بھی مولانا کا سلوک ہمدردانہ اور فیاضانہ رہا۔ میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے دور میں علی گڑھ کے کچھ نوجوانوں نے اُن کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی۔ مگر آڑے وقت میں مولانا ہی علی گڑھ کے کام آئے۔ مولوی عبدالحق نے مولانا کی ہمیشہ مخالفت کی۔ مولانا چونکہ یہ سمجھتے تھے کہ مولوی عبدالحق کی پالیسی کی وجہ سے اُردو کی مخالفت بڑھ سکتی ہے اور مولوی صاحب کے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں کام کرنے سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لیے اُنھوں نے مولوی صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں مگر انجمن ترقی اردو ہند کی نئی تنظیم میں اُنھوں نے بڑی مدد کی اور آزادی کے بعد اس کی بہت سی مشکلات کو دور کیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے انجمن سکریٹری بنا دیا۔ میں مولانا سے ملنے گیا تو مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنے منصبی کاموں

انجمن کے لیے بھی وقت نکال سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں علاوہ اپنے منصبی کاموں کے انجمن کے ذریعہ سے اُردو کی کوئی خدمت کر سکا تو اپنے کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہی اسپرٹ ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ہدایت کی کہ جب ضرورت پڑے تو بے تکلف لکھنا میں جو مدد کر سکا ضرور کروں گا۔ ذاکر صاحب کے استعفے کے بعد انجمن کے نئے صدر کا سوال اُٹھا۔ مولانا نے اپنے پرائیوٹ سکریٹری کے ذریعہ سے کہلایا کہ انتخاب فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور خواجہ عبد المجید صاحب کو جو نائب صدر تھے اور مجھے بلایا۔ انھوں نے کہا کہ انجمن کی صدارت کے لیے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو بہت مناسب رہیں گے۔ ہم لوگوں نے اتفاق کیا تو انھوں نے پنڈت جی سے خود کہا۔ مگر پنڈت جی اُردو سے ہمدردی کے باوجود خرابیٔ صحت کی وجہ سے یہ ذمہ داری لینے کو تیار نہ ہوئے۔ اُن کے بعد مولانا کے مشورے سے کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا انتخاب عمل میں آیا۔

ساہتیہ اکاڈمی کے اُردو بورڈ کا میں کنوینر ہوں۔ جب تک مولانا زندہ رہے اس کے سارے جلسے اُن کی صدارت میں ہوئے۔ ان جلسوں میں وہ بھول جاتے تھے کہ وزیرِ تعلیم ہیں۔ ادبی مسائل پر خوب بحث ہوتی تھی۔ رائے تو اُنھیں کی مانی جاتی تھی، مگر ہم سب اپنی سی کہہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ میں سال کی بہترین نظموں اور غزلوں کا انتخاب منظوری کے لیے پیش کر رہا تھا۔ اختر الایمان کا نام لیا، تو مولانا ہنس کر کہنے لگے کہ ان کا تو نام ہی غلط ہے، نظم کیسے اچھی ہوگی۔ میں نے کہا یہ غلطی ان کی نہیں ان کے والدین کی ہے اور پھر اس نام کی بھی یہی غلطی ہے جو خورشید الاسلام میں ہے۔ اس میں لطف یہ تھا کہ خورشید الاسلام کے ایک مضمون کی مولانا بڑی تعریف کر چکے تھے۔ میرا اشارہ سمجھ گئے کھل کر ہنسے اور پھر فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ اگلے سال میں نے پھر ان کی ایک نظم کا انتخاب کیا۔ شاعر کا نام آیا تو مولانا کہنے لگے آؤ سمجھوتہ ہو جائے۔ یہ اپنا نام بدل دیں، ہم ان کی نظم شامل کر لیں۔ اس دفعہ میں نے کسی نے اختر الایمان سے ذکر کر دیا۔ وہ اسے سنجیدہ اعتراض سمجھے حالانکہ یہ محض خوش طبعی تھی اور کچھ نہیں۔

مولانا کسی کی کھل کر تعریف نہ کرتے تھے۔ سرسری نظر ہی میں خامی پر نظر جاتی تھی۔ ساہتیہ اکادمی کی ہندوستانی ادبیات کی ببلوگرافی کے لیے میں نے اُردو کی انتخابی کتابوں اور ادبیات کی فہرست تیار کی جو بیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ مولانا کے سامنے فہرست پیش ہوئی تو کہنے لگے کہ یہ بڑا کام ہو گیا۔ مجھے مولانا کا یہ مختصر جملہ بھی بہت بڑی تعریف معلوم ہوا۔ پھر ادھر اُدھر فہرست کے ورق اُلٹے اور کہنے لگے آپ نے شوق نیموی کی صرف دو کتابیں لی ہیں۔ حالانکہ اُن کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شوق نیموی سے مولانا اپنی نو عمری میں خاصے واقف تھے اور غالباً ان سے اصلاح بھی لے چکے تھے۔

انجمن کی کُل ہند کانفرنس دہلی میں ہونے والی تھی۔ سوال یہ تھا کہ پہلے کانفرنس ہو یا پہلے صدر سے وفد ملے۔ مولانا سے مشورہ کرنے کے لیے زیدی صاحب اور مَیں، پہنچے۔ تھوڑی دیر اُن کے ڈرائنگ روم میں انتظار کرنا پڑا۔ پہنچے تو بڑی محبت سے ملے۔ میں نے قدرے تفصیل سے روداد سُنائی اور رائے مانگی۔ کہنے لگے پہلے کانفرنس کرو، پھر وفد لے جاؤ اور وہاں مطالبہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ دہلی، اُتر پردیش اور بہار میں اُردو کو علاقائی زبان منوانے کا۔ بولے پنجاب کو کیوں چھوڑ دیا۔ میں نے دبی زبان سے کہا کہ ویسے ہماری بنیاد تو مضبوط ہے مگر شاید موجودہ لسانی خطوں کی تقسیم کو دیکھتے ہوئے ہماری بات نہ سنی جائے۔ کہنے لگے اِس کی پرواہ کروگے تو کام کیسے ہوگا۔ پنجاب میں بھی علاقائی زبان کا مطالبہ کرو۔ دیکھا جائے گا۔ میں نے عرض کیا، مولانا ہماری کانفرنس میں آپ کی تقریر ضرور ہونی چاہیے۔ کہنے لگے مولانا حفظ الرحمٰن نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کرلیا ہے صحت اچھی نہیں۔ مگر آؤں گا بھی اور تقریر بھی کروں گا۔ اُردو کے سلسلے میں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ مولانا احسان کر رہے ہیں، یہی نظر آیا کہ اپنا فرض سمجھتے ہیں اُسے ادا کر رہے ہیں۔

۱۴ فروری کو کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے افتتاح کیا۔ اُس کے بعد پنڈت سندر لال نے جو ہمارے نائب صدر ہیں مولانا سے تقریر کی درخواست کی۔ اُن کی درخواست کچھ لمبی ہوگئی تو مولانا کہنے لگے اب خود ہی تقریر کر دوگے یا مجھے بھی کرنے دوگے۔ اس کے بعد اُٹھے۔ مختصر مگر جامع تقریر کی اور اُردو کے ساتھ انصاف کا مطالبہ کیا پھر اُردو والوں کی طرف سے صفائی بھی کردی کہ وہ ہندی کے خلاف نہیں ہیں۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ اور جہاں ایک ہفتے پہلے اُن کی باوقار اور بلند آواز گونجی تھی وہیں سرِ شوریدہ کو بالین آسائش ملا۔ جنازے میں ایسا مجمع تھا کہ بادشاہوں کے جنازوں میں بھی کم دیکھا گیا ہوگا۔ مولانا کا مشن پورا ہوچکا تھا۔ وہ اپنا رول ادا کرچکے تھے۔

شمع کا فروغ ہستی دنیا تک رہتا ہے۔ پروانے آتے جاتے رہتے ہیں۔ مگر کچھ پروانے شمع کی آبرو ہوتے ہیں۔ مولانا ایسے ہی ایک پروانے تھے۔ اصغؔر کا ایک بڑا بلند شعر ہے جو مولانا کی یاد کے ساتھ بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

انداز ہیں جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکسترِ پروانہ

گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ شمعِ شبستاں کا حسن پیدا کرنے کے لیے خاکسترِ پروانہ ہونا ضروری ہے۔

آزاد ہندوستان کی تعمیر میں مولانا ابوالکلام مرحوم کا حصہ

از پنڈت سندر لال

لگ بھگ ہر انسان کی شخصیت کے کئی کئی پہلو ہوتے ہیں ، یہاں تک کہ بعض لوگوں کی بابت یہ طے کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی زندگی کا کونسا پہلو سب سے زیادہ اہم رہا ہے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایک چوٹی کے عالم تھے ۔ وہ ایک بہت اونچے درجہ کے ادیب اور مفکر بھی تھے ۔ تصنیف ، تالیف اور تقریر تینوں کا انھیں زبردست ملکہ تھا ۔ وہ محدث بھی تھے اور مفسر قرآن بھی شاعر بھی تھے ۔ بہت بڑے مدبر بھی اور اپنے قسم کے خاص فلسفی بھی ۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ نہایت حلیم الطبع مستقل مزاج اور انسان دوست تھے ۔ جہاں تک سب کے ساتھ صلح سے رہنے کا سوال ہے حافظ کا یہ مشہور شعر ان کا مسلک معلوم ہوتا تھا :-

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

عرصہ ہوا ایک چھوٹی سی ہندی کتاب " قرآن اور دھارمک ایکتا " انھوں نے شائع کی تھی جس کا دیباچہ بابو راجیندر پرشاد نے لکھا تھا ۔ وہ کتاب دوسرے مذہبوں کی طرف مولانا مرحوم کی رواداری اور وسیع النظری کا آئینہ ہے ۔ جن لوگوں نے مولانا مرحوم کی مشہور تصنیف " ترجمان القرآن " کو پڑھا ہے انھیں جگہ جگہ مولانا رومی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے :-

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیش سگاں انداختیم

اور اس کے مقابلہ میں عصبیت پسند عالموں کے ترجموں کو دیکھ کر مولانا رومی ہی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے :-

تو قرآں گر ہمیں نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

مولانا آزاد اعتقاداً اہل سنت تھے لیکن اُن کی وفات پُرملال پر کچھ شیعہ رسالوں میں جو مضمون میں نے پڑھے ہیں اُنھیں دیکھ کر اور مولانا مرحوم کے ساتھ خلفاء راشدین کی زندگی پر اپنی گفتگو کو یاد کرکے مجھے عام شیعہ سُنّی تفرقہ پر جلال الدین رومی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے :-

تو حقیقت را چہ دانی جاہلی
تو گرفتار ابوبکر و علی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کلام مجید کے مطابق سب ملکوں اور سب قوموں کے سب "رسولوں" اور سب "کتابوں" کو ماننا اور ان میں کسی قسم کا فرق نہ کرنا مومن کی پہچان ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایک سچے مومن تھے۔ دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی ہستی ایسی نہیں ہوئی جس کی بابت لوگوں میں الگ الگ رائیں نہ ہوں اور بسا اوقات متضاد رائیں نہ ہوں۔ یہ بات دنیا کے بڑے سے بڑے اوتاروں، پیغمبروں، تیرتھنکروں، مہاتماؤں، رشیوں، سنتوں اور اولیا اللہ کی بابت کہی جا سکتی ہے۔ مولانا مرحوم ان میں سے کوئی نہ تھے۔ وہ محض ایک انسان تھے۔ اوتاروں اور پیغمبروں نے بھی اپنی غلطیوں کے لئے اللہ سے معافی مانگی ہے۔ کوئی بھی انسان جو کسی انسانی ماں کے پیٹ سے پیدا ہو، غلطی یا خامی سے مُبرا نہیں ہو سکتا۔ مہاتما گاندھی نے اپنی سوانح عمری میں جسے وہ "تلاش حق" کہتے ہیں بار بار اور جگہ جگہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے، تاہم کوئی ایماندار مورخ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس ملک کے اندر اور خصوصاً اس کے موجودہ دور کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ہستی ایک بڑی زبردست اور اہم ہستی تھی۔

دنیا کے عوام کے سامنے وہ زیادہ تر ایک سیاسی رہنما کی شکل میں دکھائی دیئے۔ مہاتما گاندھی کے میدان میں آنے سے پندرہ سال پہلے انھوں نے ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ گاندھی جی کی آزادی کی تحریک کے شروع ہو جانے کے بعد سے گاندھی جی کی شہادت کے دن تک وہ گاندھی جی کے خاص معاونوں اور مددگاروں میں رہے۔ آزاد ہندوستان کی پہلی سرکار کے وہ خاص رکن تھے۔ آج سارا ہندوستان اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے وہ سب سے بڑے مشیر کار اور اُن کا داہنا ہاتھ تھے۔ زندگی کے آخر لمحہ تک ملک کی سیاست میں اُن کا یہی مقام تھا۔ اب ہم مولانا مرحوم کی اس سیاسی زندگی کے کچھ خاص خاص پہلوؤں پر

نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں ۔

پچاس برس سے اوپر کی بات ہے ۔ روس اور جاپان کی جنگ میں اس زمانہ کے یورپ کی سب سے بڑی طاقت کا ایک چھوٹی سی ایشیائی قوم سے ہار جانا ایک حیرت انگیز واقعہ تھا ۔ ایشیا کے تمام ملکوں میں اس سے اُمیدوں کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ۔ ہندوستان میں بھی نئی بیداری دکھائی دینے لگی ۔ خود کانگریس کا زبردست کایا پلٹ ہونے لگا ۔ ۱۹۰۵ء کی بنارس کانگریس اور ۱۹۰۶ء کی کلکتہ کانگریس دونوں میں میں خود موجود تھا انگریزی حکومت نے ملک کی نئی بیداری کو فوراً محسوس کر لیا ۔ اُن کے پاس ایک ہی زبردست ہتھیار تھا ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دینا ۔ بنگال اور خاص کر کلکتہ ان دنوں ہندوستان کی نئی سیاسی بیداری کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔ اپنے مقصد کو پورا کرنے اور اس ملک کی اُبھرتی ہوئی قومیت کو ضرب کاری پہنچانے کے لئے بنگال کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے ۔ ایک پوربی بنگال اور دوسرا پچھمی بنگال یعنی ایک مسلم بنگال اور دوسرا ہندو بنگال ۔ کانگریس کے اثر کو اور اس کے ساتھ ساتھ متحدہ قومیت کے جذبہ کو ختم کرنے کے لئے ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ کو جنم دیا گیا ۔ ہندو مہا سبھا کے اس زمانے کے بانی زیادہ تر سرکاری یا نیم سرکاری آدمی تھے ۔ مسلم لیگ قائم کرنے کے لئے ڈھاکہ کے نواب سیم اللہ خاں کو چودہ لاکھ روپیہ کا چیک نذر کیا گیا تھا ۔ بنارس اور الہ آباد ہندو فرقہ واریت اور علی گڑھ مسلم فرقہ واریت کے گڑھ بنتے جا رہے تھے ۔ ملک کی سیاست میں اُس وقت سب سے اہم سوال ہندو مسلم اتحاد کا ہی سوال تھا اور باوجود ملک کے آزاد ہو جانے کے آج تک یہ سوال ملک کے اہم ترین سوالوں میں سے ہے ۔

عین اُس وقت جبکہ یہ نیا خطرہ ملک کے سامنے تھا اور جبکہ ملک کے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنے کے لئے نہ صرف معاشی اور اقتصادی دلیلوں سے ہی کام لیا جاتا تھا بلکہ قرآن اور حدیثوں کی بھی دہائی دی جاتی تھی ، عین اُس نازک وقت میں جس عالم اور بہادر محبِ وطن نے منافقوں کا مناسب جواب دے کر متحدہ قومیت کے جذبہ کو ہزاروں اور لاکھوں دلوں میں قائم رکھا وہ محبِ وطن نوجوان ابوالکلام آزاد تھا ۔ جن لوگوں نے اُس زمانہ میں مولانا آزاد کے مضمونوں کو پڑھا ہے انہیں معلوم ہے کہ ملک کی اس نئی سیاسی زندگی پر مولانا ابوالکلام آزاد کا کتنا زبردست احسان ہے ۔

ہندوستان کے دارالسلطنت کا کلکتہ سے دلی منتقل کیا جانا بھی انگریزی سیاست میں اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی ۔ دلی کے اندر جمیعت العلماء کا متحدہ قومیت کے جذبہ کے لئے پہاڑ کی طرح ڈٹ کے کھڑے رہنا اور سیکڑوں طوفانوں اور آندھیوں کے آتے ہوئے بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص واقعہ ہے جس پر ملک کو بجا ناز ہو سکتا ہے ۔ جمیعت علماء کے اس شاندار استقلال میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کا زمانہ شروع ہوا۔ گاندھی جی ملک کی نبض اور انگریزوں کی چالوں دونوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اپنے تعمیری پروگرام میں انھوں نے سب سے زیادہ اہمیت ہندو مسلم اتحاد کو دی۔ ساری انگریزی سیاست اور اس کے زبردست وسائل ایک طرف اور مہاتما گاندھی دوسری طرف۔ آخر تک زبردست کشمکش رہی۔ ظاہر ہے مہاتما گاندھی بااثر مسلم رہنماؤں کی مدد کے بغیر اس عجیب و غریب کشمکش میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ جمعیت العلما کے علاوہ جن مسلم رہنماؤں نے اس آڑے وقت میں گاندھی جی کا سب سے زیادہ ساتھ دیا اُن میں خاص نام حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تھے۔ آزادی کی جنگ شروع ہو جانے کے چند سال کے اندر ہی یہ سارا بوجھ اکیلے مولانا ابوالکلام آزاد کے کندھوں پر آپڑا اور آخر رات تک زیادہ تر انھیں کے کندھوں پر رہا۔ جس ہمت، جس قابلیت، جس استقلال اور جس بُردباری کے ساتھ انھوں نے اس بوجھ کو اُٹھائے رکھا وہ انھیں کا حصہ تھا۔

مجھے خود مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بہت سی ایسی نشستوں میں شرکت کا موقع ملا ہے جن میں ہندو مسلم سوال اور اس کے متعلق حکومت کی کارروائیوں پر گفتگو ہوتی تھی۔ ملک کے اندر ٹیڑھے پن کے دماغوں پر حکومت کی چالوں کا بادل چھایا جاتا تھا۔ اس طرح کی نشستوں میں گاندھی جی اور مولانا مرحوم دونوں کے چہروں پر اکثر گہرے تفکر کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ اداس رہتے تھے۔ اس طرح کی کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے سب سے ضروری شرط قومی اتحاد ہی کی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے آزاد ہندوستان کی تعمیر کی سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک کی تاریخ میں مہاتما گاندھی کے بعد سب سے زبردست حصہ مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ بہت سے نازک موقعوں پر مولانا آزاد کی ہستی ہی وہ ہستی تھی جو اپنے مخصوص انداز سے لاکھوں ہندوؤں اور لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو ملائے رکھتی تھی۔

طوفان آئے۔ اچھے اچھے دماغ بہکے۔ فدائیانِ وطن کو ہندو دشمن اور مسلم دشمنی کے خطاب دیے گئے۔ وہ زمانہ بڑی آزمائش کا زمانہ تھا گنیش شنکر ودیارتھی اور مہاتما گاندھی جیسوں کے لئے قومی اتحاد کے اس پودے کو اپنے خون سے سینچنا ضروری ہو گیا۔ آزمائش کے اس تمام زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد طرح طرح کی غلط فہمیوں، طعنوں اور سختیوں کو برداشت کرتے ہوئے بھی اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ ان مشکل دنوں میں کبھی کبھی مولانا آزاد کی جان بچائے رکھنے کے لئے خاص انتظام کرنے پڑتے تھے۔ ایسے موقعوں پر میں نے خود مہاتما گاندھی کو آہیں بھر کر یہ کہتے ہوئے سنا ہے — "ہمیں مولانا کے لئے یہ بھی انتظام کرنا پڑتا ہے!" اس پر بھی

حالت یہ تھی کہ جب کبھی کسی بھی دو فرقوں، فریقوں یا پارٹیوں میں صلح سمجھوتے کی بات آتی تھی تو مولانا آزاد سے زیادہ کارگر اور صلح کن انسان ملک بھر میں دوسرا نہ ملتا۔ یہاں تک کہ انگریزی حکومت کے ساتھ لمبی لمبی گفت و شنید میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ ہمیشہ ایک قیمتی اور زبردست حصہ رہا۔

۱۹۴۷ء میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان میں ملک کی تقسیم کو روک سکنا جہاتما گاندھی اور مولانا آزاد دونوں کی طاقت سے باہر کی چیز تھی لیکن آزادی مل جانے پر نئی قومی سرکار میں جواہر لال جی کے بعد دوسرا درجہ مولانا ہی کا ہو سکتا تھا اور تھا۔ جو لوگ ابھی تک بھی اس ملک میں سیکولر گورنمنٹ یعنی مذہبی نگاہ سے بے جانب دار سرکار کے قائل نہیں ہیں یا جو اس چیز کو نہیں سمجھ پاتے کہ مختلف مذہبوں، زبانوں، نسلوں، خیالات اور اعتقادات کے ہوتے ہوئے بھی ہم ایک ملک میں ایک متحدہ قوم کی طرح محبت سے رہ سکتے ہیں، یا جو ہمارے اس سیکولر گورنمنٹ کے معیار ہی کو غلط ثابت کر دینا یا ختم کر دینا چاہتے ہیں، ان سب کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کی ہستی ایک زبردست چیلنج، ایک دلیل، جیتا جاگتا ثبوت اور ایک جیتا جاگتا جواب تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی پُر درد تقریروں سے ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کی بے وقت موت نے انھیں اور ملک کو کتنا نقصان پہنچایا۔

مولانا آزاد ایک درجہ تک اپنی آزاد خیالی کے لئے بھی مشہور تھے۔ وہ نہ سالک تھے، نہ مجذوب اور نہ تصوف کی اصطلاح میں شاغل۔ لیکن تصوف کی طرف اُن کا ایک خاص اندرونی رجحان تھا۔ ایک چھوٹا سا ذاتی واقعہ یہاں بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ زمانہ گذرا جب میں کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن سائنس پڑھتے ہوئے کچھ جلتی ہوئی سیرٹ میرے ہاتھ پر گر پڑی۔ قدرتی طور پر میں نے انگلیاں منہ کے پاس لا کر پھونک ماری۔ تب سے اب تک مجھے ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔ کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے میری انگلیاں منہ کی طرف چل پڑتی ہیں اور میں اُن پر پھونک مار کر دائیں بائیں اپنے کندھوں کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ یہ محض ایک عادت ہے۔ قریب تیس برس ہوئے ہوں گے مولانا آزاد سے تخلیہ میں بات کرتے ہوئے یہی حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی۔ مولانا نے دیکھ لیا۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگے ـــ "میرے بھائی یہ آپ کیا کرتے ہیں مجھے بتائیے"۔ میں نے ساری بات سچ سچ کہہ دی۔ مولانا کو یقین نہ آیا۔ وہ یہی کہتے رہے "نہیں میرے بھائی آپ مجھ سے چھپاتے ہیں۔ مجھ سے سچ سچ کہئے آپ یہ کیا کرتے ہیں"۔ میرا پھر وہی جواب تھا۔ اُس کے بعد اتفاق کی بات ہے کہ جب جب مولانا سے ملتا تھا، خصوصاً جب جب میں اور وہ اکیلے ہوتے تھے بات کرتے کرتے یہ حرکت مجھ سے ضرور ایک دو مرتبہ سرزد ہو جاتی تھی۔ ہر مرتبہ ـــ اور یہ کم سے کم ایک درجن مرتبہ ضرور ہوا ہوگا۔ مولانا یہی کہتے تھے "میرے بھائی آپ مجھ سے چھپاتے ہیں۔"

"مجھے سچ سچ بتائیے آپ کیا کرتے ہیں" میں ہر مرتبہ وہی جواب دیتا۔ پر آخر دن تک مولانا کو کبھی یقین نہ آیا کہ میں اس معاملہ میں سچ بول رہا ہوں۔ ان کی ضد برابر جاری رہی اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ۔ مجھے اور بھی کئی چیزیں ایسی معلوم ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تصوف کی طرف مولانا مرحوم کا ایک خاص رجحان تھا۔ یہی بات میں نے مہاتما گاندھی میں بھی محسوس کی۔ پر میں اِس قصہ کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔

اپنے مخالفین کی طرف مولانا کا رخ ہمیشہ نہایت محبت اور فراخ دلی کا ہوتا تھا۔ اُن کا ایک فقرہ مجھے بہت پسند آتا تھا۔ اپنے مخالفوں کے لئے وہ اکثر اُسے استعمال کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی بابو پرشوتم داس ٹنڈن جب کبھی زبان کے یا کسی اپنے ہی مسئلہ پر ایک غلط رُخ لیتے تھے یا غلط قسم کی ہندی کی غلط طریقے سے تائید کرتے تھے تو اس کا تذکرہ آنے پر مولانا مرحوم ہمیشہ ہنس کر کہا کرتے تھے: ——— "میرے بھائی اُن کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اپنے سے مجبور ہیں۔" اِن معاملوں میں مولانا مرحوم کے اندر خود اعتمادی اور خودداری بھی غضب کی تھی۔ ٹنڈن جی نے جب پارلیمنٹ کے اندر زبان کے مسئلہ پر وہی تنگ رُخ اختیار کیا اور مولانا مرحوم پر بیجا حملے کئے تو ایک دن شام کو میں نے مولانا سے تجویز کی کہ اپنے اوپر حملوں کا وہ خود جواب نہ دیں بلکہ جواب جواہر لال جی دیں۔ تو مولانا نے کڑک کر مجھے جواب دیا ——— "نہیں میرے بھائی میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا جواب دے۔ میں خود جواب دوں گا۔ اور اگر پارلیمنٹ کے ممبروں کو میری بات درست نہ معلوم ہوگی تو میں استعفیٰ دے دوں گا۔" اُس کے بعد مولانا نے اِس مسئلہ کے متعلق پارلیمنٹ میں وہ تقریر کی جو پارلیمنٹ کی تاریخ میں ایک خاص جگہ رکھتی ہے۔ اُس کا ایک چھوٹا سا فقرہ "پُر فریبِ تخیل" بہت دنوں تک لوگوں کی زبان پر رہا۔

اُردو، فارسی اور عربی کے اتنے زبردست عالم اور ادیب ہوتے ہوئے بھی مولانا مرحوم اِس ملک کے لئے گاندھی جی کی آسان اور بول چال کی ہندوستانی کے پورے طرفدار تھے۔ ملک کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے جب یہ سوال آیا تھا تو کانگریس پارلیمنٹری کی میٹنگ کے سامنے مولانا نے صاف صاف اپنے خیال کو پیش کر دیا تھا۔ لوگوں نے نہیں مانا۔ ہم نے گاندھی جی کی بھی بات کو نہیں مانا لیکن اُس وقت سے اب تک کے حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مجھے اِس میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے کہ آخر ہمیں ایک نہ ایک دن اسی راستے پر چلنا ہوگا ؎

ہرچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

مہاتما گاندھی اور مولانا مرحوم میں بھی ایک عجیب قسم کا تعلق تھا۔ یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ گاندھی جی

تجویزیں اور دلیلیں اکثر شروع میں اُن کے ساتھیوں کے سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ میں نے اکثر مولانا کو یہ کہتے سنا ہے "گاندھی جی جب کوئی بات پیش کرتے تھے تو عام طور پر اُن کی دلیلیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ ہم اتفاق نہیں کر پاتے تھے لیکن جب اُن کی بات مان کر اُن کے پیچھے چل پڑتے تو نتیجہ سے ہمیشہ یہی ثابت ہوتا کہ وہ درست تھے اور ہم غلط۔ اُن کی باتیں اکثر ہمارے دماغوں سے اوپر کی ہوتی تھیں۔" یہ الفاظ میں یاد سے لکھ رہا ہوں۔

ہندو یا مسلمان عام لوگوں کے جذبات کا بھی مولانا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ایک مضمون کے لئے میں مولانا کے پاس ایک حدیث لے کر گیا جس میں پیغمبر اسلام نے کسی کو صبح اور شام دو وقت کی نماز کی ہدایت کی ہے۔ مولانا نے دیکھ کر کہا کہ یہ حدیث صحیح سند کی نہیں معلوم ہوتی۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ حدیث ابو داؤد کی تھی۔ انھوں نے ہنس کر جواب دیا ——— "میرے بھائی! اسے پڑھتے ہی وہ خواہ مخواہ لوگ سمجھیں گے ہم مذہب سے ہٹ رہے ہیں۔"

مولانا آزاد مرحوم کا نظام حیدرآباد کی دعوت کو اس لئے قبول کرنے سے انکار کر دینا کیونکہ نظام کے ہاتھ غلط چیزوں سے رنگے ہوئے تھے ایک معمولی بات تھی)۔

ایک مرتبہ ایک بہت معزز اور مشہور صاحب مولانا سے ملے اور ان الفاظ میں میری شکایت کرنے لگے کہ ش. لال جی کمیونسٹ ہیں۔ مولانا نے بجائے اُن کی تردید کرنے کے مختصر یہ جواب دیا ——— "میرے بھائی! کمیونسٹ ہیں، کمیونلسٹ تو نہیں ہیں۔"

میرے جیسے بہت سوں کی اللہ سے یہ دعا ہے کہ اِس ملک کے لوگ خصوصاً ہندو اور مسلمان مولانا آزاد کی زندگی، اُن کی تمام کشمکش، اُن کے کارناموں اور ان کی پُرجلال شخصیت سے مناسب سبق لے سکیں! میں اِس مضمون کو گاندھی جی کی اِس مشہور لائن پر ختم کرتا ہوں ۔

ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سمتی دے بھگوان

مولانا مرحوم کی گھریلو زندگی

از محمد اجمل خاں

حدیث صحبت خوبان و جام و باده بگو
بقول حافظ و فتویٰ پیر صاحب فن

معلوم نہیں کیوں اس حقیقی صبح کو لوگوں نے صبح کاذب کا نام دے رکھا ہے جس کے متعلق کائنات کا ذرہ ذرہ شاہد ہے کہ اس وقت سے بہتر کوئی وقت نہیں ہوتا۔ قدرت کی بوقلمونیوں کی سچی تصویر اگر نظر آسکتی ہے، سکون و راحت تازگی و شگفتگی کا اگر کوئی نقشہ بن سکتا ہے تو اس کا یہی وقت ہوتا ہے۔ ٹھیک اس وقت، گرمی ہو یا جاڑا، بہار ہو یا خزاں مولانا خواب سے بیدار ہوکر خود اپنے ہاتھ سے سادہ چائے بناتے تھے۔ اور چند سگرٹ پینے کے بعد خوش نما فنجان میں ہلکے رنگ کی چائے پینے لگتے تھے۔ سفر ہو یا حضر، ملازم کا قاعدہ تھا کہ شب کے کھانے کے بعد چائے کا سامان مع سپرٹ کے چولھے کے (سفر میں)، یا بجلی کے ہیٹر کو (حضر میں) قرینہ سے رکھ دیتا۔ مولانا کو یہ پسند نہیں تھا کہ ملازم یا کسی دوست کو "صبح کاذب" کی چائے کے لئے تکلیف دیں۔ البتہ آخری چند برسوں میں جسمانی ضعف کی مجبوری نے، ملازموں کے سپرد یہ خدمت کرادی تھی۔

یہ وقت مولانا کے پاکیزہ افکار کے ابلنے کا وقت ہوتا تھا جن لوگوں کو اس وقت ان کی ہمنشینی کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ چائے کی فنجان کے ہلکے گلابی رنگ، اور مصری سگرٹ کے پرپیچ و خم دھوئیں سے سا[illegible] یاد آتے تھے یا اس کے ساتھ ساتھ کسی کے "جعد مشکیں" بھی۔ یا اس چائے سے نطق و کلام کے دریا رواں ہو[illegible] تھے اور "رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے" والا اثر پیدا ہوجاتا تھا بہرحال اس خلعت خاص میں [illegible]

منہ سے وہ پھول جھڑتے تھے کہ ؎

حافظ از آبِ حیاتِ ازلی میخواہی
منبعش خاکِ درِ خلوتِ درویشانست

اگر کوئی ہمنشین ہوتا تھا تو تین فنجانیں ضرور پاتے تھے۔ اتنے میں اخبارات پہنچ جاتے تھے اور غسل سے فارغ ہونے کے بعد بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ آٹھ نو بجے کے درمیان خطوط کے جواب دئے جاتے تھے۔ اگر کوئی بیان پریس کو یا حکومت کو دینا ہوتا تو اس وقت وہ بھی تیار کیا جاتا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب دو نیم برشت انڈے اور ایک دو ٹوسٹ کھا کر اور دودھ والی کالی چائے پی کر پھر کام میں لگ جاتے تھے۔

وزارت میں آنے سے پہلے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے بہت سادہ کھانا کھا لیا کرتے۔ اگر کلکتہ سے باہر قیام ہوتا تھا مثلاً وردھا میں ورکنگ کمیٹی کے سلسلے میں، یا کانگریس کے سالانہ سیشن میں، تو دوپہر کے کھانے کے اوقات میں میزبان کی آسانی کا خیال رکھتے تھے۔ اور اگر دیر ہونے لگتی تھی تو صرف چائے اور چند نمکین بسکٹ کھا لیتے تھے اور کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ملاقاتوں کے لئے گھر پر دفتر جانے سے پہلے بھی وقت نکال لیتے تھے اور دفتر میں بھی۔ ٹھیک دس بج کے بیس منٹ پر دفتر کے لئے روانہ ہو جاتے تھے اور وہاں دفتری یا پارلیمنٹری کام کرتے رہتے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب گھر پہنچتے تھے۔ اور چند منٹ بعد کھانا کھا لیتے۔ عموماً دوپہر کے کھانے میں مچھلی کے دو ٹکڑے تلے ہوئے خشکہ۔ قورمہ۔ دال ترکاری ہوتی تھی۔ روٹی نہیں کھاتے تھے البتہ رات کے کھانے میں روٹی اور چوزہ کا سالن بھی کھاتے تھے۔

سہ پہر کی چائے کے ساتھ بھرے ہوئے سموسے ضرور کھاتے تھے۔ اور رات کو نو بجے کھانا کھا لیتے تھے اور دس بجے تک سو جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ضرور قیلولہ کرتے تھے۔

کھانے کے معاملہ میں بھی وہ اعتدال پسند تھے۔ بلکہ میرے خیال میں اعتدال میں بھی کمی کی طرف مائل تھے۔ وقت بے وقت کھانا کھا لینا اُن کے شعار کے خلاف تھا چٹ پٹی اور نمکین چیزیں پسند تھیں۔ مٹھائی کی طرف بالکل رغبت نہیں تھی۔ بلکہ میری حلوہ خوری پر اُنھیں تعجب ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ وار دھا میں ورکنگ کمیٹی تھی۔ سب کا کھانا سیٹھ جمنالال بجاج (یعنی بزاز) کی بیوی سے متعلق تھا۔ سیٹھ صاحب گائے کے بڑے محافظ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ گائے کشی کو روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگ

صرف گائے کا گھی کھائیں۔ لہذا اُن کے یہاں خالص گائے کا گھی ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سودیشی کے اتنے حامی تھے کہ گڑ کھانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور موسمی غلّوں کی روٹیاں، مثلاً جوار، باجرہ وغیرہ بھی دسترخوان پر ہوتا تھا۔ مرہٹوں کی مرغوب غذا یعنی نمکین چیوڑے بھی ناشتہ میں ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو مولانا ناپسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھا جواہر لال کس مزے سے گڑ کھا رہے ہیں۔ مولانا کو گڑ پسند نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ مولانا پنڈت جی نے ولایت میں تعلیم پائی ہے اور جو مزہ چاکلٹ میں ہوتا ہے وہی گڑ میں ہوتا ہے۔ اس پر وہ ہنسنے لگے۔

غالباً ۳۷ء یا ۳۸ء کا واقعہ ہے کہ مولانا پشاور میں ڈاکٹر خان صاحب (شہید) کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہیں دیہات سے یا اُتمان زئی سے گڑ آیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ بھی کھایا مگر مولانا نے ایک ڈلی نہ اُٹھائی۔ میں نے دو چار ڈلیاں مزے لے لے کر کھائیں۔ خیر معاملہ رفت گذشت ہوا۔ شام کے کھانے پر پڈنگ تھی، مگر گڑ ندارد۔ میں نے ڈاکٹر خان صاحب سے کہا کہ کیا آپ سب گڑ کھا گئے۔ اُنھوں نے ملازم سے کہا کہ گڑ ہو تو لاؤ۔ دو چار ڈلیاں بچی کھچی رہ گئی تھیں۔ وہ سب میں نے کھالیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ گڑ بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا مولانا یہ گڑ نہیں ہے حلوائے مغزیات ہے۔ اور باوجود خان برادران کی تصدیق کے مولانا نے گڑ کو منہ نہ لگایا کاش کھا لیتے تو سمجھ جاتے کہ اس میں ثابت بادام پستے چلغوزے ملے ہوئے تھے۔ بہرحال مولانا نے بعد سے تنہائی میں فرمایا کہ کسی کے دسترخوان پر فرمائش نہ کیا کرو۔

(یہاں اردو رسم الخط کے بعض مصلحین کو توجہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ قدیم زمانے میں گڑ کو گوڑ لکھتے تھے جیسا کہ پیش کو اب بھی واؤ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس طرح پیش کا اظہار ہو جاتا تھا لہذا اگر اب مستند رسم الخط گڑ ہے تو انجمن ترقی اردو کو یہ ہدایت جاری کرنا چاہیئے کہ اس کے املا میں پیش ضرور لکھا جائے ورنہ قشا بہ ہوتا ہے فمن شنئه یقوم وهو لیس منهم)

پھلوں سے بھی مولانا کو رغبت نہ تھی۔ ڈاکٹر بار بار کہتے تھے کہ "وٹامن بی" کا کھانا ضروری ہے اور وہ پھلوں میں ہوتی ہے۔ لیکن مولانا ادھر بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ آخری عمر میں نارنگی کا عرق یا کسی پھل کی دو چار قاشیں سہ پہر کے ناشتہ کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ "وٹامن بی بی" کو چبا ڈالنا اُنھیں پسند نہ تھا۔ یا تو اُس کی نوعیت کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ شیرینی کا نتیجہ تلخ کامی ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ دیدار سے حسرت دیدار زیادہ مردافگن ہوتی ہے:

یا بقول حافظ:- ز حسرت لب شیریں ہنوز می بینم
کہ لالہ می دمد از خون دیدۂ فرہاد

بہر حال اگرچہ مولانا فرما چکے تھے کہ کسی کھانے کی چیز کی دوسرے کے دسترخوان پر تعریف کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے پھر ایک جگہ تعریف کر دی۔ ہوا یہ کہ ہم ڈاکٹر حبیب علی پٹیل کے یہاں وارڈن روڈ بمبئی میں مہمان تھے۔ مختلف پھلوں کا ذکر چلا۔ مولانا چپ تھے۔ ڈاکٹر پٹیل نے طبی فوائد بتانے میں نے طب سے قطع نظر کرکے کہا کہ جناب معلوم نہیں لوگ آم کی کیوں تعریفیں کرتے ہیں۔ میری رائے میں تو بہترین پھل انجیر ہے (معلوم نہیں انجیر کو لوگ مؤنث بولتے ہیں یا مذکر، میں تو اس کی انتہائی شیرینی خوش ذائقگی گولائی، اختصار اور رنگینی کی وجہ سے مؤنث سمجھتا ہوں) ڈاکٹر صاحب کی بیوی محترمہ جینابائی (یعنی زینب بی) نے فوراً پونا تار بھیجا۔ اور شام تک بہترین انجیریں کھانے کی میز پر موجود تھیں۔ مولانا کو بھی دو ایک کھانا پڑیں۔ لیکن انھوں نے مجھ سے بعد تنہائی میں فرمایا کہ فرمائش "کرنی" ٹھیک نہیں ہے۔ مگر ہم کب چوکنے والے تھے۔ علی گڑھ کالج ہی کے زمانے سے حلوہ خوری بلکہ سینہ زوری کی عادت پڑ گئی۔ معلوم نہیں صفی الحسن اور صولت حسین کہاں ہیں۔ جو منٹو سرکل میں بلاک کے بارہ نمبر کے کمرہ میں ۱۹۱۱ء میں رہتے تھے۔ اور جن کا اٹھارہ سیر نقد حلوہ رفیع احمد قدوائی مرحوم کے ساتھ ہم سب نے "اڑایا" تھا۔ اور پندرہ منٹ کے اندر سب "دست خود دہان خود" ہو گیا تھا۔

مولانا کی یہ بھی عادت تھی کہ دعوت قبول نہ کرتے تھے۔ اور اگر بہت اہم سیاسی وجوہ ہوئے تو وہ رات کے کھانے میں تو کبھی شریک ہی نہ ہوتے تھے۔ البتہ لنچ منظور کر لیتے تھے اور کھانے میں حسب دستور نہایت احتیاط برتتے تھے۔

اپنے گھر پر ہوں یا باہر کھانے کی میز پر وہ گل افشانی کرتے تھے کہ جی چاہتا تھا کہ صبح سے شام تک کھائے جاؤ اور اُن کی شیریں گفتار اور رنگینیٔ ادا سے ذائقہ سماعت حاصل کرتے رہو۔ کہیں یہ ذکر آ جاتا تھا کہ ہندوستان کے کھانوں میں ابن بطوطہ کو کشنری (یعنی کھچڑی) اور پاپڑ بہت پسند تھے۔ میں نے کہا کہ ابن بطوطہ ہی کو نہیں بلکہ انگریزوں کو بھی پاپڑ بہت مرغوب تھے۔ اور جب انھوں نے پہلے پہل کاغذ دیکھا تو اسے پاپڑ (PAPER) کہنے لگے۔ یعنی یہ وہی چیز ہے جو ہندوستان میں کھائی تھی۔ کبھی شکر کا ذکر آتا تو فرماتے کہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں نیشکر کا پودا غالباً مصر یا چین سے آیا ہے۔ ورنہ کیوں مصری اور چینی کے نام یہاں رائج ہوتے۔ وہ سبز مرچ کی بہت تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حکیم صاحب (یعنی حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم) کا قول ہے کہ جو شخص

سبز مرچیں کھاتا ہے اُسے کبھی نہ تو معدہ کی شکایت ہوتی ہے نہ پیچش قریب آتی ہے۔

جب سے الہ آباد کے اسٹیشن پر مولانا ایک نارنگی کے چھلکے پر پھسلے اور اُن کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹی، وہ ہمیشہ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ وارد ھا میں سب فرش پر بیٹھتے تھے۔ مگر مولانا کے لئے ایک میز کرسی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ زیادہ پسند کرتے تھے کہ چھری کانٹے سے کھانا کھائیں۔

لباس

بچپن میں مولانا کا وہی خاندانی لباس تھا جو مولویوں اور مشائخ میں رائج تھا۔ لیکن اُن کی طبیعت میں نہ صرف تقلید ذہنی سے دور رہنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے پیروں اور پیرزادوں کے طرز بود و ماند سے بھی الگ راستہ اختیار کرنے کا خیال ابتدا سے تھا۔ سرسید نے جو تحریک شروع کی تھی اُس کا دماغ پر کافی اثر تھا۔ اس کے علاوہ "الہلال" کے ابتدائی دور میں ترکی کی طرف پورا ہندوستان متوجہ ہو گیا تھا۔ علی گڑھ میں ترکی ٹوپی۔ ترکی کوٹ اور شو یا بوٹ طلبہ کا مخصوص لباس مقرر ہوا تھا۔ اور خود ترکی سلطانوں اور جرنیلوں کی تصویریں ہر کمرہ میں نظر آتی تھیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جو مڈیکل مشن لے گئے تھے اُن عبدالرحمان سندھی (صدیقی) مرحوم بھی تھے۔ جنھوں نے کلکتہ کی سخت گرمی میں بھی نمدے کی ترکی ٹوپی کا استعمال نہ چھوڑا۔ شعیب قریشی بھی تھے۔ جو ترکی سے ایک کلپاک لائے تھے اور اسے اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ ۱۹۱۳ء سے آج تک وہی ٹوپی اُن کے استعمال میں ہے۔ البتہ چودھری خلیق الزماں کی لکھنویت نے اُن کو ترکی ٹوپی کے بوجھ سے، اور خصوصاً گرمی میں، آزاد کر دیا ہے۔ بہر حال سرسید کی ترقی پسندی اور بین الملیت کا یہ اثر تھا کہ نہ صرف خطبات احمدیہ اور سائنٹیفک سوسائٹی کی مطبوعات نے مولانا کے نوخیز دماغ پر اثر ڈالا۔ اور سرسید کی "نیچریت" نے مولانا کے لباس میں بھی ظہور کیا۔ یعنی اُنھوں نے ترکی یعنی یوروپین لباس پہننا شروع کیا۔ ان کی ایک تصویر "آزاد کی کہانی" حالی پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے (دیکھئے ص ۱۸۶) جس میں سر پر عمامہ کی جگہ سیاہ ٹوپی ہے۔ بہت اونچا سخت کالر ہے۔ قمیص کے بھی کف سخت ہیں۔ کھلے گلے کا سیاہ ٹرکش کوٹ ہے سفید پتلون ہے اور پاؤں میں بوٹ ہے لیکن ہندوستان میں یہ لباس بعد میں ترک کر دیا۔

مولانا جب یورپ وغیرہ گئے ہیں تو یوروپین لباس کے کئی جوڑے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اور وہاں استعمال کرتے تھے۔

ہندوستان میں ان کا یہ شعار تھا کہ ۱۹۲۰ء تک وہ ایک ہلکا عمامہ باندھتے تھے اور بجائے عبا قبا کے وہ شیروانی کا استعمال کرتے تھے ۔ کانگریس پارٹی میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے کھدر کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کے استعمال سے سخت تکلیف ہوتی تھی اس لئے کہ ۲۰ء کے کھدر میں سوت کے اندر بنولے کے نوکدار ٹکڑے بھی کت جاتے تھے اور بدن چھیل دیتے تھے ۔ الہ آباد کی گرمیوں میں جب مولانا ۴۲ء میں نینی جیل میں تھے تو اُن کے بدن پر گرمی اور کھدر کے اثر سے گرمی دانے نکل آئے تھے ۔ میں نے بہت کوشش کی کہ خس کی ٹٹیاں مہیا کر دوں لیکن حکومت یوپی کی اجازت اُس وقت آئی جب برسات شروع ہو رہی تھی ۔

معجون روشن دماغ

اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے ایک معتقد حکیم صفی الدین صاحب نے ایک معجون مقوی دماغ بنائی تھی ۔ مولانا محمد میاں فاروقی (حال ممبر پارلیمنٹ) میرے ساتھ جیل خانہ گئے تھے ۔ حکیم صفی الدین صاحب کا تحفہ پیش کیا گیا ۔ تو مولانا نے فرمایا کہ "کیا حکیم صاحب سمجھتے ہیں کہ میرے دماغ کا کوئی گوشہ تاریک ہے ؟" وہ معجون مولانا نے لے تو لی ، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو (حال چیف منسٹر مدھیہ پردیش) کو دے دی ۔ معلوم نہیں اُن پر کیا اثر ہوا ۔

مولانا کا یہ حال تھا کہ دواؤں کے معاملہ میں بھی وہ یوروپین دواؤں کو ہندوستانی طبی دواؤں پر ترجیح دیتے تھے ۔ کسی ہندوستانی (یعنی یونانی) دوا کی لاکھ تعریف کیجئے ، لیکن مولانا اُس کو ہرگز استعمال نہ کرتے تھے ۔ آخری چند مہینوں میں اُنھوں نے کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے بوس کا ہومیو پیتھک علاج شروع کیا تھا لیکن عقیدہ کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ مولانا پر ان کی دواؤں کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا ۔

مولانا کی یہ عادت تھی کہ جب علماء سے ملاقات کرتے تھے ۔ تو ٹوپی پہن لیتے تھے لیکن تنہائی میں یا غیر علماء کے سامنے ننگے سر رہنے لگے تھے ۔ ۳۰ء کے بعد سے ۴۷ء تک یہ عادت تھی کہ ورکنگ کمیٹی اور عام کھانے میں بھی ٹوپی پہنے رہتے تھے ۔ جیسے وہ ٹوپی اوڑھنا کہتے تھے ۔ ایک دفعہ واردھا میں جواہر لعل جی نے کہا کہ مولانا اتنی گرمی ہے یہ ٹوپی بہت گرم ہے ۔ مولانا نے فرمایا کہ محض وضع کی پابندی ہے ۔

سگرٹ اور کتاب

مولانا کی زندگی کے دو اجزائے لاینفک تھے ۔ ایک سگرٹ ، دوسرے کتاب ۔ انھوں نے سگرٹ پینے کی اتنی کثرت کر دی تھی کہ ایک کے بعد ایک سگرٹ پیتے رہتے تھے ۔ اگر کچھ لکھنا بھی ہوتا تھا تو سگرٹ کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں تھامے رہتے تھے حتی کہ انگلیاں

دھوپ کے اثر سے رنگین ہوگئی تھیں ۔

ویسے مولانا نے عربی اور خصوصاً فارسی کی اکثر کتابیں پڑھ ڈالی تھیں لیکن بعد میں انگریزی کتابوں کا شوق بے حد بڑھ گیا تھا ۔ تحفتہً بہت سی فارسی عربی اردو کی کتابیں آتی رہتی تھیں، لیکن کسی پر اعتنا نہیں کرتے تھے۔ عنوان کتاب دیکھ کر مضمون کتاب کو بھانپ لیتے تھے ۔اور کسی کسی کتاب پر سرسری نظر ڈال دیتے تھے ۔بعض کتابوں کا کبھی کبھی تذکرہ بھی کر دیتے تھے ۔ ان میں سے چودھری غلام رسول مہر کی " حیات سید احمد بریلوی " اور " حالات غدر" کا دو دفعہ اس طرح ذکر کیا ۔ کہ جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے پوری کتاب پڑھ ڈالی ہے ۔ سید صاحبؒ کے انصار میں میرے دادا الہ داد خاں بھی تھے ۔ مجھ سے بار بار اُن کے حالات پوچھے ۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہو کہ انھیں سید صاحب کے مسلک سے وابستگی کی وجہ سے اُن کے نام لیواؤں سے بھی محبت تھی ۔ اسی طرح میرے والد کے متعلق پوچھتے رہے کہ غدر میں اُن کے کیا کارنامے تھے میں نے اُنھیں بتایا کہ جب ناناصاحب کے حکم سے انگریزوں کی کشتی کانپور میں ڈبوئی گئی ہے تو میرے والد (محمد اسماعیل خاں صاحب مرحوم) نے ایک انگریزن کو دریا میں گھس کر نکال لیا تھا ۔اس کا نام مس ایمیلیا کُک (EMALIA COOK) تھا پھر اُسے گھوڑے پر سوار کر کے گھر لے آئے تھے ۔ اسد اللہ شاہ کے ہاتھ پر مسلمان کرا کے اُس کو بیعت کرایا تھا اور پھر نکاح کر لیا ۔ فرمایا کہ ؎

سر نوشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

میں نے عرض کیا کہ اب تو کانگرس کے فرمان کے مطابق سپہ گری کی جگہ ترچھی نظروں سے دیکھنا بھی تشدد سمجھتے ہیں ۔اس پر مولانا نے کسی قدیم شاعر کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

قتل مت کرنا مجھے تیغ و تبر سے دیکھنا
بس کفایت ہے ترا ترچھی نظر سے دیکھنا

اور پھر ایک حافظ کا شعر پڑھ کر آخری فیصلہ کر دیا کہ شدت و لینت اضافی باتیں ہیں :۔

تو خانقاہ و خرابات در میانہ مبین
خدا گواہ کہ ہر جا کہ ہست با اویم

دوسری باتیں : معلوم ہوتا ہے بچپن سے پیرزادگی کا قلب و دماغ پر اتنا اثر پڑا تھا کہ وہ صحبت عوام سے

گریز کرتے کرتے، خواص سے بھی بہت کم ملنا چاہتے تھے۔ ان کے بچے ہوتے تو شاید یہ "خلوت در انجمن" اور "نظر بر قدم" کے نقشبندی اقوال اُن کے دماغ پر تنہائی اور خلوت گزینی کا حملہ نہ کرنے دیتے۔ بچپن میں نہ بچوں کے ساتھ کھیلے، نہ مریدوں کی جا و بیجا دست بوسی و پا بوسی کو پسند کیا۔ بڑے ہوئے تو ٹہلنے کے لئے بھی کمرہ سے باہر نہ نکلے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سائے کو ساتھ رکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس کا اُن کی صحت پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا لیکن باوجود ڈاکٹروں اور دوستوں کے اصرار کے وہ سیر گلگشت کو ضیاع وقت سمجھتے رہے حتیٰ کہ وہ اپنے ہی خیالات میں غرق رہنے لگے۔ "ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو" کا معاملہ صرف مولانا پر صادق آتا ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

بعض احباب مثلاً قاضی محمد عبدالغفار مرحوم یا چودھری غلام رسول مہر، ہفتوں مولانا کے مہمان رہتے تھے لیکن ملاقات کا وقت مشکل ہی میسر آتا تھا۔ مولانا ہوتے تھے یا اُن کے خیالات، یا کتابوں کے ذریعے دوسروں کے خیالات۔ لکھنے کی عادت تھی لیکن قید و بند کی تنہائی میں تو کچھ نہ کچھ لکھ ہی لیتے تھے۔ آزادی اور وزارت کے پھندے کی آزادی نے سرکاری تحریروں کو تو لکھوا دیا لیکن مولانا پھر کوئی ایسی تصنیف نہ کر سکے جیسی کہ غبار خاطر ہے، نہ ترجمان القرآن کے مطالب کو صفحۂ قرطاس پر لا سکے۔ البیان کا تو ذکر ہی کیا۔ میرے بڑے اصرار پر سیرت نبوی کے متعلق کچھ اشارات قرآن سے بیان فرمائے تھے لیکن اپنی بیماریوں کے مسلسل حملے کی وجہ سے وہ بھی نہ کر سکے، حالانکہ اُن کا خیال رانچی کے زمانہ سے یہ تھا کہ خود قرآن سے رسول کریم کی ایک اچھی خاصی سیرت تیار ہو سکتی ہے۔ احمد نگر فورٹ جیل میں یہ خیال بھی آصف علی مرحوم نے پیدا کیا تھا کہ ایک مختصر رسالہ اسلام پر انگریزی میں مرتب کیا جائے گا جس کا نام بیسک اسلام (BASIC ISLAM) ہوگا۔ رہائی کے بعد باوجود میری اور آصف علی مرحوم کی یاد دہانیوں کے یہ بھی مرتب نہ ہوا۔

اُنھوں نے ترجمان کی دوسری جلد پر بہت سے حاشئے چھوڑے ہیں۔ امید ہے اگر اُس کے چھپنے کی نوبت آئی تو بعض اور حقائق سامنے آئیں گے۔ اسی طرح وہ لکھنے سے پہلے بہت سے اشعار مستحضر کر لیتے تھے اور انھیں مضمون میں اس طرح سموتے تھے کہ شاعر سنتا تو خود حیران رہ جاتا کہ شعر کس قدر بلند، لطیف اور سلیس ہو گیا ہے۔ اُن کی عادت تھی کہ عبارت میں ایجاز پیدا کرنے کے لئے لکھتے تھے اور نظر ثانی سے پہلے ہی کاٹتے ہی جاتے تھے۔ لفظوں اور خیالوں کو تولتے تھے اور ایک عدیم النظیر صناع کی طرح انھیں موزوں ترین مقامات پر جڑ دیتے تھے۔

اب کس کی مجال ہے کہ اُن کو اپنی جگہ سے ہلائے۔

ان کی گھریلو زندگی میں بیگم صاحبہ کی وفات نے ایک خلا پیدا کر دیا تھا جس کا پر ہونا محال تھا۔ ان کی وفات کے بعد سے وہ صرف اپنے دماغ کے بھروسے پر زندہ تھے۔ اگر ہنستے بھی تھے تو اوپری دل سے، اور خاموش رہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گہری فکر میں ہیں، جس میں غم ملا ہوا ہے۔ تقسیم ہند اور خودکشی حیدرآباد کے بعد تو وہ بالکل بجھ گئے تھے۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں!



کمال اتاترک کے مزار پر



آخری دیدار

تقریظ و تبصرہ تذکرۂ صادقہ

قاضی عبدالودود

الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور معروف بہ تذکرۂ صادقہ کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فن انساب میں ہے، اور اس کے "مؤلف" مولانا مولوی عبدالرحیم صاحب زبیری الہاشمی عظیم آبادی ہیں۔ یہ "مؤلف" کے خلف اصغر محمد نور الہادی کی فرمائش سے ہادی المطابع (۱۴۱ ہیرسین روڈ کلکتہ) نے چھاپی تھی۔

"مؤلف" نے جو اپنے حالات کتاب کے ص ۱۲۱ تا ۱۵۰ میں دیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے: تاریخ ولادت ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ، والد کا نام فرحت حسین (متوفی ۱۲۷۱ھ)۔ اساتذہ: فرحت حسین، احمد اللہ، حکیم الٰہی حسین، حکیم عبدالحمید، فیاض علی وغیرہ۔ بتاریخ ۱۴ شعبان ۱۲۸۰ھ "بجرم اعانت باغیان" گرفتار، اور بتاریخ ۲۷ رمضان انبالے بھیجے گئے۔ وہاں مقدمہ چلا اور سزایاب ہوئے۔ پہلے ہندوستان کے مختلف قیدخانوں میں رہے، بعد ازاں کالے پانی بھیجے گئے۔ انھیں پہلے حبس دوام کی سزا دی گئی تھی، لیکن بعد کو اسے منسوخ کر کے تا صدور حکم ثانی قید و عبور دریائے شور کا حکم دیا گیا تھا۔ لارڈ رپن کے زمانۂ حکومت میں یہ خیال آیا کہ یہ "نہایت رحمدل اور نیک مزاج مشہور ہیں" اور .. قید کو بھی قریب ۱۹ برس کے گزر گیا .. اس وقت میں کوئی تحریک رہائی کی کی جائے تو غالباً مفید پڑے گی .. چنانچہ منشی محمد جعفر تھانیسری ... نے ایک مسودہ عرضی کا تیار کیا اور ان کی اہلیہ کی طرف سے "بصلاح چند دُکلا مرتب و مکمل کر کے" لارڈ رپن کو بھیجا گیا اور "چھان بین" کے بعد ان کی رہائی کا حکم صادر ہوا۔ یہ بتاریخ یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ پٹنہ پہنچے۔

تقریظ جو "ریویو" کے نام سے چھپی ہے، بعض غیر اہم امور سے قطع نظر بالکل مطابق اصل نقل کی جاتی ہے:

ریویو | بر کتاب مستطاب تذکرۂ صادقہ | از مجمع فضائل و محاسن، شاعر باکمال، سخنور بے مثال، مولوی ابو الکلام محی الدین احمد صاحب | آزاد دہلوی، مقیم کلکتہ صانہ اللہ عن شر الحساد، حمد اس جل کا مہ تذکرۃ الاولی الابصار |

واودع البواطن القدسیۃ خزائن الاسرار، ونصلی علیٰ صاحب الکتاب المبین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست ، رو پس نکرد ہر کہ ازیں کارواں گذشت

"تذکرۃ الاسلاف لتبصرۃ الاخلاف" عربی کا ایک اعلیٰ درجہ کا مقولہ ہے جس کا سچا مصداق یہ تذکرۂ اہلِ صادقپور ہے۔ اس کے مؤلف اس خاندان کے یادگار، جناب مولنا عبدالرحیم صاحب صادقپوری ہیں، جنھوں نے اپنی لائف اس کتاب کے صفحہ ۱۳۰ سے صفحہ ۱۵۰ تک درج کی ہے۔

فاضل مؤلف نے اس تذکرہ میں اس خاندان کی تمام کیفیت اور تمام اہلِ خاندان کے حالات نہایت عمدگی سے تحریر کیے ہیں، بالخصوص ایسی حالت میں کہ تمام خاندان کا شیرازہ پریشان ہوچکا ہو، اور واقفیت اور تحقیق کے بہت کم ذرائع باقی رہ گئے ہوں۔ ان کی یہ کتاب نہایت مفید اور خاندان کے بقائے دوام کا عمدہ ذریعہ ہے۔

غور سے دیکھو تو جس قدر یہ تذکرہ عبرت کا یقین دیتا ہے، اور جس قدر اس خاندان کے تمام واقعات انسان کی طبیعت کو موثر کرتی ہیں غالباً بہت کم ایسے تذاکر اور ایسے واقعات ہوں گے۔

اول تو "عروج و زوال" کی تصویر جس قدر بہتر اس تذکرہ سے کھینچ سکتی ہے کسی واقعہ سے نہیں کھینچ سکتی۔ ایک خاندان کا یہاں تک ترقی کرنا کہ دولت علم اور دولت و مال میں ان کی نظیر نہ ہو، ہزاروں ان کے جاننے والے ہوں، ہزاروں جاں نثاری کے لیے موجود ہوں، خاندان کا خاندان ایک موقع پر سکن گزیں ہوجانے، اور اتفاقی صورت کا نام "صادقپور" اختیار کرے۔ باوجودیکہ یہ نام ایک شہر کے کسی حصہ سے تعلق رکھتا ہو مگر مسمّٰی کی ترقیات جزئی شہرت سے بڑھ کر کلی شہرت سے بھی بڑھ جائے۔ علمی حیثیت سے دیکھو! تو بڑے بڑے مصنف اعلیٰ درجہ کے واعظ خاندان میں موجود ہوں، دولت کے لحاظ سے دیکھو تو تمام موجودہ دولتمندوں میں اُن کے ڈنکے بجتے ہوں، پھر یکایک اُس خاندان کا ایسے ورطۂ تنزل میں آ پڑنا، جس سے اُس کی تمام ترقیات پر پانی پھر جائے، یعنی سر سے بیڑا ہی ڈوب جائے، کوئی نام لیوا نہ نظر آئے، کوئی جاں نثار جاں نثاری نہ کرے، خود عاکر وقت بخت برگشتہ کی طرح پھر جائے، خود اپنے پرائے ہوجائیں، دم کے دم میں کارخانہ ہی پلٹ جائے، اور ایک آنکھ بند کرنے والا جب ایک پل کے بعد آنکھ کھولے، تو اُسے بجائے ایک خوبصورت محل کے ایک وحشت ناک لق ودق چٹیل میدان نظر آئے۔ نہ اُس کے سر بفلک محلوں کا کچھ نشان معلوم ہو اور نہ اس صادقپوری دیواروں کی کچھ یادگار باقی ہو۔ پس ایک انقلابی صورت دیکھنے والے کو حیرتی اور مبہوت بنا دے!!! ہای آں صادقپور بہ کجاست! و اہلِ صادقپور بہ کجا اندا نہ مکاں را تمکنے! و نہ مکیں را تمکنے! الٰہی ایں چیست!

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس لئے ہوا؟ بس بس! یہ کچھ نہیں معلوم! ہاں اُس حکیم علی الاطلاق خالق دو جہاں کی بے انتہا قدرتوں سے ایک انقلاب کنندہ قدرت ہے کہ "اقبال کو تنزل سے بدل دینا"!! مگر اس کا سبب ظاہری بجز نا اتفاقی کے اور کچھ نہیں۔ تو ارہ یا مستی!

اب دیکھو!! کہ بیان انسان کو اُس کی بے انتہا قدرت کاملہ اور نا اتفاقی کی برائیوں کا یقین دلاتا ہے اور سننے والوں کو کس قدر موثر کرتا ہے، ہاں! اور نہیں تو تم ذرا اپنے ہی دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کیسا کانپ رہا ہے۔ اکیسی ہولناک کیفیت پیدا کر رہا ہے! اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر اور کیا حالت موثر ہوگی!؟ —

پھر اس خاندان کے جو پس ماندہ تھے، ان کے ساتھ کس طرح یہ فلک کج رفتاری سے پیش آیا؟ "کونسی مصیبت تھی کہ ان پر نہ آئی ہو" اور وہ کونسی سختی تھی کہ انھوں نے جھیلی نہ ہو۔ مگر ساتھ ہی ان کا بے نظیر صبر و تحمل اور اس جانگداز حالت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرنا صبر و شکر کی ایسی عمدہ تعلیم دیتا ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ! —

اس کے بعد پھر اتفاق اور استقلال کا ساتھ دینا، ایک کوشش کرنے والے کی کوشش سے خاندان کا پھر ترقی کرنا اسکول کا جاری ہونا علم کا ساتھ دینا، اس سب کچھ کا ایک اتفاق کی بدولت ہونا، کیا اتفاق کی تعلیم نہیں دیتا؟!

واقعی یہ کتاب اول سے آخر تک خاص خاص کیفیتوں اور حالتوں کا فوٹو پیش نظر کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ کتاب تالیف فرمائی ادھر اُدھر سے کوشش کر کے واقعات اکٹھا کیے۔ چیونٹیوں کے ذریعے سے شکر جمع کر کے لڈو تیار کیا اور ہم لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ اپنے مکرم دوست جناب مولانا محمد یوسف صاحب جعفری چیف مولوی بورڈ آف اکزامنرس کلکتہ کی فرمائش سے میں نے ایک مثنوی فارسی تقریظاً میں نظم کی تھی جو وقت گنجائش کے سبب سے یہاں درج نہ ہو سکی۔ تین قطعات تاریخ درج کرتا ہوں۔

قطعہ تاریخ تصنیف تذکرہ صادقہ

مژدہ اسے والہان صادقپور — مژدہ اے عاشقان کوئے وطن
حضرت مولوی "عبد رحیم" — صاحب علم و ماہر ہر فن
تذکرہ یہ انھوں نے لکھا ہے — جس کی تعریف میں زباں الکن
نقطہ نقطہ ہے خال روئے بتاں — صفحہ صفحہ بیاض صحن چمن
واقعات صحیح لکھے ہیں — جس میں کچھ بھی نہیں ہے جائے سخن

تذکرہ یہ وطن کا لکھا ہے — اس پہ شیدا ہیں عاشقان وطن
اس میں لکھا ہے "حالِ صادقپور" — جو کبھی تھا علوم کا گلشن
جو بزرگوں کا تھا کبھی ملجا — جو بزرگوں کا تھا کبھی مسکن
عالم و فاضل و ادیب و حکیم — الغرض کاملوں کا تھا مخزن
شمع بزم کمال کہیے انہیں — جن سے بیت العلوم تھا روشن
اس کو کہیے نہ کمال اگر — اس کو کہیے کمال کا معدن
ہائے دیکھو یہ گردشِ دوراں! — ہائے دیکھو! زمانہ کے یہ چلن!
آہ خزاں لوٹ لے گئی سب کچھ — اب نہ وہ پھول ہیں نہ وہ گلشن
ہاں فقط یادگار ہیں باقی — جن سے اب نام ان کا ہے روشن
میرے مخدوم حضرت رنجور — جن کی توصیف اپنی ناممکن
ان کا ارشاد تھا لکھو تاریخ — اُن کا اصرار تھا کہ تعجیلاً
تھی اسی فکر میں پریشانی — غور میں تھا کہ کہاں گماں فوراً
دل سے آزادؔ کو ملی تاریخ — ہے طراز ندہ ذکرِ اہل وطن

۱۳۱۹ھ

ولہ

اس رسالے کی کس سے ہو تعریف — واقعی فیض کا مقالہ ہے
ہر روایت ہے مستند اس کی — معتبر اس کا ہر حوالہ ہے
سر سے آزادؔ لکھ دو ہجری سال — خیرِ آفاق یہ رسالہ ہے

۱۳۱۹ھ

ولہ
قطعہ تاریخ طبع کتاب مذکور

چاپ کردند ایں کتاب نفیس — فکر شاں را صد آفریں بادا
از لبِ ہاتف ایں ندا آمد — سرمۂ چشم ناظریں بادا

۱۳۲۰ھ

صـ۲۱۱ تا صـ۲۱۲

لسان الصدق کے ایک شمارے کے دو صفحات (۱۷ تا ۲۶) پیش نظر ہیں : ان میں پہلے چراغ دہلی مصنفہ مرزا حیرت دہلوی کا تبصرہ ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے :

میرزا غالب کے حالات میں ان کے سفر کلکتہ کی اصلی وجہ شاگردان قتیل سے مباحثہ بیان کی ہے ؛ حالانکہ میرزا غالب محض اپنی خاص ضرورتوں سے مجبور ہوئے تھے ۔ ان کو اپنی پنشن اور خطاب کے متعلق گورنمنٹ انگریزی سے کچھ خط و کتابت کرنی تھی اور اس لیے دار السلطنت میں آنا ضرور تھا ، اور غالباً میرزا حیرت صاحب نے مولانا حالی کی " یادگار غالب " ملاحظہ نہیں فرمائی ورنہ ایسی غلطی نہیں ہوتی ۔

اس کے بعد تذکرۂ صادقہ کا تبصرہ ہے جو آگے چل کر نقل ہوگا ۔ تبصروں کے بعد " لسان الصدق کے متعلق بعض معزز ہمعصروں کی رائے " عنوان ذیل کے ساتھ درج ہے : ہم نے پہلی کسی اشاعت میں دو ریویو شائع کیے ہیں جو ہمارے بعض معزز ہمعصروں نے بیاضابطہ طور سے لسان الصدق پر کیے ہیں ۔ آج ہم چند دوسرے قدرداں ہمعصروں کی رائیں اس ناچیز پرچے کے متعلق درج ذیل کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں ۔ اول " دی پیپ " کا تبصرہ ہے ۔ اس میں مدیر کا نام " مولوی ابو الکلام محی الدین صاحب دہلوی " لکھا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہنامہ کی سالانہ قیمت عہ تھی ، اور اس کے ملنے کا پتا تارا چند دت اسٹریٹ نمبر ۱۶ کلکتہ تھا ۔ دوسرا تبصرہ ایڈورڈ گزٹ شاہجہاں پور (۱۹ جنوری ۱۹۰۴ء) کا ہے ۔ یہ اخبار لکھتا ہے : ہمارے لائق مہربان ابو الکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی نے لسان الصدق نام ایک ماہوار رسالہ کلکتہ سے جاری فرمایا ہے ۔ اس کے مقاصد نہایت عمدہ اور مفید ہیں ، اول اصلاح معاشرت ، دوسرا ترقی اردو ، تیسرا علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں ۔ چوتھا مقصد تنقید ہے ۔ اس تبصرے کا کچھ حصہ صفحہ ۲۲ میں تھا ، اور میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو اسی تبصرے یا کسی اور تبصرے سے جو اسی صفحے میں تھا یہ پتا چلتا ہے کہ اپریل ۱۹۰۴ء میں لسان الصدق کی اشاعت کو پانچ چھ مہینوں سے زیادہ نہیں گزرے تھے ۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شمارہ اپریل (تقطیع $9\frac{1}{2} \times 5\frac{1}{2}$) کے صفحات کی تعداد ۲۴ تھی اور یہ ہادی المطابع میں چھپا تھا ۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ صفحہ ۱۷ سے قبل کے صفحات میں حیات جاوید مصنفہ حالی کا ایک نامکمل تبصرہ بھی تھا ۔ تذکرۂ صادقہ کا تبصرہ مطابق اصل نقل ہوتا ہے ۔ الفاظ کے درمیان میں جو نقطے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک یا زیادہ لفظ ضائع ہو گئے ہیں =

الدر المنشور فی تراجم اہل صادقفور ۔ عظیم آباد پٹنہ میں صادقپور ایک قدیم محلہ ہے جس کی ایک زمانے میں عظیم آباد ..... شہرت تھی اور عظیم آباد کو لوگ صادقپور کے پتہ سے جانتے تھے ...... اسی صادقپور کی خاک پاک سے

پیدا ہوئے اور پھر پیوند خاک ہو گئے۔ جب سید احمد بریلوی سکھوں سے جہاد کرنے کی غرض سے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے اور ان کا کچھ عرصہ تک قیام پٹنہ میں بھی ہوا تو خاندان صادقپور کے تمام افراد نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی، اور جان و مال سے فدا ہونے کو طیار ہو گئے۔ تاریخ ہند کا وہ عجیب زمانہ جبکہ وہابیت کے مضمون نے جہاد اور بغاوت کی صورت سے گورنمنٹ کے دل میں جگہ پائی تھی، ایسا پر آفت زمانہ تھا کہ کسی شخص کو وہابی کہنا یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اب بیچارہ کا ارادہ حجر اسود کی سیر کرنے کا ہو چلا ہے۔ اسی زمانے میں گورنمنٹ ہند کو اس خاندان پر شبہ ہوا کیونکہ سید صاحب کے ہمراہیوں میں سب سے زیادہ پرجوش اور جان و مال فدا کرنے والے اکثر صادقپوری تھے۔ چند واقعات نے اس شبہ کو یقین تک پہنچایا اور شبہ کا اثر عمل تک پہنچا۔ پھر نہ پوچھو کہ اس خاندان کا کیا حال ہوا۔ جتنے بزرگ خاندان میں موجود تھے وہ تو قید ہو گئے عورتیں۔ بچے اپنی حالت پر چھوڑ دیے گئے۔ بیس بیس برس تک قید رہے، کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں، لیکن باوجود اس کے سچائی اور صبر کا رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہی گورنمنٹ جو اب سے پیشتر ان پر نامہربان تھی مہربان ہو گئی۔

الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور۔ کے اسی خاندان کے ایک یادگار جناب مولانا عبدالرحیم صاحب عظیم آبادی مصنف ہیں جس میں انھوں نے اول مقدمہ وہابیان بنگالہ کی کیفیت .... اور ان مصائب کا ذکر کیا ہے جو ان پر اور ان کے خاندان پر اس زمانہ میں گذرے۔ .... خاندانی بزرگوں کا جن میں سے بہت سے پیوند خاک ہو چکے ہیں اور کچھ موجود ہیں .... اس میں شک نہیں کہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترقی و تنزل افسوس ہے تو اس کا ہے کہ کتاب کی طرز عبارت اور طریق ترتیب بالکل قدیم طریقہ پر رکھی گئی ہے۔ اور اس لیے جدید اردو کے مزے لینے والے اسے دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ غالباً اس کے مصنف کی ایک عرصہ سے عزلت نشینی اور اس لٹریری انقلاب سے ناواقفیت اس کا باعث ہوئی ہے جو گزشتہ صدی کی اخیر چوتھائی میں واقع ہوا ہے۔ باوجود اس کے چونکہ اس موضوع پر اور کوئی کتاب نہیں ہے اس کی قدردانی کرنی ضروری ہے۔ جو حضرات اس کتاب کو خریدنا چاہیں عہ قیمت پر مصنف ممدوح سے پٹنہ ڈاکخانہ گلزار باغ محلہ میر شکار ٹولہ کے پتے سے منگوالیں۔ ایڈیٹر۔

قاضی عبدالودود

بعض قدیم تحریریں

(۱) ایک قدیم تحریر

ایک زمانے میں حکیم محمد علی خاں کے ناول بہت مقبول تھے اور ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو انھیں شرر پر ترجیح دیتے تھے، لیکن اب ان کی مقبولیت افسانۂ ماضی ہے، اور ان کے ناول بہت کم پڑھے جاتے ہیں۔ یہ بظاہر امروہی کے رہنے والے تھے، اور وہاں سے ایک ماہنامہ "مرقعِ عالم" نامی نکالتے تھے، جس کے ساتھ ان کا کم از کم ایک ناول باقساط (سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء) شائع ہوا۔ اس کے سال بعد کے مضامین الگ سے کتابی شکل میں بھی چھاپے جاتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۰۲ء (یہ ناقص الآخر) کے مضامین کے مجموعے اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں۔ پہلا مجموعہ ۶۰ صفحوں کا ہے اور اس میں ابوالنصر غلام یسین تخلص بہ آہ، یا ابوالکلام آزاد کی کوئی تحریر نہیں، دوسرا صفحہ ۴۶ پر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد کے اوراق غائب ہیں، اور ان کے مندرجات کا حال معلوم نہیں۔ پیشِ نظر اوراق میں آہ کی اور آزاد کی ایک تحریر ہے۔ اس تحریر میں موخرالذکر کے مضمون علوم جدیدہ اور اسلام کا ذکر ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ بظاہر ایک قسط بھی نہیں چھپی، اور "آیندہ نمبر ۳ و ۴" کے عنقریب بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ یہ مضمون پورا یا ادھورا مرقعِ عالم یا کسی اور رسالے میں شائع ہوا یا نہیں! ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء کے البنچ بانکی پور میں جو آزاد کے اشعار چھپے تھے، ان کے عنوان میں ان کے نام وغیرہ کے بعد یہ الفاظ البتہ ہیں: "مولف رسالہ الہیئت وعلوم الجدیدۃ والاسلام" حکیم محمد علیخاں کی تمام تصانیف پر ریویو" لکھنے کا بھی اس تحریر میں ذکر ہے اور یہ وعدہ بھی کہ اسے جلد بھیجوں گا۔ یہ وعدہ وفا ہوا یا نہیں اور یہ ریویو مرقعِ عالم میں یا کہیں اور شائع ہوا یا نہیں، اس کے بارے میں میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

آزاد کی جو تحریریں اس وقت تک میری نظر سے گزری ہیں، ان میں ان کا خط جو مرقع عالم میں چھپا تھا سب سے قدیم ہے۔

۱۱ جون ۱۹۰۷ء یوم الاربعہ ۔ باسمہ سبحانہ

جناب حکیم صاحب ، السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم

مجھے آپ کے مرقع عالم سے کس قدر شفقت ہے، اس کا آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ بمبئی میں مرقع عالم سنین ماضیہ کے پرچے جب میں نے طلب کئے تھے اور کارپرداز کی غفلت کے سبب سے فرمائش کی جلد تعمیل نہ ہوئی تھی، تو اس وقت میں نے متواتر رجسٹرڈ خطوط روانہ کیے تھے، یعنی طبیعت میں اس کا ایک شوق بڑھا ہوا تھا اور بدگمانی اس امر کا موقع ہی نہیں دیتی تھی کہ خط کے پہنچنے کو تسلیم کرکے عدم تعمیل فرمائش کو کسی اور وجہ پر محمول کرتا۔ اگرچہ رجسٹرڈ خطوں کا کسی چیز کی فرمائش کے لئے ارسال کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے مگر ایک ایسی حالت میں کہ ناقدردانی کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہو، اور لوگوں کو ایک کارڈ بھیجنا بھی بار گذرتا ہو، اس قدر شتیاق کا ہونا کہ فرمائش کے لیے پیڈ خطوں اور کارڈوں پر نہ بھروسا کرکے متواتر رجسٹرڈ خطوں کا ارسال کرنا ایک خصوصیت کا پہلو رکھتا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے میں بڑی حسرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی علالت کی وجہ سے مرقع عالم اپنی ایک خاص خصوصیت کو جو اور ہندوستانی میگزینوں میں اس کے لیے مابہ الامتیاز تھی، کھو بیٹھا ہے۔ اس لیے پبلک کو وہ توجہ جو پچھلے دنوں اس کی طرف مبذول تھی ایک حد تک جاتی رہی۔ وہ کیا؟ پنکچوالٹی یعنی پابندی وقت۔ پس اب اور ذرا آپ ادھر متوجہ ہوں اور ایک سال کا جو آپ کا قرض باقی ہے، اسے جلد جلد ادا کرکے آیندہ سے اس میں پابندی کا جادو پیدا کردیں۔

اس عریضے کے ہمراہ ایک مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ارسال خدمت کرتا ہوں، اسے مرقع میں شامل کیجیے۔ انشاء اللہ نمبر ۳ و ۴ بھی ارسال خدمت عالی کردوں گا۔

آپ جانتے ہیں اور یقیناً مجھ سے اچھا جانتے ہیں کہ محرکین تعلیم انگریزی کی انگریزی کی اشاعت سے کیا غرض تھی۔ اشاعت علوم نہ ہوئی مگر افسوس ہے کہ یہ غرض تو حاصل نہ ہوئی اور انگریزی ذریعۂ ملازمت سمجھی گئی۔ اب نہ کوئی سائنس سے غرض ہے اور نہ فلسفے سے، بس انٹرنس یا ایف اے تک انگریزی حاصل کی اور ۱۵ روپے پر ملازم ہوگئے۔ پس حالت موجودہ کے لحاظ سے اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علوم مغربی کا ترجمہ کیا جائے اور سینٹیفک سوسائٹی اور پنجاب یونیورسٹی کی پالیسی سے اتفاق کیا جائے

مولوی محمد عمر صاحب[1] نے واقعی یہ بہت اچھا کیا کہ مرقع عالم کو علوم مغربی کا مخزن بنا لیا۔ ملک اور قوم کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے مگر ساتھ ہی اگر آپ غور کریں گے تو اشاعت علوم مغربی سے ایک اور زہریلا مرض ہندوستان میں پھیل رہا ہے اور جب اس میں ترقی ہوگی تو اس میں بھی یقیناً ہوگی۔ پس اس لیے ضروری ہے کہ اس کا انسداد بھی قبل از وقت کر لیا جائے۔ آپ کہیں گے وہ کون سا مرض ہے؟ حضرت، وہ دہریت اور لامذہبیت کا مرض ہے جو مذہب کی پاک زندگی کا کام تمام کر دیا ہے (کذا) اور جس نے یورپ کو مذہب کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام کے تاد تفوں پر (کذا) سائنس کے خلاف سمجھ لیا ہے، اس لیے انھیں مذہب سے خلاف کرنا ضروری ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ جب مرقع عالم میں سائنس کے تراجم شائع ہو رہے ہیں تو ان کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیئے، یہ مضمون علوم جدیدہ اور اسلام آپ کے پرچے کے لئے بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ ناظرین کے لیے باعث دلچسپی ہوگا اور وہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھیں گے۔

مرقع عالم کے غالباً ہزار سے زیادہ خریدار ہوں گے۔ کیا ہزار میں سے نصف پانچ سو بھی ایسے نہ ہوں گے جنھیں اس کی توسیع اشاعت کا خیال ہو؟ میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ایک صاحب، جناب خریداروں میں سے ایک ماہ کے اندر پانچ خریداروں کو بہم پہنچانے کا ذمہ لے لے اگر وہ مہینے کے اندر بہم نہ پہنچا سکے تو دس روپے دے کر پانچ پرچے خرید لے، اس کا اسے اختیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس تجویز پر محبان علوم غور فرما کر عمل فرمائیں گے، کیونکہ جب تک ایسا خیال ساری قوم میں نہ ہوگا کبھی علمی ترقی نہیں ہو سکتی۔

میں نے تو آپ کی تمام تصانیف پر ایک ریویو بھی لکھا ہے، اسے بھی عنقریب ارسال کروں گا جس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مرقع عالم کیا چیز ہے اور ہم اس کی کیسی ناقدردانی کر رہے ہیں۔ زیادہ نیاز

از کلکتہ امرا تلہ لین {خادم احباب، ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

---

[1] محمد عمر صدیقی، سوز باونی کے متعدد مضامین دونوں مجموعوں میں ہیں۔ ازاں جملہ "برق و باراں"، "کل نفس ذائقۃ الموت" "آواز" ان کے مجموعۂ اشعار مسمّٰی بہ "فرمائش احباب" پر سنہ ۱۹۱۰ء میں تبصرہ بھی شائع ہوا تھا۔

(۴) حسن و شام سندر

جناب عبدالرزاق ملیح آبادی نے آزاد پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں صرف وہی باتیں درج کی ہیں جو خود آزاد سے سنی تھیں۔ ان کے بیان کے بموجب آزاد کو اس کا اعتراف تھا کہ اردو شاعری میں انھیں ظہیر احسن، شوق نیموی سے تلمذ تھا۔ "حسن و شام سندر" میں شوق نیموی کی جس مثنوی سے بحث ہے ممکن ہے اس کا ایک نام حسن و شام سندر' بھی ہو لیکن مشہور نام سوز و گداز ہے اور یہ شوق کے دوران حیات میں طبع بھی ہو چکی تھی۔ مضمون کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے :

"رقع عالم کے قدرداں ناظرینو، یہ وہ عاشق و معشوق گذرے ہیں جن کا پرسوز قصہ (عرب کے لیلی و مجنوں اور (فارس) کے شیریں و فرہاد کے افسانوں سے اگر زائد نہیں، تو کم بھی نہیں ہے۔ نل اور دمن کی تو کیا حقیقت ہے۔ ان کے سامنے بیسیوں عاشق و معشوق کے واقعات ہیچ ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ جیسے لیلی و مجنوں، شیریں و فرہاد کے قصوں نے عالمگیر شہرت پائی ہے سرزمین عظیم آباد کے اس دلسوز قصے نے ہندوستان کے ہر حصے میں رہنے والوں کو دلوں میں جگہ پیدا نہ کی۔ میں کہتا ہوں نہ کی اور ایسے بہت واقعات خوش نصیبی سے دستیاب ہو سکتے ہیں جو اس کے قدم بہ قدم ہیں، تو کیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان جانبازان عشق کی شورش در اصل شورش نہ تھی؟ یا ان کا عشق فی الحقیقت عشق نہ تھا، یا ان کی جانفروشیاں قدر کی نگاہ سے نہ دیکھی جائیں؟ عام اس سے کہ وہ غلط ہو یا صحیح، جو ماجرا دنیا والوں کی زبان سے صفحات پر اتر آیا گویا اس نے اپنی قدامت اور شہرت کی ایک مضبوط عمارت تعمیر کی، جس سے ہر زمانے والے واقفیت کا سبق لیتے رہے، مگر افسوس تو اسی کا ہے کہ اس قصے کو کسی مشہور شاعر نے کسی علمی زبان میں اب تک نظم نہیں کیا تھا، جس سے یہ شہرت کے پر لگا کر شہر شہر اور محلے محلے میں جا پہنچتا۔ یہ وہ قصہ ہے جس سے اور شہر تو اور خاص عظیم آباد والے بھی (فی الحال) پوری طرح پر آگاہی نہیں رکھتے۔ خدا بھلا کرے ہمارے فاضل مہربان، مولانا ظہیر احسن صاحب شوق محدث نیموی کا جنھوں نے بڑی عرق ریزی اور نہایت (کذا) سے اس قصے کو نظم کیا ہے یا یوں کہوں کہ اسے قدامت بخشی ہے ونعم ما قال:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

(۳) مولانا کے بھائی کی تحریر

ابو النصر غلام یسین تخلص بہ آہ ابو الکلام محی الدین احمد آزاد کے برادر بزرگ تھے ۔ مرقع عالم (ہردوئی) کے مضامین سنہ ۱۹۰۲ء کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوا تھا، اس کا جو ناقص الآخر نسخہ میرے پیش نظر ہے، اس میں آہ کی ہی تحریریں موجود ہیں۔ اس نسخے کا آخری مضمون "تربیت تعلیم اور صحبت" ہے، یہ ص۵۴ کے بائیں سے شروع ہو کر ص۶۲ تک چلا جاتا ہے، اس کے بعد کہاں تک گیا اس کی خبر نہیں، ورنہ یہ پتا ہے کہ اس کا لکھنے والا کون ہے، باقی ۴۵ صفحوں (باستثنائے سطور آخر) میں سے ۴۵ صفحات (چند سطریں کم) آہ کے لکھے ہوئے ہیں۔

"ہمدردی کی جیتی جاگتی مثال"

"طال شوقی علی محبتکم ایھا الغائبون عن نظری" میرے مکرم اور فاضل دوست، اردو انشا پردازی کے "ہمہ اوست"

مولانا حکیم، تسلیم بصد تعظیم ۔ مزاج اقدس ۔ گو کہ یہ لاگ ہمدردی دنیا کے طبقے سے مفقود سی نظر آتی ہے تاہم (میں سمجھتا ہوں کہ) اس سے کوئی ملک اور کوئی زمانہ خالی بھی نہیں، کیونکہ انسان کا یہ ایک فطرتی جذبہ ہے کہ وہ دوسرے کے حال میں ہمدردانہ حصہ لے کہ خیر الناس من ینفع الناس ... مجھے یاد ہے کہ قبلہ والد مجھے صغر سنی میں یہ دعا دیا کرتے تھے کہ "پیارے، خدا تجھے آدمی بنائے" اور ایک مرتبہ نہیں، بار بار اور ہمیشہ یہی جملے فرماتے ۔ مجھے باقتضائے کم فہمی و کم عمری کچھ یونہی سا ناگوار معلوم ہوتا کہ شاید میں تو ان کی نظر میں کوئی آدمی ہی نہ رہا جب تو یوں فرماتے ہیں کہ خدا اسے آدمی بنائے اور ہاتھ پاؤں دیکھ دیکھ کر، اور کبھی کبھی آئینے میں چہرہ دیکھ کر) دل ہی دل میں کہوں کہ کیا بھئی، میں آدمی نہیں ہوں، سچ مچ حیوان ہو گیا، حیوان! مگر اب جو غور سے کام لیتا ہوں تو خدا جانتا ہے عجیب عجیب نکتے اور طرح طرح کے فوائد اسی ایک جملے سے مترشح ہوتے ہیں جس کا بیان خالی از طوالت نہیں .. الحاصل اس تمہید سے میری غرض کچھ اور ہے، (خدا نکردہ) نہ مجھے اس امر کا دعویٰ ہے کہ میں آدمی ہوں یا انسان = اور نہ آدمیت کی دشوار راہ طے کر چکا ہوں، بلکہ (بموجب تعریف اہل منطق) حیوان ناطق خود کو سمجھ کر کبھی کبھی اپنے آپ کو خطاب کیا کرتا ہوں کہ بس تجھ میں اور حیوان سامت میں وجہ امتیاز نطق ہی ہے نا، ورنہ تو کسب اخلاق ذمیمہ میں ان سے کم ہے ... بہرکیف، میں انسانیت پسند اور آدمی دوست تو ہوں ۔ آپ جیسے اشخاص کی چاہت کو اپنے اشتیاق بھرے دل میں جگہ ضرور دیتا ہوں، یہ کیوں؟ اس لیے کہ

شنیدم کہ در روز امید و بیم   بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

مولانا! یوں تو میں پانچ سات برس سے آپ کے بے بہا اور لاجواب پرچے کا خریدار ہوں جب تک کسی کے دل اور دل کے درد کی صورت رہا یہاں اور پھر جب یہاں سے کسی دل رفتہ کے ہوش و حواس کی طرح مبتلی سدھارا تو وہاں بھی پرچہ جاری رکھا مگر ۔ ہمدردی جس چیز کو کہتے ہیں ذرا بھی برتی نہیں برتی گئی ۔ المختصر اس سال ۔۔ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو آپ کی ہمت کی طرح توسیع اشاعت مرقع عالم کا خیال بڑھایا جارہا ہے ۔ ۔۔ میں کیا اور میرا مقدور ہی کیا ، مگر پھر انشاء اللہ اس سال دس خریدار نذر دردوں گا جس کی بدیہی شہادت تو یہ ہے کہ یہ لیفہ دیکھتے ہی ۵ خریداروں کے نام دو روپے کا دیلو روانہ فرمائیے ۔

میں آپ کا شکریہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا آئے دن مفید نتیجہ خیز ناول اور پرزور قلم کے نکلے ہوئے مضمون پڑھے اور حقد ہوگا ان کے مؤید کے علاوہ اسی کے متعلق نمایاں کام بھی کرچکے ہیں اور ۔ نامہ نگار بھی ۔ حمایت پر تلے بیٹھے ہیں مگر کس وجہ سے ؟ ۔۔ ہر شخص کا فطرتی جذبہ یہی ہے کہ وہ دوسرے کے حال میں ہمدردانہ حصہ لے ۔۔۔

حماك الله عن شر النوائب جزاك الله فى الدارين خيرا

زیادہ نیاز ۔ کلکتہ امرتالین نمبر ۱۱ ۔ راقم خادم علمائے دین ابوالنصر غلام یسین کان اللہ لہٗ ۔

کانشنس یعنی ایمانی طاقت

"کونشنس انگریزی میں کسے کہتے ہیں ۔ آہ کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں ۔ اس مضمون میں پردے کی بحث بھی ہے جس کا محل نہیں اس کا لہجہ محض واعظانہ ہے ۔ صاحب مضمون کے اشعار ذیل صراحتہً ان کے نام سے درج ہیں ۔

ہم نہ کہتے کہ یوں نہ چمکے دو تم اگر بات کے دھنی رہتے

زشت رو کو حسیں سے کیا نسبت آسماں کو زمیں سے کیا نسبت

ہمنفس ہمنفس کے داغہائے جگر دیکھتے بھی ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ شوق چمن نہیں

اشعار صراحتہً آہ کے نام سے ہیں ، بعض سے متعلق صراحتہً یہ مرقوم نہیں کہ کس کے ہیں ، مگر امکان ہے کہ آہ ہی کے ہوں ، مثلاً :

اہل ایمان ہوئے صاحب تیغ ہوئے اک یہی چیز ہے جس چیز سے ہم چیز ہوئے

مضمون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

مسلمانو! اے چودھویں صدی کے بُرا بھلا کہنے والو ، تم کو تمھاری غفلت کی قسم سچ کہنا تم نے کبھی یہ لفظ بھی

سلہ ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ ۱۱ خریدار دے چکے ہیں اور تحریر کرتے ہیں کہ جب تک سو خریدار پیدا نہ کرلوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا ۔

سنا ہے، اور سنا ہے تو کبھی اس پر غور کرنے کا موقع بھی ہاتھ لگا ہے؟ کیا اس لفظ سے تمہارے کان اب تک محروم ہیں؟ نہیں، محروم تو نہیں!! تو کیا اس لفظ نے تمہاری روحی قوتوں پر اتنا ہی اثر ڈالا ہے جتنا لارڈ سکلیس فیلڈ کی پہلی اسپیچ نے ہوس آف کامنز کے معزز حاضرین پر اثر ڈالا تھا؟ کیا تمھیں اس کے خوشگوار ذائقہ سے حظ اٹھانے کا موقع نہیں ملا؟ کیوں نہیں ملا!! پھر اس بے التفاتی کا سبب، بے پروائی کی حد، تغافل کی انتہا! آخر بات کیا ہے؟ بقول حضرت غالب:

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

کیا تم پیچ توجہ کی تکلیفوں کے معتاد نہیں رہے؟ کیا تم توجہ کی دولت سے آگاہی نہیں رکھتے ہو؟"

"مسلمانو! ہمت اور استقلال کانشنس کے دو پَر ہیں، (جن کی بدولت تم میں نہیں اور جن کے نام سے تم کو نفرت اور وہ بھی کیسی؟ سخت۔ میں بلیٹ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہی حال رہا تو تم اچھی حالت کی دل خوش کن صورت کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یاد رکھو)" "کانشنس ہائے کانشنس (فرمائش سوم) بس یہی ایک ایسی چیز ہے جس نے ہمیں چیز ہونے کا شرف دیا۔ خدا کی قسم عجیب نعمت غیر مترقبہ ہے"

"امام فیروزی رحمت اللہ علیہ (جب کسی خاص وجہ سے تارک بغداد ہوئے) تو ایک جم غفیر ان کی مشایعت کے لئے تیار ہو گیا۔۔ آپ نے ہر چند منع فرمایا مگر کسی نے بھی ممانعت کا لحاظ نہ کیا۔ الحاصل سامرہ پہنچ کر ہمراہیوں کا شمار کیا گیا تو ۵۰ ہزار سے زائد ہی ہوئے۔۔ کانشنس والے ایسے ہوتے ہیں" "مسلمانو! میں کانشنس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہ ہندوستان جیسی شہر کی چیز یا روپے کے اسباب ہمارے حضور عالم کے اشرف زمانے میں موجود ہوتے تو آپ ضرور باہر سے باہر نکلنے کی ممانعت فرماتے اور اجازت صرف بیت اللہ کے طواف کی دیتے کہ شب کو (چونکہ مجبوری ہے) سواری میں چڑھ کر آئیں اور طواف سے فرصت پاتے ہی گھر کی راہ لیں۔ مگر افسوس

انہا تذکرہ

ضیا احمد بدایونی

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ ہماری زبان و ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح سنگ میل نشان منزل کی جانب رہنمائی کرتا ہے یہ حیرت انگیز کتاب بھی ہمیں بتاتی ہے کہ ہماری زبان و ادب نے ترقی کی کتنی راہیں طے کر لیں اور منزل تک پہونچنے میں کس قدر مراحل سے گزرنا باقی ہے۔ یہ کتاب کیونکر منصۂ شہود پر آئی۔ اس کتاب کی داستان یہ ہے کہ مولانا کے ایک مداح و معتقد مرزا فضل الدین احمد نے مولانا کی مجتہدانہ ادبی کاوشوں اور سرفروشانہ سیاسی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر ۱۹۱۹ء میں ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے سوانح حیات قلم بند کر دیں جس کو انھوں نے بڑی ردّ و قدح کے بعد منظور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا رانچی میں نظر بند تھے۔ جہاں سے وہ اپنے خاندانی حالات بالاقساط روزانہ کرتے رہتے تھے۔ جب یہ حصہ مکمل ہو گیا تو مولانا سے ذاتی حالات لکھنے کا تقاضا کیا گیا۔ ادھر سے اصرار۔ اُدھر سے انکار۔ بالآخر جب بہت زور پڑا تو انھوں نے ۴۰ صفحوں کی ایک فصل لکھ کر بھیج دی اور فرمایا کہ اس سے زیادہ میں اپنا حال نہیں لکھ سکتا۔ یہ پہلا حصہ تھا۔ دوسرے حصے میں مولانا کے خاندان کے بقیہ حالات اور مولانا کے سوانح (مرتبۂ مرزا صاحب) آنے والے تھے مگر پھر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ غرض کتاب مذکور کی تالیف و ترتیب بڑی بے سروسامانی اور بے اطمینانی کے عالم میں ہوئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کتاب ایک طرف علمی نکات۔ مذہبی اشارات۔ تاریخی بصائر۔ اخلاقی حِکَم کا گنجینہ ہے اور دوسری طرف بداعت اسلوب اور لطافت بیان کا خزینہ۔

کہا جاتا ہے کہ تذکرہ مولانا کے خاندان کا اور غبار خاطر ان کی ذات کا آئینہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو خود تذکرہ کے ایک ایک لفظ سے ان کی ذات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ آخری فصل میں تو وہ اپنے بارے میں

کچھ نہ کہنے پر بھی سب کچھ کہہ گئے ہیں اور چھپنے کی انتہائی کوشش کے باوجود نمایاں ہو گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نفسیاتی اور ادبی نقطۂ نظر سے تذکرہ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ مصنف کی عالمانہ جامعیت و فضیلت اور ان کے مذہبی عقائد و میلانات کو سمجھنے کے لئے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ مولانا ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو علم و فضیلت۔ ارشاد و مشیخت کا گہوارہ تھا۔ جو ملاذ انام اور مرجع خاص و عام تھا۔ اور جہاں لوگ ارادت کے قدموں سے آتے اور عقیدت کی آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی تربیت میں سخت نگرانی اور کم آمیزی کی تاکید شامل حال رہی۔ مولانا کی فطری افتادِ طبع درست لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اوپر کے عوامل نے بھی ان کی سیرت کے بنانے میں خاص حصہ لیا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کی انانیت مستحکم اور ان کی انفرادیت پختہ ہوتی گئی۔ وہ انجمن میں رہتے ہوئے بھی خلوت کے خوگر، اور انسانی دنیا میں بستے ہوئے بھی اپنے خیالات کی دنیا میں مستغرق رہتے تھے اکثر بڑے آدمیوں کی طرح ان کی ذات میں ہمیں تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف وہ ایک ماہر سیاست ہی نہیں سیاست کے میدان کے مردِ مجاہد تھے جس کو ہر وقت عوام سے رابطہ رکھنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف وہ ایک زبردست عالم و ادیب تھے جو اپنے افکار کی خلوت سے باہر کم نکلتے تھے۔ ایک جانب ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا اور دوسری جانب طبعی میلان کے تقاضوں کی رعایت کرنا دراصل چوکھٹے میں گول چیز سے کم نہ تھا۔ اسی بنا پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ سیاسی جد و جہد کے لئے زیادہ موزوں تھے یا علمی مشاغل کے واسطے۔

مولانا کو اپنی اس انفرادیت کا خود بھی احساس بلکہ یک گونہ فخر تھا۔ تذکرہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا۔ اور شیوۂ تقلید و روش عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لئے اپنا نقش قدم رہنا چھوڑا۔ رندی و ہوسناکی کا عالم رہا تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے۔ لمحوں کے اندر برسوں کے کام انجام پائے۔

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اب جس حال و رنگ میں ہیں تو یہاں بھی کمال ہی کی آرزو ہے۔"

یہی وصف تھا جس کو نا واقف، کبر و نخوت سے تعبیر کرتے تھے ۔ ورنہ واقفان حال کا بیان ہے کہ وہ اپنے
لوگوں ہی اونچا سمجھتے ہوں دوسروں کو نیچا سمجھنا اور حقیر جاننا ان کا شیوہ نہ تھا ۔
ذاتی فخر سے قطع نظر ۔ مولانا کے یہاں اضافی فخر کی جھلک بھی ملتی ہے ۔ اگرچہ ان کا عقیدہ ہے کہ "ارباب
...نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا
" اسی سلسلے میں انھوں نے نپولین کا ایک قول نقل کیا ہے ۔ جب فتح پروشیا کے بعد فریڈرک اعظم کی تلوار
کو پیش کی گئی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے" تاہم وہ صاف لکھتے
ہیں "پس بلاشبہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں کہ مجھ کو ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں
یوں سے سلسلۂ علم و ارشاد قائم و جاری ہے" الیٰ آخرہ ۔
عرفی کو بھی ایک ایسا ہی مقام پیش آیا ہے ۔ لکھتا ہے

هرچند که در کشمکش جاه و مناصب — گمنام شوند همه دوده هم را
در نقش و نگار در و دیوار شکسته — آثار پدید است صنا دید عجم را
تاگوهر آدم نسبم باز نه استند — زآبائے خود ار بشمرم اصحاب کرم را

فوراً اس کو تنبہ ہوتا ہے اور پکار اٹھتا ہے ۔

تا نه بود وصف اضافی هنر ذات — ایں فتوی همت بود ارباب همم را
المنة لله که نیازم بسبب نیست — اینک بشهادت طلبم لوح و قلم را

تذکرہ کی ندرت اسلوب اور بداعت انداز پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مذکور کے
یہ سے مولانا کے مذہبی افکار و میلانات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے
کتاب و سنت سے ان کے شغف کا منبر آتا ہے ۔ ایک عالم دین اور مفکر اسلام کی حیثیت سے انھوں نے
مسلمانوں کے عام انحطاط کو محسوس کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ قرآن مجید اور سنت نبوی کے بغیر ان کی اصلاح ممکن
ہیں ۔ لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا ما اصلح اولھا (اس امت کے پچھلے لوگوں کی اصلاح اسی ذریعے سے
ہوں جس سے اگلوں کی ہوئی) اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسی نسخۂ کیمیا نے مس کو کندن اور ناقص کو کامل بنا دیا
اسی کی بدولت عرب نہ صرف سیاست میں بلکہ علم و تہذیب میں دنیا پر چھا گئے ۔ مولانا لکھتے ہیں :
" البتہ اصل مرکز حق و یقین کتاب و سنت ہے ۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا سب کو

اس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا۔ اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی"۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا قول یا فعل اس معیار کے خلاف نظر آتا ہے تو لوگ فرطِ اعتقاد سے اُس قول یا فعل کی تائید اور نص کتاب و سنت کی تاویل پر اتر آتے ہیں لیکن بقول مولانا "یہی بنیادِ تحریف ہے"؛ ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ارشادِ الٰہی یا فرمانِ نبوی کو علیٰ حالہٖ قائم رکھیں اور (اگر ممکن ہو تو) اس بزرگ کے قول یا عمل کی تاویل کریں۔ جیسا کہ حافظ ذہبی نے کہا ہے "کل امام یوخذ من قولہ ویترک الا امام المتقین صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہر امام کے قول میں اخذ و ترک سے کام لیا جائے گا بجز امام المتقین رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

امام مالک نے اس سے واضح تر انداز میں ارشاد فرمایا۔ کہ رسول مقبول کے سوا کسی (امام) کا ارشاد نکتہ چینی و تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔

افراط و غلو ۔ بزرگوں کے مسلک کو تنقید سے بالاتر سمجھنا سب سے شدید افراط اور غلو فی الدین میں داخل ہے اس کے بارے میں مولانا کا ریمارک ملاحظہ ہو۔

> "اور یہ افراط و غلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال و احوال کو بمنزلہ اصل مرکز بنا لیتے ہیں جس کو کسی حال میں اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا۔ اور پھر چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی و صاحب وحی کی نص کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ مرکز تک لے جائیں۔ اور نہ جا سکے تو زبردستی کھینچ کرلے جائیں۔ اس پر ستم یہ کہ اس طریق کو طریق توفیق و تطبیق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ تطبیق ہے تو واللذی نفسی بیدہٖ کہ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا اور نہ کبھی اہل کتاب نے اس دنیا میں تحریف کی"۔

مولانا اپنے عہد کے ایک عظیم ترجمان القرآن اور عالم باسفتہ تھے۔ اور اگرچہ ان کی جلوۂ صد رنگ رکھنے والی طبیعت فلسفہ۔ تاریخ۔ سیاست۔ ادب ہر ایک میں کامل بصیرت رکھتی تھی۔ مگر ان کا خاص میدان قرآن و حدیث ہی تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو زندگی کے ہر نشیب و فراز میں قرآن مجید ہی سے رہنمائی ڈھونڈھنے اور اسی سے استدلال کرنے کا انداز انھیں سے لوگوں نے سیکھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ پوری سیرت نبیؐ قرآن[1] ہی کی مدد سے

[1] اس انداز کی ایک سیرت حال میں ہمارے محترم مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے نکلی ہے۔

مرتب کی جائے۔ اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے مگر دوسرے مشاغل نے تکمیل کی فرصت نہ دی۔ بایں ہمہ وہ تفسیر قرآن میں اپنی ایک خاص راہ رکھتے تھے جس کی مثال کے لئے تذکرہ کے صفحہ ۱۳۵ و ۱۴۵ پر علیکہ الفساد او یتطعون ایاہا جن کی تشریح ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ حدیث نبوی سے بھی ان کی وابستگی کچھ کم نہ تھی۔ کہ حدیث دراصل قرآن کی صحیح تفسیر اور رسول مقبول قرآن کے مخاطب اول ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا ارموھم بالسنۃ یعنی ارباب بدع دہوا پر سنت کے تیر چلاؤ۔ اس کی روک کے لئے ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں۔ اور اسی لئے اہل بدعت کی ایک پہچان یہ ہوئی کہ ہمیشہ قرآن کے نام کی آڑ پکڑیں گے اور سنت و ماثور سے اعراض کریں گے۔"

دوسری جگہ اصحاب حدیث کی مدح میں یوں رقم طراز ہیں۔

"غرض کہ موجودہ عہد کی مادیت اور معقولات کے مقابلہ میں بھی صرف اصحاب حدیثؓ سنت و حاملین علوم خالصہ و ماثورہ سلف ہی کی جماعت و طائفہ منصورہ ہے جس کے لئے کسی طرح کا بیم و ہراس نہیں۔"

ایک مقام پر اپنے خاندان کی تعریف میں کہتے ہیں۔

"الحمد للہ کہ علم حدیث و سنت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے اور "بزرگ محدثین" ذوق سنت اور با اہل دنیا کارے نداشتن کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینان فقر و نامرادی کے حصے میں آئی ہے۔"

سنت رسولؐ سے جب مولانا کی وابستگی کا یہ عالم ہے تو ظاہر ہے کہ رسولؐ کی ذات اقدس سے ان کی عقیدت کیشی اور نیازمندی کس درجے پر پہونچی ہوگی۔ دیکھنا وہ کس جوش و خلوص سے بارگاہِ رسالت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں سب کے لئے تغیر و تبدل ہوا۔ حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں لیکن اللہ اکبر مقام محمدیؐ کی محفوظیت و مصونیت کہ اس کی سیرت طیبہ اور حیات حیہ و قائمہ کی لوح محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا۔ اور قرآن محفوظ و کتاب مسطور فی رق منشور و فی صدور الذین اوتوا العلم میں اس کا ایک ایک

۱؎ مراد فتنۂ انکار حدیث۔ ۲؎ حدیث

حرف ایک ایک لفظ اسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جس طرح قلم ازل نے دل صبح تعیّن کی کرنوں سے لکھ دیا تھا۔ پس قرآن کے بعد اگر کوئی اور ہستی لوح محفوظ ہو سکتی ہے تو وہ صرف وہی روح اعظم و خالد ہے جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوش حفظ و حیات میں ہمیشہ کے لئے لے لیا ہے۔"

نعت رسالت کا یہ پیرایہ اور جذبات عقیدت کا یہ مظاہرہ اردو ادب میں آپ اپنی مثال ہے۔ اہل بیت طہارت کی محبت میں بھی ان کے جذبات کی وارفتگی کا یہی عالم ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جن ارباب نظر نے ائمہ اہل بیت کرام علی الخصوص حضرت امام باقر و امام جعفر الصادق علیہما و علیٰ آبائہما و اجدادہما الصلوٰۃ والسلام کی احادیث مفصلہ حکمیہ بمقابلہ متکلمین ملاحدہ و زنادقہ مطالعہ کی ہیں۔ جن کا گھر وحی و نبوت کا گھر اور جن کا دروازہ باب مدینۂ علم اور جن کے اطفال و احداث تک علم نبوت و فیضان عترت رسالت کی گودوں میں پرورش پانے والے تھے وہ بھلا آج کل کے غلغلۂ الحاد کو کب خاطر میں لا سکتے ہیں۔"

مولانا کی زندگی کا اصلی مشن دعوت و تبلیغ حق تھا۔ اور یہی حقیقت تھی جو کبھی امر بالمعروف کی تاکید، کبھی علمائے حق کی حمایت اور کبھی علمائے سوء کی مذمت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہی تجلی تھی جس کی کوند ان کی تحریر میں نظر آتی تھی اور یہی نعرہ تھا جس کی گونج ان کی تقریر میں سنائی دیتی تھی۔ جہاں کہیں تذکرہ میں دعوت حق دینے والوں کا ذکر آجاتا ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پوری روح کھنچ کر الفاظ میں آگئی ہے۔ شاید انھوں نے اپنے لئے بھی دعوت ہی کو مقصد حیات قرار دیا تھا۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ سیاست کی بوجھل زنجیروں نے ان کی آزادی میں خلل ڈال دیا[1]۔ ان کو شکایت ہے کہ مسلمان خصوصاً علما جن کا طرۂ امتیاز امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا اپنے فرض کو یکسر چھوڑ بیٹھے۔ "علمائے وقت نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو عملاً شریعت کے احکام و واجبات سے خارج کر دیا ہے۔ اور یا تو اب یہ لفظ قرآن کی سورتوں میں کبھی نظر آجاتا ہے یا صحائف سنت کے ابواب و اوراق میں۔ حق کی بےکسی و مظلومی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ جنگل میں بھیڑوں اور بکریوں کے لئے چرواہا نظر آجاتا ہے لیکن حق کے لئے کوئی غم گسار و مددگار نہیں۔"

---

[1] ممکن ہے کہ بعض نکتہ چین اس کو بھی ان کی زندگی کے تضاد سے تعبیر کریں۔ مگر اس پر روشنی ڈالنا ان کے سوانح نگار کا فرض ہے۔ ہمیں یہاں ابوالکلام سے زیادہ کلام پر اظہار خیال کرنا ہے۔ اگرچہ ہمیں اعتراف ہے کہ کلام سے متکلم کو جدا کرنا ناخن سے گوشت کا الگ کرنا ہے۔

جن اکابر امت و مقتدایانِ ملت نے سلاطینِ جور و امرائے سوء کے مقابلے میں کلمۂ حق کہ افضل الجہاد ہے کہہ کر مردانہ وار خطرات کو انگیز کیا "تذکرہ" ان کی عزیمت دعوت اور تجدیدِ ملت کا آئینہ ہے۔ سیدنا امام حسین بن علی آبائہ وعلیہ السلام۔ حضرت سعید بن مسیّب۔ امام مالک۔ امام احمد بن حنبل جیسے مقدس نفوس کے کارنامے خود تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں ثبت ہیں۔ ان کے برخلاف وہ علمائے سوء و فقہائے دجل جنہوں نے دین بیچ کر دنیا خریدی ان کا حال سننا ہو تو مولانا کی زبانِ قلم سے سنئے۔

"سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے۔ لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے۔ لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ یہ ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں گر رہی ہو وہاں پہونچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایۂ ناز علمِ حق نہیں ہے۔ جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سُبُل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علمِ جدل و خلاف ہے"۔

اسی وجہ سے انھوں نے بعض فقہا کے حیلۂ شرعی تلاش کرنے کو سخت شناعت قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ دراصل یہودیوں کی ملعون عادت تھی کہ شرع کے احکامِ قطعی سے بچنے کے لئے بہانے سوچا کرتے تھے۔ افسوس کہ علمائے اسلام میں سے بعض کا دامن بھی اس سے داغدار نظر آتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں۔

"حضرت علی علیہ السلام سے ایک شخص نے غالباً مسئلۂ یمین (قسم) کی نسبت پوچھا تھا کہ ما الحیلہ (کیا حیلہ اختیار کیا جائے)۔ آپ نے فرمایا ترک الحیلہ (حیلے کا ترک کرنا ہی اس کا علاج ہے)"

عہد اکبری کے مخدوم الملک کا حیلہ مشہور ہے کہ وہ بقول ملا عبدالقادر بدایونی اپنا تمام مال سال کے آخر میں اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتے تھے تاکہ زکوٰۃ سے بچیں اور اسی طرح بیوی سال پورا ہونے سے پہلے شوہر کو ہبہ کر دیتی تھیں۔ ومایخدعون الا انفسھم ومایشعرون (یہ لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں مگر اتنی بات نہیں سمجھتے)۔

تذکرہ کے اسلوب کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید اس کو خطیبانہ کہنا

مناسب ہو۔ کیونکہ اگرچہ وہ عالمانہ بھی ہے۔ ادیبانہ بھی۔ اور شاعرانہ بھی۔ تاہم اس سے خطابت کی شان زیادہ نمایاں ہے۔ مولانا اپنے عہد کے نامور خطیب اور مقرر تھے۔ اور یہی رنگ ان کی تحریر میں بھی جلوہ گر ہے۔ ان کے زور خطابت کا نمونہ دیکھنا ہو تو ذیل کے اقتباسات پڑھئے۔ عزیمت و رخصت کا فرق دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس طرح ہر قسم و جماعت میں حسب حال و استعداد فرق مراتب و مدارج ہوتا ہے اُسی طرح سابقون بالخیرات کے بھی مختلف مراتب و مقامات ہیں۔ اور کتاب و سنت نے ان کے حالات و علائم بتائے ہیں۔ از انجملہ سب سے اعلیٰ و اشرف طبقہ ان اخص الخواص نفوس مزکّی کا ہے جن کو قائد توفیق الٰہی و سائق فیضان ربانی عزائم امور کے لئے چن لیتا ہے کہ وان ذالک لمن عزم الامور۔ .... اس کے لئے نہ تو مجرد علم و تدریس کتب کام آتی ہے نہ رسوم و ہیئت زہد و انقطاع۔ نہ مدارس و معابد دینیہ کے غلغلہ و ہنگامہ فضیلت کو اس میں دخل ہے اور نہ صومعہ و خانقاہ کے گوشۂ انزوا کو۔ ان کے عہد میں علما و اصحاب مشیخت کی کمی نہیں ہوتی اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مدرسے اجڑ جاتے ہوں اور خانقاہیں منہدم ہو جاتی ہوں۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت و شہرت کے لحاظ سے ان کا زمانہ علما و مشائخ امت کا سب سے بڑا مجمع و وادی ہوتا ہے، اور آبادیوں کی آبادیاں اصحاب علم و پیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں۔ تاہم مقام عزیمت دعوت و قیام ہدایت کی ان میں سے کسی کو بھی توفیق نہیں ملتی۔ کوئی دامن رخصت میں پناہ لیتا ہے۔ کوئی گوشۂ انزوا و انقطاع میں صرف اپنی عافیت و حفاظت ڈھونڈھتا ہے۔ کوئی راہ میں فتنہ و فساد کا شور سن کر صرف اسی کو کافی سمجھ لیتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کر لے .... گویا ایمان کا جو سب سے ادنیٰ اور نچلا درجہ عامۂ ناس اور ضعفائے عمل کے لئے تھا وہی خواص امت اور ہداۃ و مرشدین ملت کے لئے بلندی و عروج کا سب سے اونچا مقام ہو جاتا ہے اور سب سے بڑا متقی انسان وہ سمجھا جاتا ہے جس کے قدم جہاد بالقلب کی بائیں بساط سے پیچھے نہ ہٹیں لیکن کوئی نہیں ہوتا جس کا عزم ایمانی توقف و سکون کی جگہ طالب اقدام و سبقت ہو۔ جو اپنے نفس کی نجات کی جگہ جماعت و امت بلکہ نوع و ارض کی نجات کا عشق رکھتا ہو۔ جس کا حوصلۂ کار اور عزم راہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ ہو جائے کہ خود نہیں ڈوبا۔ کیونکہ یہ تو ضعف و بیچارگی کا سب سے

آخری درجہ ہے۔ فضیلت وکرامت اس میں کیا ہوئی؟ بلکہ ہر وجود کا ڈوبنا اس کے لئے ماتم اور ہر قدم کی ٹھوکر اس کے لئے موت ہو ...."

اقتباس کو تاہ کرنے پر بھی کافی طویل ہو گیا۔ لیکن اس سے ایک حد تک ان کی خطابت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ آگے لکھتے ہیں۔

"اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سنت الٰہی اپنی عادت جاریہ کے مطابق قیام حق و دفع باطل کے لئے سرگرم انبعاث و ظہور ہوتی ہے اور توفیق الٰہی اپنے کسی اصلح و امثل بندے کے قلب کا عزیمت دعوت کے لئے انشراح کر دیتی ہے۔ اور اس کے قدم طریق کو منہاج نبوت پر ثابت و مستقیم فرما دیتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام اصحاب علم و فضیلت اور ارباب صوامع و مدارس کو تنگنائے رخصت و ضعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے۔ فضائے علو و رفعت اس کو اپنی طرف کھینچتی اور سمائے کمال وکرامت اپنی ساری بلندیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے دوڑتا ہے۔ گویا آسمان اس کے لئے اتر آتا ہے اور زمین اس کو خود بخود اچھالنے لگتی ہے۔"

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

"ستاروں سے تمام فضائے آسمانی بھری پڑی ہے۔ لیکن دُمدار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے۔ یہی حال اصحاب عزائم کا بھی ہے۔ وہ کائنات ہستی کا ایک بالکل الگ گوشہ ہے اور وہاں کے احکام و قوانین کو دنیا کے اعمال عادیہ پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ ان کی قوتیں الٰہی، ان کے وسائل غیر مختتم (غیر متناہی؟) ان کی ترقیاں لازوال اور ان کے تمام طریقے غیر مختتم ہوتے ہیں۔ اللہ کی حکمت و ربوبیت ان کو تمام خلق اللہ میں سے چن لیتی اور بحکم واللہ یختص برحمتہ من یشاء اپنی رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب و خوارق ان کے لئے مخصوص کر دیتی ہے پھر ان کے معاملات میں نہ تو کسی دوسرے کا ساجھا ہوتا ہے نہ کسی مدعی کی وہاں تک رسائی۔"

خطابت میں اکثر تکرار اور طول کلام سے کام لینا پڑتا ہے۔ تذکرہ میں بھی تکرار اور طول بہت ہے۔ مثالوں سے تمام کتاب بھری پڑی ہے۔ ایک آدھ اور سہی۔

ایک پوری فصل میں عزیمت و رخصت کا فرق دکھانے کے بعد دوسری فصل میں مولانا پھر وہی بحث چھیڑ دیتے ہیں

"یہ جو تم ہر عہد ظہور اصلاح و دعوت میں دیکھتے ہو کہ ایک طرف تو ہزاروں علمائے ملت اور ارباب زہد و طاعت موجود ہوتے ہیں۔ درس و تعلیم علوم۔ ہنگامہ مجالس و مواعظ، غلغلہ اذکار و اشغال صوامع و زوایا۔ اور زمزمۂ ولطنین تسبیح و تہلیل مساجد و معابد میں بظاہر کسی طرح کی کمی نظر نہیں آتی۔ خانقاہوں میں مجاہدات و ریاضات کے حلقے قائم اور صحن مساجد میں تلاوت قرآن و وظائف و اوراد کی صدائیں سرگرم ہوتی ہیں اور انا الحمام فا نہا تحیا منهم کا پورا پورا عالم نظر آتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی دوسری طرف۔ وادی لنساء الحی غیر لنسا نہا کا یہ حال ہوتا ہے کہ ظلم و طغیان کا طوفان ہر چہار جانب سے محیط، شر و فساد کا ایک عالم رستخیز برپا، ظلمت بطلان و دعوت ہر طرف چھائی ہوئی۔ نور حق و صداقت مستور و محجوب۔ بدعات و محدثات کی گرم بازاری۔ منکرات و سئیات کی مقبولیت و طلب کا دور دورہ۔ اہل حق و صدق مظلوم و مقہور۔۔۔۔۔"

غرض یہ بات دو صفحوں میں آتی اس کو کئی فصلوں میں پھیلاتے چلے گئے ہیں۔

اس اسلوب کا دوسرا نمایاں وصف عربیت کی افراط ہے۔ موقع موقع سے آیات کریمہ اور احادیث نبویہ کے حوالوں کے علاوہ عربی اقتباسات و عبارات اس کثرت سے ہیں کہ کم و بیش ایک ثلث کتاب انھیں پر محتوی ہے۔ شریعت میں حیلہ جوئی کی مذمت کرنے کے بعد فرماتے ہیں فانّ لله یومًا تنفد فیه الجبال وتترادف فیه الاهوال ونشهد فیه الجوارح والاوصال۔ ویبتلی فیه السرائر و تظهر فیه الضمائر ویصیر الباطن فیه ظاهرًا والسرّ مکشوفا والمجهول معروفا"۔۔۔۔۔۔۔ الی اٰخرہ

دوسری جگہ امت کے زوال و انحطاط کا ماتم کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ فوالله انهم اتبعوا سنن من کان قبلهم وسلکوا سبیلهم حذو القذة بالقذة والنعل بالنعل۔ وغلب الشرك علی اکثر النفوس فصار المعروف منکرًا والمنکر معروفًا والسنة بدعة والبدعة سنة وطمست الاعلام واشتدت غربة الاسلام وقل العلماء وغلب السفهاء۔۔۔۔۔۔" جس کو پڑھ کر تذکرۂ نادرہ کا اسلوب آنکھوں میں پھر جاتا ہے عربی و فارسی اشعار کا صرف ان کے یہاں بکثرت لیکن برمحل ہے۔ اور اس وصف میں شاید کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ ان کو عربی و فارسی ادب کے ذخیرہ پر ماہرانہ عبور ہے۔ اور ان کا ذوق سلیم جب اور جہاں

چاہتا ہے حسب ضرورت شواہد پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس خوبی سے کہ شاید اس سے بہتر مصرعِ مصنف کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگا۔ چند مثالیں حاضر ہیں۔

اربابِ صدق وصفا قیدِ وطن سے آزاد ہیں

لا تقل دارها بشرقی نجد کل نجد للعامریة دار

(یہ نہ کہو کہ محبوبہ کا گھر نجد کے مشرق میں ہے۔ بلکہ تمام نجد اس کا گھر ہے)

اصحابِ احوال اگر احکام ظاہر کے پابند نہ ہوں تو معذور ہیں۔

سقونی وقالوا لا تغن ولو سقوا جبال سراة ما سقیت لغنت

(ساقی نے مجھے شراب پلائی اور کہہ دیا کہ راگ نہ الاپنا۔ حالانکہ جو چیز مجھے پلائی گئی ہے وہ اگر کوہ سراۃ کو پلائی جاتی تو وہ بھی گانے لگتا)

علمائے دنیا اور علمائے ربانی میں زمین آسمان کا فرق ہے

نزلوا بمکة فی قبائل هاشم ونزلت بالبیداء ابعد منزل

(اور دوست مکہ میں قبائل ہاشم کے درمیان اترے اور میں کوسوں دور جنگل میں اترا)

خاصانِ خدا کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے

وحدثتنی یا سعد عنها فزدتنی جنونا فزدنی من حدیثك یا سعد

(اے سعد تو نے معشوق کا ذکر کر کے میری دیوانگی بڑھا دی۔ یہی ذکر چھیڑے جا)

ہم کتنے ہی مدعیٔ کمال کیوں نہ ہوں بغیر محبت واتباعِ خدا و رسول سب بے سود ہے۔

وکل یدعی وصلاً بلیلی ولیلی لا تقر لهم بذاکا

(ہر شخص لیلیٰ سے ملنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ لیلیٰ کو کسی کا دعویٰ تسلیم نہیں)

دنیا حق کے مددگاروں سے خالی ہوگئی ہے

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا انیس ولم یسمر بمکة سامر

(ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوہ حجون سے کوہ صفا تک کوئی رفیق تھا ہی نہیں اور نہ مکہ میں کسی افسانہ خواں نے کوئی افسانہ سنایا)

عشقِ صادق پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔

فمن شاء فلینظر الیّ فمنظری نذیر الی من ظن ان الھویٰ سھل

(جو چاہے مجھے دیکھ لے کیونکہ میری حالت ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جو عشق کو آسان سمجھتے ہیں)

گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز

ویکرہ ان یشرب من فضۃ ویسرق الفضۃ ان نا لھا

(وہ چاندی کے برتن سے پانی پینا مکروہ سمجھتا ہے لیکن اگر مل جائے تو چاندی کے چرانے میں باک نہیں)

فارسی اشعار کا بھی یہی حال ہے ۔مثلاً دنیا پرست علما شاہی دربار سے روٹھ کر خانۂ خدا کا رستہ لیتے تھے۔ اور جب حرص مجبور کرتی تو پھر ہند کی طرف دوڑتے تھے

بجیدہ می روی زسر کوے او سلیم چوں می شود نیاید اگر از قفا کسے

(اے سلیم تم دوست کی گلی سے روٹھ کر تو جا رہے ہو۔لیکن اگر کوئی منانے نہ آیا تو کیا ہوگا)

اہل عشق ظاہری قیود سے بیگانہ ہوتے ہیں ۔

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ ما بود بقیم وصنم بر سر محراب شکستیم

(کعبہ اور بتخانہ دونوں ہماری راہ میں رکاوٹ تھے ۔اس لئے ہم نے بت کو محراب سے دے پٹکا)

زمانہ کی شکایت بیجا ہے ۔جو نقصان پہونچا ہے وہ دنیا پرست علما کے ہاتھوں پہونچا ہے

تا کے ملامت مژہ اشکبار من یکبار ہم نصیحت چشم سیاہ خویش

(میرے رونے پر کب تک ملامت کروگے ۔ذرا اپنے چشم سیاہ کو تو سمجھاؤ)

بڑے بڑے کاملین غلبہ حال میں شطحیات پر اتر آتے ہیں ۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق داوری خواہم ولے یارب کرا داور کنم

(لالہ ساغر لئے ہوئے ہے ۔نرگس مست ہے اور ہم پر فسق کا الزام ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہو جائے مگر یارب فیصلہ کرے کون)

خانقاہیں بھی دنیا پرستوں سے خالی نہیں ۔

یارب ز سیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد بت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

(خدا کرے کہ وہ بت خانہ جس کا نام لوگوں نے خانقاہ رکھ چھوڑا ہے سیل حوادث میں بہ جائے)

عہد سلف میں اختلافات عقائد کا نام ونشان نہ تھا ۔

لیلی و مجنوں ہم می بودہ اند پیش ازیں خوش روزگارے بودہ است

(اب سے پہلے کیا اچھا زمانہ تھا جب لیلی اور مجنوں مل کر رہتے تھے)

عشق اگر جرم ہے تو خدا کرے دنیا کبھی اس کے مجرموں سے خالی نہ ہو ۔

خدا گواہ کہ گر جرم ما ہمیں عشق است گناہ گبر و مسلماں بجرم ما بخشند

(خدا گواہ اگر عشق ہی ہمارا جرم ہے تو تمام دنیا کے گناہ اس جرم کی بدولت بخش دیے جائینگے)

خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو آسمان والوں اور زمین والوں کے دل میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے۔

کار زلف تست مشک فشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوے چیں بستہ اند

(مشک افشانی تیری زلفوں کا کام ہے مگر عاشق مصلحتہً آہوے چیں پر تہمت لگا دیتے ہیں)

مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ جس کو شوق ہو اصل کتاب کی طرف رجوع کرے

یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو زبان پر غیر معمولی قدرت تھی۔ الفاظ کی فوج ان کے اختیار میں تھی جس کو جس موقع پر چاہتے تھے استعمال کرتے تھے۔ اور اگر ضرورت ہوتی تھی تو نئی تراکیب اختراع کر لیتے تھے۔ اس کے ساتھ انداز بیان اس قدر انوکھا ہوتا تھا کہ لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہو جاتے تھے۔ مثلاً وہ علماے سوء کے بارے میں کہتے ہیں" ان کو بہر حال اپنے گنبد دستار کی تعمیر کے لئے اینٹیں چاہئیں، اگرچہ خانۂ شرع کی دیواریں توڑ کر بہم پہونچائی جائیں"!

دوسری جگہ کہتے ہیں" ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خوں آشام دانت مارتے دیکھا ہے"۔

اپنی ابتدائی آزادی و بے راہ روی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

"یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی۔ ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی۔ کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی و سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار و خود پرستی پر شرم آئی"۔

دیکھنا اپنی گرفتاری مجاز کے لئے کیسا بدیع و لطیف پیرایہ اختیار کرتے ہیں ۔

"کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور اس پر کمند پھینکے جاتے ہیں

قانونِ طلب وسعی سے انکار نہیں لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے۔
غرض کہ اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا لیکن اُدھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا۔ ناگہاں جادۂ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجازیں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہونچا دیا۔"

اس گرفتاری کے بعد آزادی کی داستان بھی سننے کے قابل ہے ۔

"الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفے نے بھی کچھ زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچے کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کرکے دیکھ ڈالے۔ کوئی گوشہ کوئی مقام باقی نہ چھوڑا۔ نہ مجنوں سے ہم عنانی کا سودا ہے نہ فرہاد سے مقابلے کا دعویٰ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شیوۂ عشق و عاشقی و طریقِ آشفتگی و جاں سپاری کی جتنی باتیں سننے میں آتی تھیں وہ سب کرکے دیکھ لیں اور اس راہ کا کوئی حال اور معاملہ ایسا نہیں، جو کسی کی زبان پر ہو اور اپنے اوپر نہ گزر چکا ہو ۔

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ براعت اسلوب اور یہ زورِ خطابت اردو میں بے نظیر ہے۔ اسی کے ساتھ کہیں کہیں درد و تاثیر کی بجلیاں اس زور سے کوندتی ہیں کہ اہلِ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ مثلاً شہیدِ حق شیخ علائی کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

"افسوس مرنے کے بعد بھی ظالموں کو تسکین نہ ہوئی۔ اور اس فنا فی الحق کی نعش کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو بدر و اُحد کے مقتول کفار کے ساتھ بھی نہیں کیا گیا........ سبحان اللہ کار و بارِ عالم کی بوالعجبی اور جہانِ ہزار رنگ کی بوقلمونی! یہ ہے خدمتِ انسانی کا وہ مزد و صلہ جو دنیا نے ہمیشہ اپنے غم گساروں کو دیا ہے۔ اور یہ ہے عشقِ حق و شیفتگیٔ صدق کا نتیجہ جو اس ظلم آبادِ ارضی میں ہمیشہ نیاز مندانِ حق کو ملتا ہے"

لوگ کہتے ہیں کہ مولانا کی تصانیف خصوصاً تذکرہ میں عربیت کی کثرت اور اصطلاحاتِ علمیہ کی فراوانی اس قدر ہے کہ عبارت عام فہم نہیں رہتی۔ اور اوسط استعداد والوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ قارئین کرام مثالوں سے اکتا گئے ہوں گے مگر اس سے چارہ نہیں۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

"یہ کتاب و سنت سے بُعد و ہجر۔ اور ترک براہین و یقینیات شرعیہ، و تشبث بظن و تخمین بحث، و تخرص و تلعب بظلمات اوہام و اہواء"۔ و قیاس غیر صالح و غیر موئید بالوحی کے شجرۃ الزقوم کے ابتدائی برگ و بار تھے جو آگے چل کر اس قدر پھلے پھولے کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ ان کے ثمرات ردیہ و خبیثہ سے خالی نہ رہا۔ اور وہ شریعت الٰہیہ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ السمحۃ الحنیفیہ و المحجۃ البیضاء لیلہا کنہارہا، طرح طرح کے ظنون فاسدہ و آراء مختلفہ و قیاسات مختلفہ و سبل متفرقہ و طرائق قددا و قواعد متناقضہ و تاویل الجاہلین و انتحال المبطلین و حیل المتحیلین و اقیسۃ القیاسیین و ظلمات بعضہا فوق بعض کا مجموعہ بنا دی گئی"۔

اس سے بڑھ کر غریب و ثقیل عبارت اگر برداشت ہو سکے تو ذیل کی مثال دیکھئے۔

"یہی تخریج در تخریج و تفریع در تفریع و قیاس در قیاس و استنباطات رائیہ چند در چند واقناع بر مجرد قواعد منطقیہ جزئیات و کلیات و تقسیم و تمثیل و ابعد بُعد و اہجر ہجر اصلین اسلین کتاب و سنت کی مصیبت عظمیٰ و رزئیہ کبریٰ ہے جس کی وجہ سے قرناً بعد قرنٍ و نسلاً بعد نسلٍ سخت و شدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں۔ اور کارخانۂ شرع میں فساد عظیم رونما ہوا۔ ازاں جملہ یہ کہ ناواقف عند ابی حنیفہ دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ فرع امام ابو حنیفہ کا بعینہ مذہب ہے۔ جب مسئلہ عشر فی العشر اور تحریم اشارہ فی التشہد و کراہت رفع الیدین عند الرکوع و کراہت آمین بالجہر و اقتدا خلف مخالف و عدم وجوب طمانینت وغیرہا کی نسبت صاف دیکھ رہے ہیں کہ صریح تصریحات کتب اصول و موطا و جامع وغیرہ کے خلاف لکھا ہے حتیٰ کہ بعض کوتہ آستینان فقاہت کی دراز دستیاں یہاں تک بڑھیں کہ رفع الیدین عند الرکوع اور اشارہ فی التشہد کو فعل کثیر کہتے ہوئے بھی نہ شرمائے تو پھر اور باتوں کے لئے ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون تھا"۔

اس طرز تحریر کے مخالف کہتے ہیں کہ بندشوں کی گرانباری اور جملوں کی ناہمواری دیکھئے۔ موافق جواب دیتے ہیں کہ ترکیب کے زور اور عبارت کے شور پر نظر ڈالئے۔ اول الذکر کا کہنا ہے کہ مولانا کو اپنی ذات کی طرح اپنے ادب کو بھی عوام کی رسائی سے دور رکھنا منظور تھا۔ آخرالذکر کا خیال ہے کہ علمی مسائل کی بحث میں علمی اصطلاحات کا

لانا ضرور تھا۔ بہر حال یہ عیب ہو یا ہنر، اردو ادب میں ایک انوکھی چیز تھی جس کو کوئی سمجھا یا نہ سمجھا مگر چونک سب پڑے۔ اوپر کہا گیا تھا کہ تذکرہ کا اسلوب خطیبانہ ہے جس میں زورِ خطابت۔ عربی عبارات۔ علمی اصطلاحات کے ساتھ اکثر موقعوں پر طوالت اور تکرار نظر آتی ہے۔ اور کہیں کہیں عبارت مغلق اور دشوار ہو جاتی ہے۔ مگر آخر کی دو تین فصلیں جن میں مولانا نے اپنے ذاتی سوانح کی طرف ہلکے ہلکے، انداز میں اچٹتے ہوئے مگر بلیغ اشارے کئے ہیں ان کا انداز خطیبانہ نہیں بلکہ ادیبانہ ہے۔ بند شوں میں عربیت سے زیادہ ادبیت اور گرانی سے بڑھ کر روانی کارفرما ہے جس کی چند مثالیں ابھی گذریں۔

ذاتی حالات کے بیان میں چھپانے کی کوشش کے باوجود مولانا کی سیرت کے خط وخال بہت کچھ نمایاں ہو گئے ہیں مثالیں کافی درج ہو چکیں۔ جی نہیں مانتا کہ ایک دو شہ پارے یہاں نقل کرنے میں بخل کیا جائے۔

تصویر کا ایک رخ۔

"بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے۔ لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی سخت تھی اور پشت غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی۔ بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے۔ ہاں بانگ بلند است زیں پوشیدہ نمی گویم

گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو۔ اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے۔ قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے شاہد بن جائیں اقراء کتابک۔ کفی بنفسك الیوم لك بنا رقیبا حسیبا۔ اور ہم شہادت دیں یا نہ دیں خود ہمارا وجود ہی سرتاپا شہادت ہے۔ بل الانسان علیٰ نفسه بصیرة ولو القیٰ معاذیرہ"

دوسرا رخ۔

"اسی اثنا میں رمضان المبارک کی برکات و نعائم کا ورود ہوا۔ اگرچہ (نظر بندی کی وجہ سے) نماز جماعت کی کیفیت انجمن طراز اور جماعت تراویح و سماع تلاوت کی لذت دل نواز سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محرومی رہی ...... لیکن پھر مقام خلوت و انزوا کی کیفیتوں اور انجمن در خلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا کہ دنیا جہاں کی ساری صحبتوں اور

الجھنوں سے دل بے پروا ہو گیا۔ علی الخصوص عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنا اور روزہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں پائیں اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوق سماع کی جو جو دولتیں لوٹیں نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کر سکتی ہے نہ سامع استعداد سماع رکھتا ہے"۔

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

غرض کوئی اسلوب یا طرز ہو، مصنف کی انانیت (انفرادیت) کا آئینہ ہے۔ لیکن انا خود کوئی بے حس اور جامد شے نہیں ہے۔ وہ ایک طرف اپنے گرد و پیش کے خیالات و افکار۔ اور خارجی عناصر و عوامل کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اور دوسری طرف ان کا رنگ قبول بھی کرتا ہے۔ یہی عمل اور ردّ عمل انسانی انا کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔ اور اسی سے اس کی شخصیت متعین ہوتی ہے۔ مولانا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عامی اور نابغہ (جینیس) دونوں میں یہ قدر مشترک ہے تو فرق کیا ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ فرق کیفیت اور درجہ کا ہے۔ یعنی ایک نابغہ کے اندر تخلیقی اور فعالی عوامل کیفیت اور درجے کے لحاظ سے دوسروں کے مقابلے میں برتر اور بہتر حالت میں کارفرما ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تخیلہ کا عمل ہو یا مشاہدہ کا۔ جذبات کا اظہار ہو یا واقعات کا۔ معانی ہوں یا عبارات سب کے سب ان کی تحریر میں اسی فعالیت سے اثر پذیر دکھائی دیتے ہیں۔

معانی و الفاظ کا تعلق پانی اور ظرف کا یا جسم اور لباس کا سا تعلق کہا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر اس کو روح و جسم کے علاقے سے نسبت دی جائے تو بہتر ہے۔ یہ درست ہے کہ جسم بغیر روح بیکار ہے لیکن روح بھی جسم کے بغیر اس عالم اسباب میں معطل ہے۔ مولانا کی تصانیف میں یہ وصف بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے کہ وہ بلند مطالب کے لئے بلند پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ اور اگر نہیں ملتا تو ان کی نادرہ کار طبیعت اختراع و ایجاد پر بھی قادر ہے۔

اس اچھوتے انداز نے ان کی تصانیف کو اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت دیدی ہے۔ تذکرہ ان کی ابتدائی عہد کی تصنیف ہے۔ اور بعد کو یہ رنگ اور زیادہ شوخ ہوتا گیا۔ مگر خود تذکرہ میں ایسی ادبی خصوصیات ہیں جو پورے طور پر مصنف کی بقائے دوام کی ضامن ہیں۔ اس لئے ہماری زبان کے نامور شاعر و ادیب نے عین حقیقت کی ترجمانی کی تھی جب کہا تھا کہ

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر   نظمِ حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

مولانا ابوالکلام آزاد
مولانا شبلی کے خطوط کی روشنی میں

(از ابو علی اعظمی)

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

یوں تو مولانا ابوالکلام کی، مولانا شبلی سے ملاقات کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں، لیکن ان میں سب سے مستند اور مرقوم روایت مولانا سید سلیمان مؤلف حیات شبلی کی ہے، جو انھوں نے اس کتاب میں الندوہ کی ادارت کے سلسلہ میں کسی قدر تفصیل سے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام سنہ ۱۹۰۵ء میں، مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے، اور یہ ملاقات بڑی تاریخی ثابت ہوئی، جس نے ابوالکلام کو، مولانا ابوالکلام بنا دیا، مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے۔ ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا، جہاں وہ مولانا کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک ہوتے رہے، اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے چلے گئے، ان کو مولانا شبلی نے الندوہ کا جو اُن کی اور مولانا شروانی کی مشترکہ ادارت میں بہت آب و تاب سے نکلتا تھا، اور جس کے تاریخی مضامین کی سارے ملک میں بڑی دھوم تھی سب ایڈیٹر مقرر کر دیا، اس فرض کو باوجود اپنی طبیعت کے لاابالی پن کے بہت خوبی سے انجام دیا، اور متعدد مضامین لکھے، جن میں سے دو نے ان کی شہرت کو علمی حلقہ تک پہنچا دیا، ایک "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" اور "المرأۃ المسلمہ پر ریویو"، انھیں چند سال کے مضامین نے جن میں آگے بڑھنے، ترقی کرنے، بلکہ اردو کے ایک صاحب طرز انشا پرداز بننے کے تمام قیود موجود تھے، ان کو دور دور تک مشہور کر دیا، اور ہر طرف سے ان کی مانگ آنے لگی، اور وہ سنہ ۱۹۰۶ء میں وکیل امرتسر میں چلے گئے، ان سے دو برس بڑے ان کے ایک بھائی اور تھے، ویسے ہی ذہین، بلند حوصلہ، طباع اور شاعر، مولوی ابوالنصر غلام یٰسین صاحب آہ، وہ عراق کی سیاحت کے لیے گئے تھے، وہیں ان کا انتقال ہو گیا

انہی سے ان کے والد مولانا خیرالدین کی نسل جاری ہے، ان کے اچانک عالم غربت میں انتقال کر جانے سے مولانا خیرالدین کو بے حد صدمہ ہوا، اسی غم میں وہ بیمار پڑے اور ان کا بھی انتقال ہوگیا رحلت کے وقت مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا۔ اور وہ امرتسر چھوڑ کر پہلے بمبئی، اس کے بعد اپنے والد کی خدمت میں کلکتہ پہنچ گئے، کچھ دنوں تک بطور پیشۂ آبائی کے ہدایت و ارشاد خلق میں مصروف ہوئے، لیکن یہ شغلہ ان کے پسند خاطر نہیں ہوا، اور ۱۹۱۲ء میں الہلال نکالا، جس کے پرزور دینی مقالات اور الہامی اسلوب تحریر نے ملک میں ایک ہلچل پیدا کردی، اور سارا اسلامی ہندوستان ان کی طرف متوجہ ہوگیا، پھر روز بروز ان کی سیاسی و ملی و قومی مشغولیتیں بڑھتی چلی گئیں، اور رفتہ رفتہ بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہو گئے، مولانا شبلی سے ان کے جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے، وہ مولانا شبلی کی زندگی بلکہ نفس واپسیں تک باقی رہے، ذیل کی سطور میں، مولانا شبلی کے خطوط کی روشنی میں مہر و محبت کی یہی دلنواز حکایت آپ کو سنانی ہے،

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

مولانا شبلی کا مولانا ابوالکلام کو بمبئی سے ندوہ میں اپنے ساتھ لانے کا کیا مقصد تھا، اور مولانا شبلی کو ان سے کیا توقعات تھیں، ندوہ جیسی خالص علمی فضا اور مولانا شبلی جیسی ہمہ گیر شخصیت کے سایۂ شفقت سے نکل کر اور الندوہ جیسے بلند پایہ علمی رسالہ کی قابل فخر ادارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر ایک ہی سال کے بعد مولانا ابوالکلام کیوں چلے گئے، اور پھر ایسے صاحب صلاحیت نوجوان کو جو ان کی آیندہ علمی و قومی سرگرمیوں میں ان کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتا تھا، آسانی سے مولانا شبلی نے کیسے جانے دیا، اس کا پتہ نہ مولانا شبلی کے سوانح حیات سے چلتا ہے، نہ مولانا ابوالکلام آزاد کی معلومہ زندگی کے اوراق سے، مولانا کے مجموعۂ خطوط غبار خاطر سے بھی اس پر روشنی نہیں پڑتی، جو درحقیقت ان کی ایک طرح کی خود نوشت سوانح عمری ہے، اور اس سے ان کے سوانح حیات کے لیے بہت کچھ مواد اکٹھا کیا جا سکتا ہے، حکایت شبلی جلد اول میں ان کے نام کے جو خطوط ہیں، اور جن کی اچھی خاصی تعداد ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ایک ہی سال کی مختصر ترین مدت رفاقت میں، مولانا شبلی کو ان سے غیر معمولی شغف ہو گیا تھا، اور اپنے عزیز ترین احباب و تلامذہ سے کہیں زیادہ ان کو ماننے اور ان پر اعتماد کرنے لگے تھے، ان کو اپنا بہترین دوست، قابل اعتماد ساتھی، اور سچا ہمدرد سمجھتے تھے، اور اپنے تمام قومی، تعلیمی، علمی معاملات میں ان سے مشورہ کرنا، اور اپنی سرگرمیوں سے ان کو مطلع کرنا بہت ضروری جانتے تھے

ندوہ میں مولانا ابوالکلام کے زمانہ قیام میں کچھ دنوں کے لیے مولانا شبلی باہر چلے گئے تھے، وہ ہر وقت الندوہ کی ذمہ داری سے گراں بار رہتے تھے، جو پاں پہنچے تو وہاں سے مولانا ابوالکلام کو دو خط لکھے جن میں رسالہ کی ترتیب، مضامین اور بعض دوسرے امور کے متعلق مشورہ یا ہدایات ہیں، انھی میں سے ایک خط میں اپنے متعلق لکھا کہ یہاں ایک جلسہ ہوا، میں بیمار تھا، تاہم میں نے آدھ گھنٹہ سے زیادہ تقریر کی، شاید لوگوں نے پسند کی ہو" یہ خط اکتوبر ۱۹۰۵ء کا ہے، اس کے بعد مکمل چار برس کا فترہ ہے، اس دوران میں یا تو خط و کتابت کا سلسلہ بالکل منقطع رہا ہو، یا جاری تو رہا ہو، لیکن کوئی خط محفوظ نہ رہا ہو، بہرحال اصل خط و کتابت جون ۱۹۰۹ء سے شروع ہوتی ہے، اور پہلے ہی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کو ان کے ترک تعلق یا ترک خط و کتابت کا کتنا غم تھا، مولانا شبلی نے اس درمیان میں ان کو کئی خط لکھے، لیکن یا تو ان کو ملے نہیں یا انتہائی مشغولیت یا کثرت کار کی وجہ سے ان کو جواب دینے کا موقع نہ مل سکا، لیکن مولانا شبلی نے سمجھا کہ انھوں نے بالقصد خط و کتابت ترک کر دی ہے، اپنے جذبہ غم کا اظہار اس طرح کرتے ہیں،

چناں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

مولانا شبلی کلکتہ گئے تھے جسٹس شرف الدین کے یہاں قیام تھا، بڑی دلچسپیاں رہیں، ایک ہفتہ رہ کر واپس آئے، لیکن مولانا ابوالکلام سے ملاقات نہیں ہوئی، ایک عاشق سے آپ کو اپنے محبوب سے نہ ملنے کا جو غم ہو سکتا ہے وہ مولانا کو ہوا، لکھتے ہیں کہ کلکتہ میں میرے لیے سب کچھ تھا لیکن تم نہیں تھے، تو کچھ نہیں تھا،

چہ خط خضر برد از عمر جاوداں تنہا

ایک صاحب افتخار عالم نامی تھے، جنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی حیات النذیر کے نام سے بڑی ضخیم سوانح عمری لکھی تھی، اور مقدمہ مولانا شبلی کے خود ساختہ حریف بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا، جن کو مولانا شبلی سے خدا واسطے کا بیر ہے، اس کے بعد افتخار عالم صاحب مولانا شبلی کی لائف لکھنے والے تھے، اور ان سے اس کی اجازت اور حالات مانگے تھے، بھلا مولانا شبلی کب گوارا فرما سکتے تھے کہ ان کی لائف ایسا آدمی لکھے جو ان سے دور و قریب کا بھی تعلق نہیں رکھتا، دوسرے حیات النذیر جس طرح لکھی گئی تھی، وہ ان کو پسند بھی نہیں تھی، نام سے تو افتخار عالم صاحب کے شائع ہوئی تھی، مگر درحقیقت وہ بھی لکھی ہوئی خود ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم ہی کی، وہ اپنے حالات املا کراتے جاتے تھے، اور یہ لکھتے جاتے تھے، اور اسی طرح کی خدمت وہ مولانا شبلی سے بھی لینا چاہتے تھے۔ حالات انھوں نے اسی لیے مانگے تھے، اولاً تو مولانا شبلی کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اپنی رام کہانی

لکھتے، انھوں نے افتخار عالم صاحب کے خط کا جواب دیا کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم اسرار خدا کے سوا ایک اور بھی ہے، وہاں سے منگوائیے، اور اس کی اطلاع ایک خط کے ذریعے مولانا ابوالکلام کو بھی کر دیں، کہ میں نے ان کو یہ تو لکھ دیا ہے لیکن بھی بتا تو نہ دو گے جو لکھتے ہیں کہ ایسے لوگ اگر دینی لائف لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی، زندگی کے وہ اسرار اور مخفی حالات تھے، جو صرف مولانا ابوالکلام ہی جانتے تھے، اور دوسرا نہیں جانتا تھا، اور پھر مولانا ان کا اخفا بھی چاہتے تھے، اس کو کون بتا سکتا ہے، اب پتہ نہیں کہ منشی افتخار عالم صاحب نے مولانا ابوالکلام کو، مولانا کے حسب ہدایت خط لکھا یا نہیں، اور لکھا تو ابوالکلام صاحب نے ان کو کیا جواب دیا، بہر حال ہم کو جہاں تک معلوم ہے، کہ مولانا سید سلیمان کی سفارش کے باوجود منشی افتخار عالم صاحب اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اور انھوں نے مولانا شبلی کی لائف لکھنے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا،

لیکن اگر ان کا یہ عالم اسرار ان کی لائف لکھتا، تو اپنی معجز نگاری سے یقیناً اس کو اردو کے سوانحی ادب کا ایک معجزہ بنا دیتا، ہمیں معلوم نہیں کہ اس گہری عقیدت و وابستگی کے باوجود جو ان کو مولانا شبلی کے ساتھ تھی، ان کو کبھی اپنی عمر میں اپنے رنگ کی مولانا کی لائف لکھنے کا خیال پیدا ہوا یا نہیں، کاش کہ یہ کام انجام پاتا تو ان کی ایک اور بہتم بالشان ادبی یادگار منظر عام پر آجاتی،

مولانا ابوالکلام کے دل میں مولانا شبلی کی بڑی عظمت تھی، اُن سے بڑی نیازمندی، احترام اور عقیدت سے ملتے تھے، اور بڑے حوصلہ کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات کرتے تھے، جس سے مولانا شبلی کبھی کبھی گھبرا جاتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ میں کلکتہ آتا اور چند روز آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں لیکن آپنے بمبئی کی طرح شاہانہ فیاضیاں شروع کر دیں تو ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا،

مولانا شبلی کو ان کے ساتھ رہنے کی بڑی تمنا رہتی تھی، اور جب کبھی پوری ہوتی تھی، تو ان کو محسوس ہوتا تھا، کہ دولت دو جہاں ان کو مل گئی ہے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ مولانا ابوالکلام کا جنوری میں کہیں جانے کا پروگرام بن گیا تھا، مولانا آخر دسمبر میں جاتے تو زیادہ سے زیادہ دو چار دن یکجائی رہتی، لیکن مولانا کو اس سے کہاں سیری ہو سکتی تھی، لکھتے ہیں کہ وہ زمانہ بتائیے کہ ایک آدھ مہینہ آپ کے ساتھ رہ سکوں، گو بار خاطر بن جاؤں، ایک مرتبہ ان کو ایک کارڈ لکھا، جس پر صرف ایک شعر تھا،

درسرودنے است کہ در دیدہ نگہ، دیں عجب است
نہ نوا بے دمن آمد نہ گنا ہے گاہے

ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ آپ کلکتہ میں کب تک ہیں، یہ معلوم ہو جائے، تو میں کلکتہ آؤں،

ڈاکٹر محمود لندن میں، تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی ضرورت کے لیے مولانا شبلی کے "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" مضمون کو جو الندوہ کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، اور بعد میں کتابی صورت میں آگیا تھا، انگریزی میں منتقل کیا تھا، جس کو وہ وہیں شائع بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن خود مولانا شبلی اس وقت تک اُن سے اچھی طرح واقف نہ تھے، ان کو پتہ چلا تو مولانا ابوالکلام کو لکھا کہ سید محمود ایک شخص نے مضامین اورنگ زیب کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، جو عنقریب شائع ہوگا، لیکن یہ لکھتے لکھتے کلکتہ کی یاد نے ان کو بے قرار کر دیا۔ فرماتے ہیں، کہ کلکتہ کی پر لطف گھڑیاں اب دیکھیے کب نصیب ہوں۔

مولانا ابوالکلام کوئی اخبار نکالنا چاہتے تھے، جس کا نام ملک و ملت یا وقت رکھنا چاہتے تھے، مولانا شبلی کی لطافت طبع پر یہ دونوں نام بار ہوئے، لکھتے ہیں کہ اخبار کا نام نہ ملک و ملت موزوں ہے، اور نہ وقت، ایک مطول ہے اور دوسرا زائد از ضرورت مختصر، اُس کا نام صرف آزاد ہونا چاہیے، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ توافق اسمی کی وجہ سے لوگوں کو خود نمائی کا شبہ ہو،

مولانا ابوالکلام شروع ہی سے عربی اور دینیات کے بہت بڑے فاضل تھے، لیکن اصطلاحی معنی میں مولوی نہ تھے، نہ مولویوں کی طرح رہتے تھے، نہ مولویوں کے وضع و لباس کو پسند کرتے تھے، ان کا رہن سہن اور معاشرت بالکل اپٹوڈیٹ تھی، ایرانی ٹوپی، ایرانی کوٹ اُس پر پتلون ان کا مرغوب ترین لباس تھا، اور ان کے کشیدہ قامت پر یہ لباس اتنا پھبتا تھا، کہ بڑے سے بڑے خوش پوش مجمع میں بھی نگاہیں ان ہی پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ ہر شخص کی زبان سے بے اختیار یہ نکل جاتا تھا، کہ

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

لیکن یہ وضع و لباس ان کی مختلف النوع سرگرمیوں اور کاموں کے لیے کچھ زیادہ موزوں نہیں تھا، خصوصاً ہندوستان کے مذہبی طبقہ کے بھڑک جانے کا بڑا اندیشہ تھا، جو ان کا مخاطب اصلی تھا، اس پر مولانا شبلی ان کو لکھتے ہیں، کہ اب آپ کو مولویت کی صورت میں رہنا چاہیے، اس سے بہت اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنی ساری عمر مولویوں کی وضع اختیار نہیں کی، ان کو دیکھ کر کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا، کہ یہ مولوی ہیں اور مولویوں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، تحریک ترک موالات میں اس وضع و لباس کو چھوڑا، تو البتہ کھدر کی شیروانی اور کندھوں پر نہایت نفیس چادر اور کھدر کا کھڑے گٹ کا پائجامہ پہننا شروع کر دیا، پبلک جلسوں میں وہ اسی وضع میں آتے تھے۔

اور پورے مجمع پر چھا جاتے تھے، اس وضع میں بھی وہ پورے ہندوستان میں منفرد تھے،

ایک مرتبہ مولانا شبلی کو ابوالکلام کی یاد نے ستایا، ان کو معلوم ہوا، کہ وہ کلکتہ سے اجمیر جا رہے ہیں، کس بے تابی سے لکھتے ہیں، کہ اجمیر کب تک جانا ہے جغرافیہ تو آپ کو اتنا ضرور معلوم ہوگا کہ اس راہ میں لکھنؤ بھی آتا ہے،

مولانا شبلی اختصار و ایجاز کے بادشاہ تھے، بات خواہ کتنی ہی پھیلی ہوئی ہوتی، وہ سمیٹ کر چند جملوں میں لکھ دیتے، خطوط میں اور زیادہ اس کا لحاظ رکھتے تھے، کبھی چند جملے لکھ دیے، کبھی ایک شعر لکھ دیا، کبھی ایک ہی مصرع لکھ کر خط ختم کر دیا، کبھی صرف دستخط ہی پر اکتفا کر لیا، ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام کو خط لکھا تو اس میں صرف یہ شعر تھا اور کچھ نہ تھا،

شراب لطف بہ پر در جام کردی دلی گفتم

کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام نے ان کو لکھا کہ میں حیدرآباد جا رہا ہوں، تو فرماتے ہیں، کیا آپ حیدرآباد چلتے ہیں۔ تو میں افریقہ ہو کر کعبہ کو جا سکتا ہوں، ترکستان واپسی میں آجائے گا، لیکن حیدرآباد میں آپ کو کیا لطف آئے گا، احباب میں کوئی نہیں، ہاں فلک نما اور دولت آباد دیکھنے کی چیزیں ہیں، عماد الملک ہیں جو مغتنمات روزگار میں ہیں۔

مولانا ابوالکلام ایک مرتبہ ان کی ملاقات کو آنے والے تھے۔ لیکن انہی تاریخوں میں وہ کہیں اور جگہ جانے والے تھے، جس کو مولانا ابوالکلام نے پسند نہیں کیا، تو کس نیازمندی کے ساتھ لکھتے ہیں، اچھا کہیں نہیں جاؤں گا؛

بندہ را فرماں نباشد ہرچہ فرمائی بر آنم

ندوہ ایک زمانہ میں شدید اختلاف کا شکار ہوگیا تھا، اس کی مجلس منتظمہ میں مولانا شبلی کے مخالفین کی اکثریت ہوگئی تھی، جو ندوہ سے مولانا شبلی کے تعلق کو پسند نہیں کرتی تھی، اور ان کو کسی نہ کسی بہانہ سے علیحدہ کر دینا چاہتی تھی، مگر ندوہ کے طلبہ مولانا شبلی کے ہمدرد تھے۔ اور ان کے فضل و کمال کے حد درجہ گرویدہ، وہ ندوہ سے ان کی علیحدگی کو کسی طرح انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس معاملہ میں مولانا ابوالکلام مولانا شبلی کے ساتھ تھے، اور مولانا شبلی ندوہ کے داخلی انتشار اور ان کے خلاف اندر اندر جو سازشیں ہوتی رہتی تھیں، ان کی اطلاع برابر مولانا ابوالکلام کو دیتے رہتے تھے، لکھتے ہیں کہ:

"میرے خلاف فرد قرار داد جرم مرتب ہو چکی ہے، اور سنا ان ہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے، بھائی ظلم حد سے بڑھ گیا، کہاں تک صبر کروں، طلبہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں" اس موقع پر مولانا ابوالکلام کو وہ بلانا چاہتے تھے، لیکن ان کو شاید فرصت نہیں تھی، تو بے تاب ہو کر لکھتے ہیں، کہ اگر آپ اس موقع پر نہ آئے، تو میں قیامت تک کلکتہ

نہ آؤں گا، بلکہ بعد قیامت بھی،

دیر و حرم میں کعبہ مرا آباد رہے

یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے

مولانا شبلی کے احباب میں ایک ذی علم بزرگ حقی صاحب تھے، جو عرب گئے، وہ بغداد جا رہے، اور اپنے ساتھ مولانا شبلی کو بھی لے جانا چاہتے تھے، مولانا شبلی نے ابوالکلام صاحب کو لکھا کہ اگر آپ بیعت کے لئے آمادہ ہوں تو سفر کا پروگرام بناؤں لیکن مولانا کو ملک سے باہر کہیں جانے کی فرصت کہاں تھی، معذرت کردی، پھر ان کو مذاقاً لکھا کہ آپ تو ماشاءاللہ شیخ زادہ ہیں، آپ وہاں جائیں گے تو بڑی قدر و منزلت ہوگی، لیکن مولانا ابوالکلام نے اس کو برا مانا تو لکھتے ہیں کہ ہنسی مذاق کی باتوں کو بھی اصلی سمجھ جاتے ہیں۔ اگر یہی بدگمانی رہے گی تو جینا مشکل ہو جائے گا، اس کے بعد مولانا شبلی نے باوجود شدید خواہش کے، ارادہ سفر فسخ کر دیا،

ایک مرتبہ صرف ایک مہینہ تک کسی وجہ سے مولانا ابوالکلام کا کوئی خط نہیں آیا، تو انتہائی بے قراری کے عالم میں یہ مصرعہ لکھ کر خط روانہ کر دیا،

اس قدر ناسپاس ارباب وفا ہو جانا

مولانا شبلی کو بمبئی سے عشق تھا، ان کی فارسی غزلیات کے دو مجموعے بوئے گل اور دستۂ گل ہی نہیں بلکہ ان کی پوری شاعری سر تا سر بمبئی ہی کی ممنون احسان ہے، اس کی تعریف میں فرماتے ہیں،

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را   طراز مسند جمشید و فرتاج خسرو را

اس سے بڑھ کر یہ کہ

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

بیا اینجا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی   بتان آذری را دلبران شام و ایراں را

دامن عیش زدستم نرود تا شبلی   دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم

بمبئی سے جب دور ہو جاتے تھے تو وہاں کی صحبتیں ان کو خواب معلوم ہونے لگتی تھیں،

شبیا آں جلوۂ نیرنگہا ے بمبئی   بود تا وقتے کہ من خواب گرانے داشتم

لیکن وہی بمبئی جس کی ہر گلی ان کے نزدیک رشک صد فردوس تھی، مولانا ابوالکلام کی دوستی کے بعد وہاں جانا ہوا تو فرماتے ہیں، کہ میں آج بمبئی جا رہا ہوں، گو آپ کے بغیر وہ ویرانے سے بدتر ہے،

ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام اُن سے کسی بات پر ناراض سے ہوگئے، اور اس کی وجہ سے ان کے لب ولہجہ میں کچھ خشونت آگئی، جس کی مولانا شبلی کو بڑی اذیت تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ

آپ کا لہجہ اگرچہ نہیں بدلا لیکن بخدا یہ امید قائم ہے کہ کلکتہ پہنچونگا تو آپ سخت دلی سے کام نہ لے سکیں گے ظاہری طور سے سہی لیکن وہی قدیم عنایتیں پھر مبذول ہوں گی، اور میری خوشی ونشاط کے لئے اتنا ہی کافی ہے،

مولانا شبلی ابوالکلام صاحب کی تلون مزاجی اور عدم استقلال کے بہت شاکی رہتے تھے؛ ایک مرتبہ مولانا شبلی سے ناراضگی میں انھوں نے استقلال کا ثبوت دیا، اور باوجود خوشامد کے بھی خوش نہیں ہوئے تو فرماتے ہیں، کہ مجھے آپ کے عدم استقلال کی بڑی شکایت تھی، بارے اس مرتبہ اپنی ناراضی میں پورے مستقل رہے۔

بخت بد بیں کہ بہ شبلی نکند خیر جفا
نیک خوے کہ وفا راز جفا نشناسد

مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے بڑی غلط بیانیوں سے کام لیا تھا، لیکن یہ زہر، قند میں اس طرح لپٹا ہوا تھا، کہ کسی کو پتہ نہیں چلا، یہاں تک کہ اس کا ترجمہ اُردو میں بھی ہوگیا، مولانا شبلی نے اس کو پڑھا تو انھوں نے ابوالکلام صاحب کو لکھا کہ میں قیاس بھی نہیں کرسکتا، کہ جرجی زیدان یا کوئی اور شخص اتنا جھوٹ بول سکتا ہے، اس کا رد عربی میں لکھنا شروع کیا، اور اس میں ایسا منہمک ہوئے، اور اتنی سخت محنت کی، کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا، لکھنا پڑھنا مشکل ہوگیا، اس کے ابھی ساٹھ ہی صفحے ہوئے تھے، کہ اسی پر کتاب ختم کردی، مولانا ابوالکلام کو کس حسرت سے لکھتے ہیں، کہ سپاہی کا ہتھیار چھن جائے، تو پھر وہ کس کام کا ہے، لیکن یہی چند صفحے، جن کی تسوید میں مولانا شبلی کی ایک آنکھ بینائی سے محروم ہوگئی، جرجی زیدان کی زہر افشانیوں کا تریاق ثابت ہوئے، اور سارا عالم اسلام اُس کے فتنہ سے واقف ہوگیا، یہ رد پہلے المنار مصر میں شائع ہوا، اس کے بعد الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے کتابی شکل میں بھی آگیا، اور مولانا شبلی کی معرکۃ الآرا کتابوں میں شامل ہے،

مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تالیف کا کام شروع کیا تو سفر و حضر دونوں میں کام برابر جاری رہتا تھا، اور کتابوں کا بستارہ ساتھ ساتھ رہتا تھا، جو بڑا تکلیف دہ تھا، جس سے کبھی کبھی پریشان بھی ہوجاتے تھے،

مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں کہ کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے لیکن کیا کروں اور کتابوں کی الماریاں کہاں کہاں لئے پھروں ، پھر لکھتے ہیں کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ہر طرف سے صرف نظر کرکے وہیں آ رہتا اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا '

مولانا شبلی کی نظمیں الہلال و زمیندار اور دوسرے اخبارات میں کشاف و صاف کے فرضی ناموں سے چھپتی تھیں ، ان کا نام انھوں نے کشافیات رکھا تھا ' ان کو الگ سے چھپوانے کا خیال تھا ، لیکن اسی دوران میں علی گڑھ والے ان کے ایک مجموعۂ کلام کے ساتھ ان کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے ، لیکن مولانا شبلی نے اس کو ناپسند کیا ، اور اپنی ناپسندیدگی کا ذکر مولانا ابوالکلام سے بھی کیا '

مولانا شبلی جہاں کہیں بھی رہتے تھے ، دو کاموں سے غافل نہیں رہتے تھے ، ایک سیرۃ کے مواد کی فراہمی سے دوسرے مولانا ابوالکلام کی یاد سے ، سیرت کے متعلق حیدرآباد میں بعض اچھی کتابیں ان کو ہاتھ آئیں ، تو اس مسرت میں مولانا ابوالکلام کو بھی شریک کیا اس کے بعد لکھا کہ آپ سے ملنے کی بہت ضرورت ہے تاکہ کوئی متفقہ پروگرام کے مطابق آیندہ کوئی کام کیا جاسکے ۔

اوپر کہیں آیا ہے ، کہ ندوہ کی مجلس منتظمہ کے اکثر ارکان ، مولانا شبلی کی معتمدی کے خلاف ہوگئے تھے ، اور ندوہ کا سارا اقتدار چار شخصوں کے ہاتھ میں آگیا تھا ' اور وہی اپنے کو ندوہ کے سیاہ و سفید کا مالک سمجھتے تھے اصلاح احوال کی جو تجویز بھی پیش کی جاتی تھی ، وہ ان کے سنگ اقتدار پر جاکر پاش پاش ہو جاتی تھی ، مولانا شبلی نے اپنے طور پر ہر چند مصالحت کی کوشش کی ، لیکن کامیابی نہیں ہوئی ، ندوہ کی اس ابتری سے مولانا شبلی کو بڑی روحانی اذیت تھی ، مسئلہ صرف مولانا شبلی کی معتمدی ہی کا نہیں تھا ' ندوہ کے اعلیٰ نصب العین اور اس کی شاندار روایات کا تھا ' جن کا ان قدامت پسندوں کے ہاتھوں خون ہو رہا تھا ' یہ منظر مولانا شبلی سے کیسے دیکھا جاسکتا تھا ، لیکن اسی کے ساتھ ان کا مصالحت پسند مزاج کسی شورش اور فساد ' اور مخالفین کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کرنے کے لیے تیار بھی نہیں تھا ' وہ چاہتے تھے ، کہ ندوہ کا نظم و نسق برسر اقتدار اشخاص کے ہاتھ سے نکل کر قوم کے ہاتھ میں آجائے ، اس آرزو کے پوری ہونے کی ایک شکل یہ تھی ، کہ ندوہ کے باہر اخبارات میں بھی اصلاح احوال کے لیے آواز اُٹھے ، مولانا ابوالکلام حصہ تو لینا چاہتے تھے ، لیکن اسی جذبۂ مصالحت کی بنا پر مولانا شبلی اجازت نہیں دیتے تھے ، اس لیے وہ بالکل خاموش ہوگئے تھے ، لیکن جب حالات زیادہ خراب ہوگئے ، تو انہی نے خود اس کی طرف متوجہ کیا ، اور لکھا کہ فرمائیے ندوہ پر کب توجہ ہوگی ، اگر آپ پورے زور کے ساتھ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوں اور تمام حزب الاحرار کو متوجہ کرسکیں تو

میں تمام کاغذات اور دستور العمل وغیرہ لے کر کلکتہ آؤں اب سوال میری معتمدی کا نہیں ہے، نہ اس کا خواہش مند ہوں چاہتا ہوں، کہ عام اسلامی اتحاد قائم ہو جائے، اور عام انتخاب ہو جائے،

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مسئلہ کے لیے الہلال کی کئی اشاعتیں وقف کر دیں، اور اپنے زورِ قلم سے ایک درسگاہ کے داخلی مسئلہ کو، ملک و ملت کا ایک اہم مسئلہ بنا دیا، بالآخر ایک عرصہ کی کشمکش تلخیوں اور ناگواریوں کے بعد، مولانا ابوالکلام کی کوشش سے وہی کچھ ہوا، جو مولانا شبلی چاہتے تھے، اور اسی پر تمام اختلافات کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اس منظر کو دیکھنے کے لیے وہی نہیں تھا جس کو اس کی سب سے زیادہ آرزو تھی، اور جس کے خلاف یہ تمام طومار باندھا گیا تھا

یاد آئی میرے عیسیٰ کو، دوا میرے بعد

"مسلم گزٹ" لکھنؤ پہلے مولانا شبلی کا بڑا حامی تھا، ان کا مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ والا مضمون جس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ بدل دیا، اسی میں شائع ہوا تھا، بعد میں ان کا مخالف ہو گیا، اور پھر بند ہو گیا، اس وقت لکھنؤ میں کوئی اچھا اردو اخبار نہیں تھا، اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اور ندوہ کی آواز کو قائم اور زندہ رکھنے کے لیے مولانا مسعود علی ندوی جو مولانا شبلی کے اعلیٰ تلامذہ میں ایک خاص حیثیت کے مالک اور سراپا عمل ہیں، اور جن کی تنظیمی صلاحیتوں کا بہترین مظہر دار المصنفین ہے، ایک اخبار لکھنؤ سے نکالنا چاہتے تھے، مولانا شبلی نے یہ مژدہ خود اپنے قلم سے مولانا ابوالکلام تک پہنچایا، کہ مسعود مسلم گزٹ کا جانشین لکھنؤ سے نکالنا چاہتے ہیں، لیکن قدرت مولانا مسعود علی کو اس سے بڑے کام کے لیے تیار کر رہی تھی، اس لیے اس وقت اخبار نکالنے کی تجویز عمل میں نہ آ سکی، مولانا کی وفات کے بعد، جب ان کے مخصوص تلامذہ نے اُن کی یادگار میں دار المصنفین قائم کیا، تو مولانا مسعود علی کی تنظیمی صلاحیتیں بروئے کار آئیں، اور اس کو ایسا منظم کیا، جس کو دیکھ کر بڑے بڑے سولین آفیسرس اور دفتروں کے سربراہ کار دنگ رہ گئے۔

دار المصنفین تو عملاً جیسا کہ ابھی ہم نے اوپر لکھا مولانا شبلی کی وفات کے بعد قائم ہوا، لیکن اس کا خیال بہت عرصہ سے مولانا شبلی کے دماغ میں تھا، اور اپنے احباب اور تلامذہ سے برابر اس کا اظہار کرتے رہتے تھے، سب سے زیادہ تبادلۂ خیال اور خط و کتابت اس مسئلہ پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی سے تھی، اُس کے لئے انھوں نے علی گڑھ میں اپنے وطن حبیب گنج کو بھی پیش کیا تھا، مولانا ابوالکلام سے بھی ان کو بڑی توقعات تھیں، اس کے سامنے بھی اپنی اسکیم کو رکھا، اور وہ "الہلال" میں شائع بھی ہوئی، اس کا ذکر مولانا شبلی نے اپنے

ایک خط میں بھی کہا ہے "ان کی قوت عمل اور ان کی فکری توانائیوں کا بہترین مظہر ندوہ اور اس کی نظامت تھی، جس پر وہ سالہا سال سے فائز تھے، اور خارج اوقات میں منتہی طلبہ کو قرآن و حدیث کا درس بھی دیتے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ ان کے بیحد گرویدہ تھے جب ناخوشگوار حالات کی بنا پر، طلبہ کی عام ہمدردی کے باوجود انھوں نے استعفیٰ دیا" اور ان کا استعفا خلاف توقع ندوہ کے ارباب اقتدار نے منظور کر لیا، تو ندوہ سے متعلق ان کی ساری ایکٹیویٹی دفعتہً ختم ہوگئی، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا بدل کیا ہو؟ اور کونسا کام شروع کیا جائے۔ دماغ میں مختلف خیالات آتے تھے، اور مٹ جاتے تھے، مولانا ابوالکلام سے بھی اپنی مشغولیت کے لیے استصواب رائے کیا، لیکن انھوں نے بھی کوئی قطعی مشورہ نہیں دیا، مولانا شبلی کے سامنے مختلف مقاصد تھے، لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر پاتے تھے، بالآخر انھوں نے مولانا ابوالکلام کو لکھا، کہ جو مقاصد پیش نظر ہیں اُن میں سیرت مقدم ہے، یعنی ایک اکاڈیمی قائم ہو، سیرت کے متعلق تمام نادر تصانیف جمع کی جائیں، لوگوں کو وظائف بطور فیلوشپ کے دیے جائیں، کہ سیرت کی اسٹڈی کریں اور خاص اس فن میں ماہر بنیں، اور سیرت پر تقریر و تحریر کریں، ان کے وصال کے فوراً ہی بعد بحمداللہ بالکل اسی نہج پر دارالمصنفین قائم ہوا، اور اسی طرح کام کا آغاز ہوا، جو مولانا شبلی کے پیش نظر تھا،

مولانا ابوالکلام سے نامہ و پیام اور خط و کتابت کا سلسلہ نفس واپسیں تک قائم تھا، مولانا شبلی کی زندگی کا آخری کارنامہ "سیرۃ النبی" کی تالیف ہے، فرماتے ہیں

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا،
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا،

ابھی یہ کتاب زیر تالیف ہی تھی، کہ ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا، اور وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے، جس کا ان کو بیحد غم تھا، اپنے تلامذہ منتسبین و متوسلین میں جن کو سیرت کی تکمیل کی خدمت سپرد کرنے والے تھے، اُن میں ان کے نوجوان دوست مولانا ابوالکلام بھی تھے، اتفاق سے ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا، وفات سے تین دن پہلے ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمیدالدین صاحب کو حیدرآباد مولانا ابوالکلام کو کلکتہ، اور مولانا سید سلیمان کو پونہ اور دیسنہ تار دیا گیا، مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا گیا تھا، وہ کافی لمبا تھا، اس کا مضمون یہ تھا،

"اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلین سمجھا دیتا۔"

لیکن مولانا ابوالکلام کو یہ تار دہلی سکا، اور وہ نہ آسکے، مولانا سید سلیمان باکی پور میں تھے، اس لیے ان کو بھی نہیں ملا، لیکن استاد کی زیارت کی کشش سے بغیر کسی اطلاع کے از خود وہ اعظم گڈھ پہنچے، تو طاقت سلب ہوچکی تھی، پھر بھی آنکھیں کھول دیں، اور بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کچھ طاقت آئی تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا۔

"سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کردو"

اس کے بعد مولانا حمید الدین بھی حیدرآباد سے آگئے، ان کو اور سید صاحب کو یاد فرمایا، اور ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر تین مرتبہ "سیرت، سیرت، سیرت" کہا۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے ان کی زبان خاموش ہوگئی، اور دوسرے دن ان کا انتقال ہوگیا، مولانا ابوالکلام سے ملنے کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے،

شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ خود مولانا ابوالکلام بھی قرآن کی روشنی میں سیرت پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے، اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مدائح، سوانح وحالات، وقائع و ایام، اخلاق وحسنات، عادات ومعمولات، غزوات وسراپا، تعلیمات وارشادات، واردات وکیفیات، تزکیۂ نفس، تطہیر قلوب، تصفیہ باطن، تعلیم کتاب وحکمت سے متعلق جو آیتیں آتی جائیں، ان کو اکٹھا کرلیا جائے، اور پھر انہی کو ترتیب دے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مکمل کرلی جائے، جس زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے، تو ایک مرتبہ انھوں نے مولانا سے عرض کیا، کہ آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے،

"قرآن اور سیرت محمدیہ"

اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط وترتیب جمع کرکے دکھلایئے، کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع وایام معلوم ہوسکتے ہیں، مولانا شبلی نے ان کے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی، لیکن فرمایا کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہوسکے، لیکن جب مولانا ابوالکلام نے بہت اصرار کیا تو کہا اچھا اگر تم یہ ٹکڑا مرتب کردو تو سیرت کے ساتھ یہ شامل کردینا چاہیے۔

ایک عرصہ کے بعد دہلی میں اُن سے پھر ملاقات ہوئی، اور یہ زندگی کی آخری یکجائی تھی، تو اُس وقت انھوں نے فرمایا اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہوگی،

مولانا کے اس آخری اظہار خیال کے بعد ان کی ہمت بندھی، اور ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے

ماخذ و مستنبط شروع کردی، جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا، نئے نئے دروازے کھلتے گئے، اور امید و توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی، کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد انھوں نے دیکھا تو ایک عجیب عالم نظر آیا، حیات و سیرۂ نبویہ کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں تھا جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں، اس سے ان کو یقین ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں اور چھٹی صدی عیسوی سے لے کر اس وقت تک آپ کی بعثت و ظہور و دعوت کے متعلق دنیا کو جو کچھ معلوم ہے وہ سب بھلا دے، اور صرف قرآن ہی دنیا میں باقی رہے، تو وہی تنہا دنیا کو بتلانے کے لیے کافی ہے کہ "اس کا لانے والا کون تھا ؟ کیسے زمانہ میں آیا ؟ کس ملک میں پیدا ہوا ؟ اس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے ؟ قوم و مزبوم کا حال کیا تھا ؟ اُس نے کیسی زندگی بسر کی ؟ اس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا ؟ اس کی باہر کی زندگی کیسی تھی، اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا ؟ اس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کن کاموں میں کٹتی تھیں ؟ اُس نے کتنی عمر پائی ؟ کون کون سے اہم واقعات و حوادث پیش آئے ؟ اور پھر جب دنیا سے جانے کا وقت آیا تو دنیا اور دنیا والوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا ؟ اُس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی، تو دنیا کا کیا حال تھا ؟ اور جب واپسیں نظر وداع ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی ؟ غرضکہ ایک وجود، عظمت و صداقت، اس کے وقائع، وما یتعلق بھا وما یناسب ذالک میں سے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب کچھ صرف قرآن ہی کی زبانی دنیا معلوم کر سکتی ہے ؟ اور اس بارے میں قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں۔"

ابھی آپ نے اوپر پڑھا ہے کہ مولانا شبلی نے اس موضوع سے متعلق مواد کے ملنے میں شک و تردد کا اظہار کیا تھا جس پر مولانا ابوالکلام نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہی شک و تردد عملی زندگی میں مولانا شبلی کی تمام ناکامیوں، ناکامیابیوں اور محرومیوں کا سبب تھا، بلکہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کو جو اُلجھنیں پیدا ہوئیں، اور ان کی وجہ سے ندوہ کے کاروبار اور انتظامات سے جو کنارہ کش ہو گئے، اور اعظم گڈھ کا گوشۂ عافیت اختیار کیا، وہ بھی درحقیقت اسی کا نتیجہ تھا۔ مولانا ابوالکلام کے الفاظ یہ ہیں :

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں ایک عنصر یہ بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو وہ اس کی ابتدا ہمیشہ شک و تردد سے کیا کرتے تھے، اور جب تک یقین کرنے کے لیے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرنا چاہتے تھے، اس چیز نے ان کی عملی زندگی کو بھی بہت نقصان پہنچایا، اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے۔ ندوہ کے معاملہ میں جو اُلجھاؤ لوگوں نے ڈالے وہ ان کے اسی ضعف یقین، عدم جزم سلامت ارادہ کا نتیجہ تھا،

ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا، جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا"۔

لیکن خود مولانا ابوالکلام کی زندگی کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے، کہ جس کی طرف بقول ان کے "اصحاب سیر نے باوجود کمال سعی و نظر اور مشغولیت بہ جمیع طرق و ترتیبات توجہ نہ کی تھی" اور جس پر وقت کے سب سے بڑے سیر و مغازی کے مصنف کو مواد کی دستیابی میں شک و تردد ہوا تھا، انھوں نے اس پر ایک باب ہی نہیں، ہمت کرکے پوری ایک کتاب تو ترتیب دیدی، لیکن زندگی کے آخر تک اس کے طبع و اشاعت کا خیال تک ان کو نہیں آیا، حالانکہ ان کی ذاتی سوانح عمری سے کہیں زیادہ اہم و اقدم اور ضروری کام یہی تھا، لیکن جس طرح ان کی ذات سے اور بہت سی علمی توقعات وابستہ تھیں، اور ان کا خون ہوگیا، اسی طرح اس توقع کا بھی خون ہوگیا، اور دنیا اس مجتہدانہ کتاب کی زیارت سے محروم رہ گئی، اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا مسودہ محفوظ ہے یا دستبرد زمانہ کے نذر ہوگیا،

مولانا شبلی کے تو "عدم جزم و صلابت ارادہ" کا یہ نتیجہ ضرور تھا، کہ وہ اپنے معاندین و مخالفین کا جم کر مقابلہ نہ کرسکے، اور سامنے سے ہٹ گئے، لیکن ان کا کوئی علمی کام جو انھوں نے شروع کیا، قومی و ملی مشغولیتوں، دینی و تعلیمی سرگرمیوں، اور مسلسل سفروں کے باوجود ناتمام نہیں رہا، تصنیف و تالیف کا مشغلہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں، لکھنؤ میں ہوں یا اعظم گڈھ میں، کلکتہ میں ہوں یا بمبئی میں، بھوپال میں ہوں یا حیدرآباد میں، جلوت میں ہوں یا خلوت میں، کہیں بھی ہوں، کسی حالت میں بھی ہوں، پورے اہتمام کے ساتھ برابر جاری رہتا تھا، خود ان کی آخری تصنیف سیرت بھی، جس کو دنیا کے تمام ہنگاموں سے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا تھا، اور جو اچانک علالت اور پھر وفات کی وجہ سے ناتمام رہ گئی تھی، اور جس کا غم وہ اپنے ساتھ لے گئے، اس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، کہ اس کے چھ حصے شائع ہوئے، ان میں دو حصے تو خاص ان کے قلم سے ہیں، جن میں کہیں کہیں ترمیم میں جامع سیرت کا اضافہ ہے، بقیہ حصے جن کے عنوانات خود مولانا شبلی لکھ گئے تھے، جانشین شبلی مولانا سید سلیمان کے قلم سے ہیں، جن میں تمام تر انداز انھوں نے اپنے استاد ہی کا اختیار کیا ہے، اس کا ساتواں حصہ معاملات پر تھا، جو اس سلسلۂ تصنیف کا خاتمۃ الباب تھا، وہ ابھی زیر قلم تھا، کہ جانشین شبلی کو ہجرت پیش آگئی، اور وہ اس کا سارا مسودہ اپنے ساتھ دارالہجرت کراچی لے گئے، جو اب منظر عام پر آنے کے لیے موجودہ کارکنان دارالمصنفین کی نگہ التفات کا منتظر ہے، لیکن آزادی کے بعد ہر طرح کی یکسوئی، اور فراغ خاطر نصیب ہونے کے باوجود افسوس ہے کہ مولانا ابوالکلام کو اپنے کسی ناتمام کام کی تکمیل کے لیے فرصت نہ مل سکی، تفسیر ترجمان القرآن تک نامکمل رہ گئی، جس کی تکمیل اور پھر طبع و اشاعت کے لیے ساری دنیا منتظر تھی،

اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالکلام کو جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، اور جن کا ان کو خود بھی احساس تھا، اور مختلف مواقع پر اپنے زبان وقلم سے اظہار بھی کیا ہے، اُن سے جم کر کام لیتے، تو علم وادب کے خزانہ میں معلوم نہیں کتنا قیمتی اضافہ ہوگیا ہوتا، لیکن اس کے باوجود جو کچھ بھی موجود ہے، ان کی ادبی، علمی، اور تفسیری عظمت کے لیے کافی ہے، الہلال کی جلدیں، ان کے سیاسی خطبات، ان کے مضامین کے مجموعے، تذکرہ، کاروان خیال، غبار خاطر، بعض کتابوں پر ان کے مقدمات وغیرہ کو دنیا کیسے فراموش کرسکتی ہے، اور پھر ان کی ناتمام تفسیر تو ان کی وسعت علم، وسعت نظر، وسعت معلومات اور کمال تحقیق کی بہترین مظہر ہے، اس کے بعض مباحث تو اتنے بلند، اتنے عمیق اور اتنے موثر ہیں کہ اردو فارسی کیا متقدمین کی عربی تفاسیر میں بھی نہیں مل سکتے، یوں تو پوری تفسیر شاہکار ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ربوبیت کی بحث ان کے قلم کا بڑا زبردست اعجاز ہے جس کے پڑھنے کے بعد رب العالمین کی ربوبیت سے مشکل ہی سے کسی کو انکار ہوسکتا ہے، ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

لسانُ الصِّدق

عبدالقوی دسنوی

تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کی فضا میں آزاد کے افکار و خیالات تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ گونجتے رہے۔ اس گونج میں سمندر کا سا طوفانی زور بھی تھا اور پربت سے اترتی ہوئی ندی کا تیز دھارا بھی۔ اس گونج کی لہروں میں ایسا جوار بھاٹا بھی تھا جس نے انگریزوں کے قدم ڈگمگا دیے، ان کے جذبۂ حکمرانی میں تھرتھراہٹ پیدا کر دی اور ایسی تیزی اور ولولہ انگیزی بھی تھی جس نے ہندوستانیوں کو پل پل میں کئی منزلیں مارنے کے لئے تیار کر دیا۔ اُن کی تحریروں نے اگر ایک طرف ہندوستانیوں کے بجھے ہوئے دلوں کو روشن کرنے کا سامان مہیا کر دیا تھا تو اُن کی تقریروں نے دلوں کو گرمایا، اس میں ایسی حرارت پیدا کر دی جس کی گرمی سے غلامی کی زنجیریں پگھلتی نظر آنے لگیں اور آج جبکہ ہم ایک آزاد ہندوستانی کی حیثیت سے پچھلے پچاس سالہ غلام ہندوستان کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ جنگ آزادی کا سب سے بڑا سپاہی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے پریم مندر کا سب سے انوکھا پجاری، وطن کا دیوانہ، شمع اُردو کا پروانہ مسجدوں میں بیٹھ کر خدا سے لو لگانے والا اور میدانوں میں اتر کر اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش انگریزوں کے ساتھ تیغ آزمانے والا آزاد تھا۔
آزاد صرف ایک شخص نہیں تھا اس کے اندر کئی شخصیتیں پرورش پا رہی تھیں اور ان کی خصوصیتوں نے مل کر آزاد کو جنم دیا تھا لیکن یہ تصویر تو آزاد کی وہ ہے جس کے خد و خال بنانے اور نکھارنے میں انھوں نے پوری زندگی صرف کر دی تھی، ہم آج وہ تصویر دیکھیں گے جبکہ پہلے پہل انھوں نے وادیِ ادب میں قدم رکھا تھا اور اُردو صحافت کے گیسو سنوارنے، قوم و ملت کو اُبھارنے اور ان کی شیرازہ بندی کرنے کی ابتدائی کوشش کی تھی۔

آزاد نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ ساری تعلیم گھر ہی پر ان کے والد کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی

اساتذہ کا انتخاب اچھا کیا گیا تھا جس کا نتیجہ ہوا کہ انھوں نے جلد ہی عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں بڑی حیرت انگیز استعداد پیدا کر لی تھی، عربی زبان میں تو انھوں نے لوریاں سنی تھیں اور ماں کا پیار اسی زبان کے ذریعے ملا تھا اس کا پوچھنا کیا۔ اور اُردو فارسی والد سے ورا ثتاً ملی تھی۔ چنانچہ ان تینوں زبانوں میں کم عمری ہی میں بڑی دسترس حاصل کر لی تھی پھر آزاد (GENIUS) تھے جس نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کے زبان و قلم سے جو چیزیں نکلنی شروع ہوئیں اس میں بڑی تابناکی اور تحیر میں ڈال دینے والی بات تھی، بہت سے ادیبوں کی طرح انھوں نے بھی پہلا قدم شعر و سخن کی وادی میں رکھا تھا، اس وقت آزاد کی عمر تقریباً تیرہ سال کی تھی، عمر کی ناپختگی کے باوجود ان کے اشعار کی پختگی بڑی حیرت کا باعث تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ اس صغر سنی کے باوجود آزاد ایسے اشعار کا خالق ہو سکتا ہے۔ اُن متحیر لوگوں میں مرزا غالب کے شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رامپوری بھی تھے جنھوں نے اپنے شک و شبہ کو دور کرنے کے لئے ایک موقع پر آزاد کا امتحان بھی لیا آزاد امتحان میں کامیاب اترے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

صورت سے تو دس بارہ سال کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی "

"الہلال و نہار ۲ مارچ ۱۹۵۰ء"

لیکن شعر و نغمہ کی اس وادی کو آزاد عرصہ تک نہ اپنا سکے۔ انھیں بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے تھی، ایسی بیکراں وسعت جس میں وہ اپنے عظیم خیالات کا اظہار کر سکتے چنانچہ جلد ہی اس وادی کو خیرباد کہا اور نثر کے میدان میں اتر آئے۔ کلکتہ کے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسی زمانے میں سر عبدالقادر نے "مخزن" جاری کیا تھا، جس کی ملک میں بڑی دھوم تھی۔ یہ رسالہ اپنے انداز کا بالکل نیا تھا اور ظاہری و معنوی دونوں خوبیوں کا حامل تھا آزاد کی نگاہ بھی اس رسالے پر پڑی چنانچہ اس رسالے میں آزاد کا پہلا مضمون[1] "اخبار نویسی" کی سرخی سے مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد اس وقت بھی اخبار نویسی کے فوائد سے واقف تھے مضمون گرچہ بہت بھاری بھرکم نہیں ہے پھر بھی ان کی

---

[1] شیخ محمد اکرام نے "موج کوثر" میں لکھا ہے کہ "لسان الصدق" کی ادارت کے ساتھ ہی مولانا نے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں مضامین لکھنے شروع کر دئے تھے"۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے مخزن میں آزاد کے مضامین مئی ۱۹۰۲ء اور اگست ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئے ہیں اور "لسان الصدق" اس سے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء سے جاری ہوا۔

عمر کی مناسبت سے قابلِ صد ستائش ہے ۔

دوسرا مضمون اگست ۱۹۰۲ء میں "حکیم خاقانی شیروانی" کی سرخی سے اسی رسالے میں شائع ہوا۔ ابتدا میں آزاد کا ایک نوٹ بھی شامل ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک تذکرۃ الشعرا لکھ رہے تھے جس کا کچھ حصہ مکمل بھی ہو چکا تھا خبر نہیں وہ اس کو کہاں تک لکھ سکے اور اس کا کیا حشر ہوا لیکن جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے اس سے آزاد کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے مضمون عربی فارسی کے ثقیل الفاظ سے گرانبار نہیں ہے، اور صاف، رواں دواں اور عام فہم ہے ۔

یہ مضامین مقبول ہوئے شاید اسی مقبولیت نے آزاد کی ہمت بڑھائی اور ایک ادبی رسالے کے اجرا کا خیال اُن کے دل میں پرورش پانے لگا۔ پھر "نیرنگ عالم"، "المصباح"، احسن الاخبار، تحفہ محمدیہ اور "خدنگ نظر" کے تجربات اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو لسان الصدق کا پہلا شمارہ کلکتہ سے شائع کیا۔ رسالے نے اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے ابتدا ہی سے ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اخبارات اور رسائل نے شاندار خیر مقدم کیا اور اردو ادب کے لئے اسے نیک فال جانا ۔

آزاد نے چار مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس رسالے کو جاری کیا تھا ۔

(الف)۔ سوشیل ریفارم

(ب)۔ اُردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا

(ج) علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں

(د) تنقید یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا

رسالے کے پہلے شمارے میں ان مقصدوں کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے سوشیل ریفارم کے سلسلے میں بتایا ہے کہ مسلمانوں میں بے ہودہ رسم و رواج کیا ہیں یہ رسوم کہاں سے آئے ان کے نقصانات کیا کیا ہیں اور اُن سے نجات حاصل کرنے کے کیا کیا ذرائع ہیں ۔

دوسرے مقصد یعنی "ترقی اُردو" کے متعلق بتایا ہے کہ اُردو زبان کا دامن بہت تنگ ہے۔ تراجم اور دوسری علمی کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو کی ضرورت اہم ہے تاکہ علمی اور ادبی کام بڑے پیمانے پر ہو سکے ۔

تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے یہاں ریویو میں بجائے حسن و قبح کے اظہار کے اس کی تقریظ

کی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ ریویو میں بے لاگ تنقید کی جانی چاہئے اور تصنیفات کی اچھائی برائی کو واضح طور سے ظاہر کرنا چاہئے۔

علمی مذاق کی اشاعت کے بارے میں لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ علم کی اشاعت سارے ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ بنگالہ میں کی جائے گی کیونکہ علمی مذاق کی عام طور سے کمی محسوس کی جا رہی تھی۔

ان مقاصد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد اسی وقت سے اپنے آپ کو ملکی اور قومی خدمت کے لئے تیار کر چکے تھے انھوں نے قوم کی تباہی کے اسباب جان لئے تھے اور اس کی ڈوبتی نبض کو اچھی طرح پہچان لیا تھا چنانچہ ان مقاصد کے ذریعے ان کی سماجی اور مذہبی زندگی کو سنوار کر اور ادبی مذاق پیدا کر کے انھیں زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کی سماجی زندگی بہتر ہو، علمی مذاق بلند ہو، ادبی دنیا وسیع ہو اور ان کا ادب تنقید کے ذریعے صالح تر ہو جائے۔

رسالے کا منظر عام پر آنا تھا کہ لوگوں کی نگاہیں آزاد کی طرف اٹھنے لگیں۔ ایک وسیع طبقے کو رسالے نے چونکا دیا اور اسے مدیر لسان الصدق کے تعلق بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا ان کے ذہن و دماغ نے آزاد کے جو بت تراشے تھے وہ کسی سن رسیدہ عالم دین کی نمائندگی کر رہے تھے، رسالے کی آب و تاب نے حالی جیسی شخصیت کو متحیر کر دیا اور شبلی کو اس کے مدیر کا گرویدہ بنا دیا سارے ملک اور خصوصاً ادبی دنیا کے کونے کونے میں اس کی دھوم مچ گئی۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ رسالہ کب تک نکلتا رہا۔ ہمارے پیش نظر جولائی سنہ ۱۹۰۴ء تک کے شمارے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ آزاد نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھا تھا ان پر پورے طور سے کاربند رہے کبھی ان مقاصد کے تحت انھوں نے خود مضامین لکھے اور کبھی دوسروں سے لکھوائے۔ اس طرح بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کی سدھار کرتے رہے، رسالے میں مضامین کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ "انجمن" حمایت اسلام" کے عنوان سے آزاد نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا طرز تحریر ملاحظہ ہو۔

> "مبارک تھے وہ لوگ جنھوں نے اب سے تقریباً بیس سال پیشتر پنجاب کے قدیمی دارالحکومت لاہور میں ایک مفید انجمن قائم کی اور نہایت مقدس تھے وہ ہاتھ جنھوں نے اس بابرکت انجمن کا بنیادی پتھر رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انجمن کی تحریک طبیعتوں میں اس قومی احساس اور علمی مذاق نے پیدا کی تھی جو اس سرزمین کو زندہ دلی کا خطاب دینے والے نے اپنی سچائی بھری کوششوں سے پنجاب کے گوشہ گوشہ میں پیدا کر دیا تھا لیکن تاہم پنجاب کے لئے یہ امر

کچھ کم قابلِ افتخار نہیں ہے کہ اس زمانے میں جبکہ سرسید کی تعلیمات کا نہ صرف اس کا عزیز وطن مخالف ہوا تھا بلکہ قوم کی قوم مخالفت کی آگ بھڑ کانے میں ساعی ہو رہی تھی۔ اس کی دایئں نگاہوں نے دیکھا کہ پنجاب کی زمین میری خیر مقدم کو بالکل تیار ہے نگاہوں کا اس طرف اٹھنا تھا کہ ہزاروں دل بکف حاضر ہو گئے اور اس کی ہر نصیحت پر سر تسلیم خم کر دیا وہ مخالفت کی آگ جو پہلے یہاں تیزی کے ساتھ سلگ رہی تھی اس کامیابی کو دیکھ کر بھڑکی اور بھڑکتے ہی گلزار ابراہیمی کی بہار دکھلانے لگی اس کے نوشگفتہ پھولوں کی مہک نے پنجاب میں اس سرے سے اس سرے تک وہ روح پھونک دی جس نے اس زندہ دلی کے معزز خطاب کا سچا مستحق ثابت کر دیا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام اور خصوصیت سے مسلمانانِ ہند سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی کے شکار ہوئے۔ حکومت جا چکی تھی مگر اس کا نشہ باقی تھا جس نے انھیں اور بھی تباہ کیا۔ جہالت نے انھیں رسوم اور توہمات کا شکار بنا دیا۔ جس میں وہ ایسے اُلجھے کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گئے۔ بہت سی خوبیاں تخت و تاج نے مسلمانوں سے چھین لی تھیں اور جاتے جاتے انھیں جہالت، ذلت اور رسوائی کی غار میں ڈھکیل دیا تھا چنانچہ سنبھلنے کے بجائے روز بروز بد سے بدتر صورت اختیار کرتے گئے بعض اصحاب حل و عقد نے اس حالت اور اس کے نتائج کو محسوس کیا اور یہ جان لیا کہ جب تک اصلاح نہیں کی جائے گی ان کی حالت سدھرنے کی نہیں، سرسید، حالی، شبلی وغیرہ انھیں اصحاب میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ان کی اصلاح اور ترقی کے لئے وقف کر دیا۔ ابتدائی زندگی میں آزاد سرسید سے بے حد متاثر تھے، انھوں نے بھی قوم کی سدھار کو ایک اہم مقصد بنایا اور سوشیل ریفارم کے سلسلے میں حسب ذیل مضامین لکھے یا لکھوائے۔

۱ اسلام اور رسوم از رنجور عظیم آبادی

اس مضمون میں رسوم قبیح جو ہمارے گھروں میں عام طور سے رائج تھے اُن کے نقصانات بتائے گئے ہیں

۲ شادی از ابوالنصر آہ

اس وقت عام طور سے شادیوں میں محض حوصلے نکالنے کی غرض سے قرض لئے جاتے تھے یا جائداد فروخت کر دی جاتی تھی جس نے قوم کی معاشی حالت کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ مضمون نگار نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور اُن رسوم سے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے جو محض جہالت کی نشانی ہے۔

۳ توہمات کی زندگی — از ابوالنصر آہ

ملک کا ایک بڑا طبقہ عدم تعلیم کی وجہ سے توہمات کا شکار تھا عورتیں اس میں پیش پیش تھیں۔ چند مثالوں کے ذریعے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

۴ شگون — از ابوالنصر آہ

مختصراً بتایا گیا ہے کہ شگون پرستی جہالت کی نشانی ہے۔ ایام جاہلیت میں عرب میں اس کی بڑی اہمیت تھی، ہندوستان میں اس کی آج بھی اہمیت ہے۔ مسلمانوں نے بھی اسے اپنا لیا ہے۔

۵ سید اور شیخ — از یہ تجور عظیم آبادی

سید اور شیخ کی حقیقت بتاتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ان کے بجائے ایسے الفاظ کا استعمال ہونا چاہیے جس سے خاندان اور نسب کی اصل حقیقت ظاہر ہو سکے۔

۶ مقدور ہو تو خاک سے پوچھو کہ اے لئیم — از رضا علی وحشت

مسلمانوں کی کج روی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۷ حقوق نسواں اور اس کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی کی اصلاح — از سید محمد سعید بلگرامی

ابتدا میں اڈیٹر (آزاد) کا نوٹ بھی ہے مضمون میں تعلیم نسواں نہ ہونے کے نقصانات بتائے گئے ہیں۔

۸ ہندوستان کی اقوام جرائم پیشہ — از سید شاہد حسین امروہوی

جرائم پیشہ جماعت کی مختلف حالت پیش کرتے ہوئے ان کی اصلاح کے وسائل پر بحث کی گئی ہے۔

۹ حقوق نسواں — از سید محمد سعید بلگرامی

شادیوں کے سلسلے میں جو برائیاں ہمارے یہاں آ گئی ہیں ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

درحقیقت جہالت اور افلاس تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ جہالت کی وجہ سے ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ ان برائیوں میں گرفتار ہو گیا ان کے اٹھنے، بیٹھنے، کھانے پینے، شادی بیاہ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں یہ برائیاں داخل ہو گئی ہیں اور معاشرت کا ایک اہم جز بن کر رہ گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہاں کتنے ہی خاندان تباہ و برباد ہو گئے آزاد نے ان کی برائیاں بتا کر قوم کو ان سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے۔ قوم کی زندگی اور ترقی کے لئے آزاد نے اپنے رسالے کے ذریعہ مصلح کا رول ادا کر کے اپنی قوم پرستی کا ثبوت دیا ہے جو کہ اس وقت کا ایک اہم فریضہ تھا۔

ملک کا وہ طبقہ جو انگریزی داں تھا اُردو زبان و ادب سے غفلت برت رہا تھا، انگریز حکومت اور انگریزی ادب سے وہ طبقہ اس قدر مرعوب تھا کہ اپنی تہذیب، اپنا کلچر اور اپنی زبان سے بھی نفرت کرنے لگا تھا۔ اس طبیعت کے لوگ سارے ملک میں چھپیں رہے تھے لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ بنگال کے باشندوں میں چند افراد ایسے پیدا ہوگئے تھے جو صوبہ میں اُردو کے خلاف نفرت پیدا کر رہے تھے آزاد نے ایسے زہریلے خیالات اور رجحانات کے روکنے کی بھرپور کوشش کی اور ترقی اُردو کو اپنا مقصد بنا کر اس کی خدمت کا بیڑا اٹھایا چنانچہ اس سلسلے میں حسب ذیل مضامین لسان الصدق میں شائع ہوئے۔

۱ انجمن ترقی اُردو ادارہ

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی منعقدہ ۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی نے انجمن ترقی اُردو کی پہلی رپورٹ پیش کی تھی۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔

۲ رپورٹ سالانہ انجمن ترقی اُردو شاخ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۳ء۔
انجمن ترقی اُردو کی پہلی رپورٹ جو کہ علامہ شبلی نے پیش کی تھی۔

۳ ملکی زبان سے غفلت ابوالکلام آزاد

مصر کے مشہور اخبار المویدنے مصریوں سے شکایت کی تھی کہ وہ دوسری زبانوں کو سیکھتے ہیں اور اپنی زبان (عربی) سے غفلت برتتے ہیں حالانکہ انھیں دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے سیکھنے کے بعد اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا چاہیئے آزاد نے اس کے ترجمہ کے ساتھ اپنا ایک نوٹ بھی شائع کیا ہے۔ جس میں بتلایا ہے کہ ہندوستانی بھی اس مرض میں مبتلا ہیں اس لئے انھیں بھی اس مضمون کی طرف توجہ کیا ہے۔

۴ اُردو زبان بنگالہ میں ابوالکلام آزاد

بنگال کے چند لوگوں نے اردو زبان کی مخالفت کرتے ہوئے بنگلہ زبان کو اس پر ترجیح دی تھی اور اُردو سے نفرت کے زہر کو پھیلا رہے تھے آزاد نے اس خیال کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

۵ اُردو کا دکھڑا اور بنگالہ ابوالنصر آہ دہلوی

مضمون نگار نے اُردو میں کوئی عمدہ لغات اور گرامر نہ ہونے کی شکایت کی ہے اور بتلایا ہے کہ ایک بنگلہ کا کیا رونا سارے ہندوستان کا انگریزی داں طبقہ اُردو سے غفلت برت رہا ہے۔

۶ انجمن ترقی اُردو (ایک مراسلہ) علامہ شبلی

پروفیسر آرنلڈ کی روانگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مسٹر ڈبلیو بیل ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کی آمد آمد پر مبارکباد دی پیش کی ہے۔

۷ دارالسلطنت ہند میں ایک عمدہ اُردو پریس کی کمی۔ ابوالکلام آزاد

اُردو پریس کی مختصر تاریخ بتلاتے ہوئے بھی اس کی کمی محسوس کی گئی ہے۔

آزاد کا تیسرا اہم مقصد جو اس رسالے کے ذریعے وہ پورا کرنا چاہتے تھے وہ تنقید کا تھا۔ چنانچہ تنقید کی سرخی کے تحت کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کئے گئے آزاد ریویو میں تنقید کو پسند کرتے تھے اس زمانے میں تبصرہ دراصل تقریظ کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا بتصنیفات کے متعلق تعریفوں کے پل ضرور باندھ دیے جاتے تھے لیکن اس کی خامیوں کو سامنے لانے کی ہمت بڑی مشکل سے کی جاتی تھی آزاد نے اس کمزوری کو محسوس کیا وہ لکھتے ہیں۔

"لیکن اُردو میں ہمیشہ ریویو کا ترجمہ تقریظ کیا گیا ہے جس سے ریویو کا اصل مفہوم ہی مفقود ہو گیا اس لئے کہ تقریظ تو عام طور پر کسی کتاب کی مدح و تحسین کرنے کا مفہوم رکھتی ہے برخلاف ریویو کے کہ اس کا مفہوم صرف اس کے حسن ہی پر بحث کرنی نہیں ہے بلکہ اس کے قبح پر بھی نکتہ چینی کرنی ہے۔"

آزاد نے تنقید کو ریویو میں لانے کی بڑی اچھی رائے دی اور ساتھ ساتھ اپنے رسالے میں اس پر عمل بھی کیا چنانچہ تنقید "حیات جاوید" اُن کے اس نظریے کو تقویت بخشتا ہے گرچہ سرسید سے عقیدتمندی نے بھی اس میں اپنا کام کیا ہے۔ یہ تنقید شیخ عبدالقادر اور حبیب الرحمٰن شروانی کے جواب میں ہے لیکن اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اس کتاب کے علاوہ مسدس قیس، افسانہ دکن ریویو، خدنگ نظر، چراغ دہلی، الدرالمنثور فی تراجم اہل صاد قپور، الوادالاخلاق ارشادات القرآن، ارکان الاسلام، معلمہ نسواں وغیرہ کتابیں اور رسائل پر ریویو لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کتابوں پر ریویو کا وہ حق ادا نہیں ہوا ہے جس کا آزاد نے اعلان کیا تھا۔ لیکن زیادہ کتابوں پر اسی نظریے کی تحت تبصرے ہوئے ہیں۔ "الدرالمنثور فی تراجم اہل صادقپور" پر تبصرہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں

"افسوس ہے تو اس کا ہے کہ کتاب کی طرز عبارت اور طریق ترتیب بالکل نئے طریقہ پر رکھی گئی ہے اس لئے جدید اُردو کے مزے لینے والے اسے دلچسپی سے نہیں پڑھ سکتے۔"

ان کے علاوہ ان کے مضامین "ریاض الاخبار اور پیسہ اخبار" اور "ریاض الاخبار اور لسان الصدق" ان کی

تنقیدی صلاحیت کی داد دیتے ہیں۔

رسالے کی اشاعت کا چوتھا اور آخری مقصد "علمی مذاق کی اشاعت تھا" ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستانیوں کا علمی اور ادبی مذاق بلند سطح پر آجائے اور ان کے درمیان ایک علمی فضا پیدا ہو جائے۔ چنانچہ عوام میں علمی مذاق پیدا کرنے کے لئے اس رسالے میں مفید مضامین شائع ہوئے اور ایسی کوششوں کو سراہا بھی گیا جو علمی مذاق پھیلانے کے لئے کی گئی تھیں جن میں "انجمن حمایت اسلام" "پراونشیل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس" "پراونشیل محمڈن ایجوکیشنل کا اجلاس بنگالہ" اور "مسئلہ محمڈن یونیورسٹی" وغیرہ مضامین قابل ذکر ہیں۔

اس رسالے کے مطالعہ سے آزاد کے جاگتے ہوئے شعور کا احساس ہوتا ہے انھوں نے رسالے کی مختصر زندگی کے باوجود اپنے دور کے اخبارات اور رسائل کو متاثر کیا۔ انھیں قومی خدمات کے لئے ابھارا، جو اس رسالے کی عظمت کی بڑی ضمانت ہے، عظمت کی یہی ضمانت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اچھا دماغ، بلند حوصلہ اور اُن تمام جوہروں کو لے کر آئے تھے جو ایک بلند پایہ انسان کے لئے ضروری ہیں۔ آزاد نے الہلال اور البلاغ کے ذریعے اُردو صحافت کو زبان اور قلم دیا، اسے صحافت کے رموز سے آگاہ کیا اور ایک ایسا موڑ عطا کیا جس کے بعد اُردو صحافت نے ایک نئی زندگی پائی۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو الہلال اور البلاغ سے بہت پیچھے اس کا سلسلہ لسان الصدق سے جا ملتا ہے جو کہ آزاد کی صحافتی دنیا کی صحیح معنوں میں پہلی منزل ہے۔

"غبارِ خاطر" پر ایک نظر

از اسلوب احمد انصاری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"۱۵ ؍جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے، اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیئے۔ خیال تھا کہ انھیں حسب معمول نقل کرنے کے لئے دیدوں گا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا، تو وہ بہت مصر ہوئے۔ کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دیدینا چاہئے۔ چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ میں بلایا گیا۔ اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دیدیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے۔ اور امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لئے پریس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا، مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا"

۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء

اس اقتباس کو سامنے رکھنے کے بعد اس امر پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں رہتی کہ "غبارِ خاطر" میں جو خطوط یکجا کیے گئے ہیں۔ وہ بالقصد لکھے گئے ہیں، یہاں تک کہ مکتوب الیہ کو بھی یہ خطوط اگر روانہ کئے جا سکتے، تو اس اہتمام کے ساتھ کہ ان کی نقول محفوظ کر لی جاتیں۔ انگریزی شاعر پوپ کے طریقۂ خط و کتابت کی نسبت ابوالکلام آزاد کا عمل صرف ایک ہی منزل آگے ہے۔ خطوط کا فارم یہاں ایک اعتذار کی حیثیت رکھتا ہے۔ پورے ادبی طریقۂ کار کی طرح خطوط نگاری کا مقصد اولیں ابلاغ ہے اس ابلاغ میں کاتب اور مکتوب الیہ پہلے شریک ہوتے ہیں، عام قارئین بعد میں۔ اس مخاطبت کے دوران میں دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔ کاتب، مکتوب الیہ کو، اپنی نجی دنیا کے اندر، جس میں انسانی بڑائی اور کمزوری، امید اور مایوسی اور

چھوٹی بڑی خوشیوں اور حادثوں کے سائے جھلملاتے رہتے ہیں، بے تکلف داخل کر لیتا ہے خطوط ایک آزاد مرقعش زندگی رکھتے ہیں۔ ان میں ایک دہرا عمل جاری رہتا ہے۔ ان کی کائنات میں ایک تنوع ہوتا ہے جس میں شخصیت کے متضاد پہلو اور حالات کی نیرنگیاں غیر ارادی طور پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ زندگی میں بیک وقت جو حسن اور بدصورتی ہے۔ المیہ اور طربیہ کا جو امتزاج ہے، خوف اور مسرت کے جو پر اسرار سرچشمے ہیں، اور خود خطوط نگار احساسات کے زیر و بم میں جس طرح گھرا رہتا ہے، اور تجربہ کی طرف اس کے ردعمل میں جو تہیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، یہ سب بے ساختہ تحریر میں بغیر رکاوٹ کے سامنے آجاتی ہیں۔ ناول، کہانی یا ڈرامہ میں لکھنے والا ان کرداروں، واقعات اور اس ذہنی اور جذباتی زندگی کا تماشائی ہوتا ہے، جسے اس نے تخلیق کیا ہے۔ خطوط میں خالق اور تماشائی ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ شخصیت اور تخلیق میں کوئی بُعد نہیں رہتا۔ اس سے وہ آسودگی اور تسکین پیدا ہوتی ہے۔ جو خطوط کے پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

"غبار خاطر" میں مکتوب الیہ کی شخصیت اتنی دھندلی ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نقش ابھرتا ہے۔ اس قسم کے جملوں کے علاوہ،

"(۱) حکایتوں سے لبریز ہے، مگر زبان درماندۂ فرصت گویائے سخن نہیں، مہلت کا منتظر ہوں"

یا "تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دلِ مستمند پر چھا گئی تھیں، کہ قلم اٹھا لیتا تھا، تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔"

یا تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں، کہ فریاد و شیون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ سُن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے۔"

جن کی تعمیر میں ادبی تصنع کو بڑا دخل ہے، مکتوب الیہ کی موجودگی ان خطوط میں کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ ازاوّل تا آخر مکتوب نگار کی انا ان پر غالب رہتی ہے۔ مکتوب الیہ کی حیثیت یہاں ایک ایسے رازدار کی سی نہیں جسے نہاں خانۂ دل میں گزر کی اجازت دی گئی ہو، بلکہ ایک ایسے قاری کی ہے، جس کے مفاد کے لیے دفترِ حکمت کھولے گئے ہیں۔ ان میں لہجہ ہائے زیر لبی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان میں نہ مکتوب الیہ ایک ریاضیاتی اکائی سے بڑھکر کوئی اہمیت رکھتے ہیں، نہ مکتوب نگار کی شخصیت کا جمود، کہیں تحلیل ہوتا نظر آتا ہے۔

اس "ذوقِ مخاطبت" کی تفصیل مختلف خطوط میں مختلف طور پر کی جا سکتی ہے۔ ۱۷، اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خطوط میں اس کا اظہار حیات و کائنات کے متعلق ریاضیاتی اور ارتقائی نظریات کی بحث اور شخصی خدا کے تصور کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ ان خطوط میں حقیقت کی جستجو کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ موجودہ حکمائے یورپ نیز قدیم مکتبہ ہائے فکر سے آگاہی کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ خود ابوالکلام آزاد کا ذہن بھی کم و بیش اس نہج پر سوالات کا جواب چاہتا تھا۔ ۱۸ اکتوبر کے خط میں یہ جملے ملتے ہیں۔

"یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سرتاسر ایک سوال ہے، سورج سے لیکر اس کی روشنی کے ذروں تک، کوئی نہیں، جو یک قلم پرسش و تقاضا نہ ہو۔ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟" ..... پھر جونہی ہم اپنے پرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ ایک صاحبِ ارادہ و ادراک قوت بھی یہاں موجود ہے، تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اندھیرے سے نکل کر یکایک اجالے میں آکھڑے ہوئے۔"

۱۹ اکتوبر کے خط میں "قانونِ ارتقاء" کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"ذرات سے لیکر اجرام سماوی تک، سب نے اسی قانونِ تعمیر و تحویل کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی ہوئی رفتار فطرت ہے، جسے ہم نشوو ارتقاء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایک معین نظم شدہ ہم آہنگ اور منظم ارتقائی تقاضہ ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے۔ اور اسے کسی خاص رخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لے جا رہا ہے۔"

ان اقتباسات سے آزاد کی فکری قوت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، لیکن اگر پورا خط اس قسم کی علمی بحث پر مشتمل ہو، تو اسے خط کیوں کہا جائے، علمی مقالہ کیوں نہ کہا جائے۔ فاضل مکتوب نگار نے جو کچھ ان موضوعات سے متعلق کہا ہے، اسے پورے علمی اور اصطلاحی ساز و سامان سے مرتب اور مزین کر کے کہا ہے، ان میں مشاہدہ اور وجدان کی روشنی اور تاثیر نہیں، منطق کی تجرید اور استدلال ہے۔ یہ خطوط کی مانوس، غیر رسمی (informal) اور بے تکلف فضا سے غیر آہنگ ہے۔ اس میں دعائے علمیت ہے، گفتگو کے لین دین کا انداز نہیں۔

بعض خطوط میں، ابوالکلام آزاد نے اپنی ذہنی تربیت اپنے افکار کے موثرات اور اپنی دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک غیر معمولی اور عظیم دماغ کے تدریجی ارتقا کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ پوری داستان واحد متکلم کے صیغہ میں سنائی گئی ہے۔ اور گو اس میں وہ لطف نہیں، جو غیر شعوری انکشافِ حال میں ہوتا ہے، یا ہونا چاہیے، تاہم اس سے کسی حد تک مکتوب نگار کے ذہنی اور روحانی افکار و اعمال اور ان کے خارجی اور اندرونی محرکات کے متعین کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ ۱۱ اگست ۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا، میری پیاس اس سے زیادہ نکلتی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ کہ طبیعت نئی خلشوں اور جستجوؤں سے آشنا ہوئی تھی۔ اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔"

۱۲ اکتوبر ۴۲ء کے خط میں اس قسم کے ایک اندراج سے مزید روشنی اس عمل پر پڑتی ہے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔"

۲۹ اگست ۴۲ء کے خط میں ایک مقام پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ کہ مکتوب نگار فکر کے اعتبار سے حقیقت پسند نہیں بلکہ عینیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا۔ اگر چھین گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں، اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔

آئینہ نقش بند طلسم خیال نیست
تصویر خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما

۱۶ ستمبر ۴۲ء کے خط میں موسیقی سے اپنے شغف اور ہندوستان میں فنِ موسیقی کے کمالات اور ...

تاریخ کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ اس کی اہمیت اس میں ہے کہ اسے پڑھ کر ابوالکلام آزاد کی طبیعت کے ایک ایسے رجحان کا پتہ چلتا ہے، جو عام طور سے لوگوں کی واقفیت میں نہیں ہے۔ اس ذوق کا یہ عالم ہے کہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میں آپ سے ایک بات کہوں، میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔"

اسی خط میں پہلی اور آخری مرتبہ وہ جملے بھی ضبطِ تحریر میں آ گئے ہیں جنھیں براہ راست انکشافِ حال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں گو دانستہ طور پر تفصیل سے گریز کیا گیا ہے، تاہم یہ جرأتِ رندانہ کا ایک اقدام ضرور ہے اور اس میں ایک ہلکی سی ذاتی جھلک ہے، جو بیشتر خطوط میں مفقود ہے۔

۲، ۱۷، ۱۷ اور ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کے خطوط، بعض دوسرے خطوط سے، اس اعتبار سے مختلف ہیں، کہ ان میں بھاری بھرکم موضوعات اور مسائل کی بجائے اپنے ارد گرد کی فضا سے خط لکھنے کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ ان تینوں خطوں میں چڑے چڑیا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالکلام آزاد اپنی ادبی اور مذہبی و سیاسی مصروفیتوں کے باوصف کبھی کبھار معمولی چیزوں سے بھی دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اس کہانی پر بھی ادبی رکھ رکھاؤ اور التزام کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اشعار کا استعمال جس کثرت سے کیا گیا ہے، اور معمولی چیزوں کی تزئین و تفسیر کے لیے جس طور پر اشعار کے مطالب سے مطابقت ڈھونڈی گئی ہے اس سے مزاحیہ امکانات ابھرنے کی بجائے، گرانباری پیدا ہو گئی ہے جس نے کہانی کے پورے ڈھانچہ میں ایک اجنبی عنصر کا اضافہ کر دیا ہے۔ تینوں خطوں میں اگر کہیں کوئی نفیس یا مانوس اشارہ ہے، تو وہ ۱۷ مارچ کے خط کے اس آخری ٹکڑے میں۔

"بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دلنشین بات نوکِ قلم پر آ گئی........ اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا......... اور یکایک زور سے پروں کے اڑنے کی ایک پھریری آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری

نفس میں بیٹھا ہے تاہم اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر
اب بیٹھ نکلا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے۔ عجب نہیں اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر
ایک پتھر پڑا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔"

۱۵ مارچ ۱۹۴۳ء کے خط میں چڑیا کے بچہ کی بتدریج پرواز کے عمل سے بے حد متاثر ہوتے ہیں اور جن مختلف مرحلوں سے گزر کر وہ بالآخر پرواز میں کامیاب ہوتا ہے، اس کا مشاہدہ انہیں بعض تعلیمات کی طرف لے جاتا ہے۔

"دراصل کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشہ تھا......
.....اس چڑیا کے بچہ میں اڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر
فضائے آسمانی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ مگر ابھی تک اس کی خود شناسی کا احساس بیدار
نہیں ہوا تھا.......... جونہی اس کی خود شناسی جاگ اٹھی، اور اُسے اس حقیقت کا
عرفان حاصل ہو گیا، کہ "میں اڑنے والا پرند ہوں" اچانک قالب بے جان کی ہر چیز
جاندار بن گئی........ وہی گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی
تھی، اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک
برق وار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلا کر اچھال دیا، اور پھر جو دیکھا تو درماندگی اور بے حالی
کے سارے بندھن ٹوٹ چکے، اور مرغ ہمت عقاب وار فضائے لامتناہی کی لا انتہائیوں
کی پیمائش کر رہا تھا۔"

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کا خط، جس میں ابوالکلام آزاد نے اپنی بیوی کی علالت اور وفات کا ذکر کیا ہے، وہ واحد خط ہے، جس میں جذبات کی موجودگی کا اظہار ہوتا ہے، اور جس سے ان کی نجی زندگی پر روشنی کی ایک کرن پڑتی ہے۔ اس خط میں بھی جگہ جگہ اُس انانیت اور خود پرستی کا ثبوت ملتا ہے، جو ان کی طبیعت کا جزو غالب تھی۔ اس میں کہیں بھی سپردگی، یا جذباتی اختلاط یا جذباتی تفہیم کا پتہ نہیں۔ اس کے برعکس ایک طرح کے فاصلہ اور دوری کا احساس ناگزیر ہے، جیسا کہ ان جملوں سے ظاہر ہے۔

"وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب
طبع کا اظہار ہوگا، تو مجھے سخت ناگوار گزریگا، اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں

باقی رہے گی۔ سنہ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی۔ تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی۔ اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔"

البتہ کچھ آگے چل کر خط میں لہجہ کی تبدیلی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً جہاں یہ جملے ملتے ہیں۔

"میں اعتراف کرتا ہوں، کہ یہ تمام ظاہرداریاں، کھیل کا ایک پارٹ تھیں، جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا۔ اور اس لیے کھیلتا تھا، کہ کہیں اُس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس خط میں کئی باتیں لحاظ کے قابل ہیں۔ اوّل زلیخا بیگم کی آزاد کے دل و دماغ پر ردعمل، دوسرے آزاد کی خود پسند طبیعت کا اس ردعمل کو جھٹلانا اور اس کی طرف استغنا برتنا۔ تیسرے آزاد کی نجی اور خانگی زندگی میں بھی فریقین کے درمیان احساسات کے دو طرفہ عمل کا ناپید ہونا۔ دراصل ابوالکلام آزاد کے لیے اپنی شخصیت کے مقابلہ میں کوئی دوسری شخصیت اس حد تک اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ کہ وہ اُس کی انفرادیت اور معنویت کو تسلیم کرتے۔ البتہ خط کے آخری جملوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی انسان دراصل خود کفالتی (self sufficient) نہیں ہوتا اور نہ تمام وقت رہ سکتا ہے۔ کیونکہ چاہے جس قدر ہم اپنی خودی کو ابھارنے اور اسے علیحدگی میں پرورش کرنے کی کوشش کریں، بہر حال بعض حالات میں ہمیں کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور عین اس وقت جبکہ ہم اپنی برتری کے احساس پر مطمئن اور نازاں ہوتے ہیں۔ دفعتاً جذباتی سپردگی (Abandonment) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس خط میں جو انداز کم و بیش شروع سے آخر تک اختیار کیا گیا ہے، اس کی شکست ان آخری جملوں سے ہوتی ہے۔

"اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی، اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی .... یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے، نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں، سینکڑوں دفعہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا، اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آ گیا۔"

"غبارِ خاطر" میں باوجود اس کے کہ زیادہ تر علمی مشاغل کا ذکر ہے، یا اپنی ذہنی تربیت اور افتاد کی طرف

اشارے کیے گئے ہیں، اور سادہ دلی پر عالمانہ، فلسفیانہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ بعض جگہ حسن کا احساس اور فطری مناظر سے لگاؤ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چائے کے اہتمام کے ذکر میں شاعرانہ مبالغہ آرائی اور صنعت کاری کو دخل دیا گیا ہے، اور فارسی کے اشعار جگہ جگہ نقل کر کے ان سے آراستگیٔ سخن کا کام لیا گیا ہے۔ لیکن ان سے قطع نظر فطری مناظر کے بیان میں دانستہ انشا پردازی کے مرقع جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کے خط میں یہ جملے ملتے ہیں۔

"کل باہر نکلا تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے، اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔"

"حکایت بادہ و تریاک" (۱۱ اگست ۱۹۴۲ء) کے تحت لکھتے ہیں۔

"صبح جب طلاشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی، اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا۔ قید خانوں کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔"

"حکایت زاغ و بلبل" (۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء) میں جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، پھولوں کے بیان میں شاعرانہ انداز کافی نمایاں ہو گیا ہے۔

"کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا کوئی نیلم کی پیالی تھی۔ کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلمکاری کی گئی تھی، کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔ بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں، کہ خیال ہوتا تھا۔ صناع قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا، صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں۔"

بہار کا ذکر کرتے ہوئے اسی خط میں موسم کے ردعمل کا حال اور گرد کی فضا پر اس طرح بیان کیا ہے۔

"انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے، تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر

اُبلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے، تو فضا کا ایک ایک ذرہ عیش و نشاط کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک افسردیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولیے، تو حسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگائیے تو نغمہ کی جان نوازی ہے! سونگھیے تو سرتا سر بوئے عطر بیزی ہے"

۱۸ ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ابوالکلام آزاد نے اپنے اشتغالِ موسیقی کا ذکر کیا ہے اور اسی سلسلہ میں یہ عجیب و غریب انکشاف کیا ہے کہ وہ ستار بجانے کے لیے چاندنی راتوں میں تاج کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس شغل کے پس منظر کا جو نقشہ جس انداز سے کھینچا گیا ہے، اس پر شاعرانہ اندازِ بیان پوری طرح حاوی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعی موسیقی کا اثر اس درجہ پورے ماحول میں نفوذ کر سکتا ہے۔ ماحول کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے۔

"رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں۔ اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے، اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے!"

پھر اس کے بعد موسیقی کے عمل کا جو تاثر پوری فضا پر مرتب ہوتا، اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی......... پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا: چاند بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ سر پہ آکھڑا ہوتا، ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آکر جھومنے لگتیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ ستارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کیں۔ اور جب کبھی تاج کے گنبد خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے"

۹ جنوری ۱۹۴۳ء کے خط میں ابوالکلام آزاد نے "انائیتی ادب" کی اصطلاح اور اس کے امکانات پر بحث کی ہے۔ اور ایسے ادب کے مدارج اور اہمیت پر مختلف مثالوں سے روشنی ڈالی ہے۔ مختصر طور پر انھوں نے "ایغو" کی تعریف فکری انفرادیت کے فطری سرجوش سے کی ہے۔ اور بڑے مصنف میں اس کی موجودگی اور اس کے اثبات کی کوشش کو ناگزیر بتایا ہے۔ یہ اصطلاح خود ان خطوط پر بھی عائد ہوتی ہے، کیونکہ ان میں آزاد کا مقصد انکشافِ نفس نہیں، بلکہ اثباتِ ایغو ہے۔ ان خطوط میں عجزِ نفس کی اہمیت کم سے کم ہے۔ ان میں فکر کی گہرائی، مشاہدے کی صحت اور باریک بینی اور بعض علوم و نظریات سے واقفیت کا ثبوت ملتا ہے لیکن ان میں وہ مانوس فضا، اور وہ جذباتی اتار چڑھاؤ نہیں ملتا، جو خطوط میں ہونا چاہیے۔ ان میں لہجے کی یکسانیت شروع سے آخر تک غالب رہتی ہے۔ شاعری میں شاعر کے ایغو کا نمایاں رہنا ہمیں گوارا ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی ذات کو خلاصۂ کائنات سمجھتا ہے۔ اور ہم اسے اس کا یہ حق دینے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن نثر نگار کے لیے یہ عیب مستحسن ٹھہرتا ہے۔ انداز بیان میں بے ساختگی کی بجائے شعوری ادبی اہتمام کو ہر جگہ دخل ہے۔ اچھی نثر کے لیے جس خارجیت، قطعیت، اور مفہوم اور الفاظ کے درمیان جس سخت گیر مطابقت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی ان خطوط میں کمی ہے۔ نمایاں طور پر معرب اور فارسی آمیز الفاظ کا استعمال زبان کو بدہیئت بنانے (**[illegible]**) کے مرادف ہے۔ یہ خطوط فنی اعتبار سے خطابت سے قریب تر ہیں۔ اچھے معیاری خطوط غالب کے یہاں ملتے ہیں، جن میں شخصیت، مفہوم اور زبان اس طرح باہم دگر آمیز ہیں، کہ انھیں الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان سے بیک وقت غالب کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے معاصرین اور احباب سے تعلقات کی پوری تصویر ذہن میں آجاتی ہے۔ ان میں جو چٹک ہے، جو وسیع المشربی ہے، ذہن اور روح کی عشرتوں اور افسردگیوں کو برہنہ کرنے کا جو جذبہ ہے طنز و مزاح کی جو لطیف چاشنی ہے، ان کے مقابلہ میں ابوالکلام آزاد کے خطوط ایک مصنوعی اور خود پرستانہ نمائش معلوم ہوتے ہیں۔ غالب کے یہاں ایک طرح کی پختگی اور رسیدگی (MATURENESS) ہے۔ آزاد کے یہاں ایک نوع کا الھڑ پن۔

آزاد اور غالب کے یہاں لب و لہجہ کا جو فرق ہے، وہ مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔ "غبار خاطر" میں ایک مہذب موضوع جس پر تواتر کے ساتھ اظہار رائے کیا گیا ہے، چائے نوشی کا مشغلہ اور اس کے اہتمامات ہیں۔ اس کے متعلق آزاد نے جس مرصع کاری سے کام لیا ہے، اس کی تشریح چند ٹکڑوں سے ہو جائے گی ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"وہی چار بجے کا جانفزا وقت ہے، چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے، اور طبیعت دراز نفسی کے لیے بہانے ڈھونڈ رہی ہے ...."

"چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسبِ معمول علی الصباح اٹھا اور جامِ صفا کا دور گردش میں آیا، تو محسوس ہونے لگا، جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہو۔ اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ یا مخلص خاں عالمگیر(؟) نے کیا خوب لطف و نشر مرتب کیا ہے۔ آپ ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجئے۔

خمار ماندہ و توبہ و دل ساقی
بیک تبسم مینا شکست و بست و کشاد

۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کو لکھتے ہیں۔

"وقت وہی ہے، مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے، جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی .... وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہو گئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنس گراں مایہ سے آشنا نہیں ...... مجبوراً ہندوستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدہ کے بموجب کہ برعکس نہند نام زنگی کافور، لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں، اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں۔"

۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں، وہ وہائٹ جیسمین کہلاتی ہے...... اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتشِ سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے .... لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے کہ جب کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔"

اب ان تمام اندراجات کا مقابلہ صرف ایک تراشہ سے کر لیجئے، جو میر مہدی کے نام غالب کے خط سے لیا گیا ہے۔

"[illegible] [illegible] کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں۔ آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں، مگر ہائے آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب۔ ہائے غضب ہائے غضب……"

غالب نے شراب سے اپنے شغل کو جس بھرپور بے ساختہ، اور پر لطف انداز سے بیان کیا ہے، وہ ابوالکلام آزاد کے بوجھل پرتصنع اور پرکار انداز بیان میں نظر نہیں آتا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں ابوالکلام آزاد پہلی اور آخری مرتبہ بے جھجک سامنے آتے ہیں۔ اور پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے سلسلہ میں اتفاقاً انھوں نے اس سخت پہرہ کو اٹھایا ہے، جو بالعموم انھوں نے اپنے اوپر بٹھا رکھا تھا۔

"جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا اُسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے، تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے تو انھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا۔ تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے، پارسائی کی راہ ملی، تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے، ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جائیے۔ رسم و راہ رکھیے، تو راہ کے کاموں سے رکھیے۔"

اب ان یادداشتوں کی تجدید کا طریقہ جو غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام دو خطوط میں استعمال کیا ہے، سامنے رکھئے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی، کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے، باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں، اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی، صبر کرو، اور اب ہنگامہ سازیٔ عشقِ مجازی چھوڑو۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھے رشک نہ آیا، کس واسطے
کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے، تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے
کہ جب میں جیتا تھا، تو میرا رنگ چمپئی تھا، اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے
تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے، تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھکو
رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا، تو اس کلمہ پر کہ داڑھی خوب گھنی ہوئی ہے، وہ مزے
یاد آگئے، کیا کہوں، جی پر کیا گزری .... جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے،
تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو
دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسی بھی چھوڑ دی، اور ڈاڑھی بھی ...."

اس تراشہ میں خاص طور پر نہ صرف یہ کہ یادوں کے خزانوں کو کنگھالا گیا ہے بلکہ مختلف کیفیات کے بیان میں، تخیل کی جو تیزی اور حقیقت کا جو بے باکانہ اظہار بیان ہے، وہ ابوالکلام آزاد کے یہاں ناپید ہے۔

"غبارِ خاطر" کی ایک بین خصوصیت، جو ان کے خطوط پن کو صد درجہ مجروح کرتی ہے، یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ علمی اور فلسفیانہ مسائل پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مشاہدات کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش ہے، یا مشاہدات سے تعمیمات اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"فطرتِ کائنات میں ایک مکمل مثال کی نمود داری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور
جمالی بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے، اس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے۔
پھر کیا ہم فرض کرلیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مدرک قوت کے کام کر رہی ہے؟"

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں یہ جملے ملتے ہیں۔

"غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا۔ اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو
اس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے، جس میں اس کا دل اٹک
سکے جس کے حسن گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے
اپنا دست عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیاز محبت کی راتیں بسر کر سکے۔ جو اگرچہ
زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانکا لگائے تاک رہا ہو"

۱۴ر جون ۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید طلب کے بے شمار درخت اگتے ہیں، اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ لیکن جو ٹہنیاں کہ جڑ کٹ گئی ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتی کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا۔"

ان تین تراشوں کے بالمقابل غالب کے خط میں سے یہ تراشہ رکھیے۔

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی، اور ایک قصر ملا، اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہ زمردین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ......"

ابوالکلام آزاد کے یہاں بالترتیب تمین تراشوں میں فلسفیانہ، نیم فلسفیانہ اور شعری فلسفیانہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ موخرالذکر" میں مشاہدہ سے عمومی بیانات کا استنباط کیا گیا ہے۔ غالب نے ایک ہمہ گیر صداقت کو پیش کیا ہے۔ صداقتیں دو طور پر بیان کی جا سکتی ہیں، مجرد اور محسوس شکل میں! پہلی کا تعلق فلسفہ اور منطق کے فیصلوں سے ہے، دوسری کا پیکر نگاری سے۔ پہلے کا عمل محض ذہن پر ہوتا ہے! دوسرے کا حواس اور تخئیل پر۔ ابوالکلام آزاد کے یہاں عام طور سے تفلسف اور Attitudinizing ملتی ہے۔ غالب کے یہاں مشاہدے اور صداقتیں محسوس اور مادی طور پر پیش کی گئی ہیں۔ اوّل الذکر کے یہاں ایک طرح کی سختی (stiffness) اور ادعائیت (dogmatism) ہے غالب کے یہاں نہ صرف وسیلۂ اظہار (Medium) میں پوری لچک ہے، بلکہ وسیلۂ اظہار، مشاہدہ اور وجدان ایک عضوی کل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ غالب کے یہاں خلوت اور جلوت دونوں کی رنگارنگی ہے۔ "غبار خاطر" کے خطوط کو ایک معنی میں انتساب خود (self-dedication) کہا جا سکتا ہے۔ ان میں بے ساختگی، عنصری ہمدردی" اور اور زندگی کے سخت و سست کو ہموار کر کے دلآویزی پیدا کرنے کا فقدان ہے۔ ان میں اچھی نثر کی خوبیاں نہیں ہیں۔ ابوالکلام آزاد یا تو مقدماتِ کبرائے و صغرائے قائم کرتے ہیں یا فارسی اور عربی آمیز

الفاظ اور اشعار سے ان کا تخیل اس درجہ آتش گیر ہو جاتا ہے، کہ عبارت توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے، اور اسلوب بیان سکون یافتہ (tranquilized) نہیں رہتا۔ اور وہ اپنی خطابت اور طلاقت لسانی کے رحم و کرم پر نظر آتے ہیں۔ اس طرح یہ خطوط نثری شاعری کی مایوس کن مثال بن گئے ہیں۔

مولانا آزاد اپنے آئینے میں

محمد عتیق صدیقی

مولوی جلال الدین رومی نے کہا تھا، اور کیا خوب کہا تھا کہ:۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد صرف مردم عارف ہی کا سینہ ان کا مدفن نہ بنا، بلکہ بلا تفریق مذہب وملت، اس برصغیر کے مردم عامی نے بھی ان کی یاد کو جگہ دینے کے لئے اپنے سینے کھول دئے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری سیاسی، دینی، علمی اور ثقافتی زندگی میں مولانا ابوالکلام آزاد، بلا شرکت غیرے، بلند ترین مقام کے مالک تھے۔ ان کی وفات کے بعد جتنا کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ہے، اگر یکجا کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے کی حسب ذیل تین کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

(۱) نقش آزاد۔۔۔ یہ مولانا آزاد کے خطوط اور ادبی یادداشتوں کا مجموعہ ہے، جس کو غلام رسول مہر صاحب نے ترتیب دے کر شایع کیا ہے۔

(۲) 'ہندستان آزاد ہوا' (انڈیا ونس فریڈم)۔ یہ مولانا کے خود نوشت حالات ہیں۔ اس کتاب میں ہمایوں کبیر صاحب نے مولانا کے خیالات اور ان کے بیانات کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔

(۳) "آزاد" (انگریزی) ۔۔۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو مولانا آزاد مرحوم کے متعلق ان کے واقف کاروں نے لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ہمایوں کبیر صاحب ہی نے مرتب کیا ہے۔

ان میں "نقش آزاد" کا مرتبہ اِس اعتبار سے بے حد بلند ہے کہ اِس کتاب کا ایک ایک لفظ براہ راست

مولانا مرحوم کے قلم سے نکلا تھا اور انھوں نے بعض خطوط میں غیر شعوری طور پر اپنی سیرت کے اکثر گوشوں کو بے نقاب کیا تھا۔ مہر صاحب نے اس مجموعے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا حصہ ان خطوط پر مشتمل ہے، جو مولانا مرحوم نے مہر صاحب کو لکھے یا لکھوائے تھے اس سلسلے کا پہلا خط مئی ۱۹۱۱ء کا اور آخری خط اپریل ۱۹۵۷ء کا ہے۔ گویا یہ ایک "چھیالیس سالہ داستان" ہے، جو خطوط میں بکھری پڑی ہے۔ یہ خطوط بقول مہر صاحب "اس غرض سے نہ لکھے گئے تھے کہ اشاعت پذیر ہوں گے، تاہم ان میں مولانا کے کمال علم وفضل اور یگانگی اسلوب تحریر کے بیسیوں نادر مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں۔ نیز مرحوم کے سوانح حیات اور فضائل، اخلاق و عادات کا بھی خاصا قیمتی سرمایہ ان میں موجود ہے۔" (دیباچہ کتاب)

کتاب کا دوسرا حصہ مولانا مرحوم کی ان تاریخی علمی و ادبی یادداشتوں پر مشتمل ہے، جن کا مرزا غالب کی شاعری اور ان کے حالات سے براہ راست تعلق ہے، اور جو مہر صاحب کی کتاب "غالب" کے دوسرے اڈیشن کے لئے حوالۂ قلم کی گئی تھیں۔ چناں چہ ان یادداشتوں کا معتد بہ حصہ، مہر صاحب نے "غالب" کے دوسرے اڈیشن میں، مولانا کے حوالے کے ساتھ، شائع بھی کر دیا تھا۔ نقش آزاد کے اس باب میں مہر صاحب نے تمام یادداشتیں بے کم و کاست شائع کر دی ہیں۔

نقش آزاد کے تیسرے حصے میں بھی ہم کو مکاتیب ہی ملتے ہیں، لیکن یہ وہ خطوط ہیں، جو مہر صاحب کے نام نہیں تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح ان کے ہاتھ لگ گئے اور انھوں نے ان کو سینے سے لگائے رکھا۔ "ان میں سے بعض خطوط الہلال سے بیشتر کے ہیں، اور اس دور کے مکاتیب بہت کمیاب ہیں" (دیباچہ کتاب)

شاید کم ہی لوگوں کو اس واقعے کا علم ہوگا کہ نقش آزاد کے مرتب غلام رسول مہر صاحب ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، چناں چہ مولانا کی "حزب اللہ" کی تحریک سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔ یہ نیم مذہبی، نیم سیاسی تحریک تھی۔ مہر صاحب نے روحانی تعلق کو مولانا کی زندگی کے آخری لمحوں تک بدستور قائم رکھا۔ لیکن سیاست کی ناہموار اور پرپیچ و خم راہوں میں مہر صاحب زیادہ دور تک مولانا آزاد کا ساتھ نہ دے سکے، اور جلد ہی دونوں نے بالکل مختلف بلکہ متضاد راہیں اختیار کر لیں۔ مولانا مرحوم کی سالکانہ زندگی کا یہ بھی ایک کرشمہ تھا کہ شدید سیاسی تضاد کے باوجود مہر صاحب سے ان کا روحانی رشتہ برقرار رہا، اور اس معاملہ میں مہر صاحب کی کوششوں سے نہیں، زیادہ خود مولانا کی عالی ظرفی اور بلند نظری کو دخل تھا۔

تہر صاحب کو جو خطوط لکھے گئے ہیں، ان میں سب سے پہلے خط کا یہ جملہ قابل ذکر ہے کہ

"میں آپ کے اندر عظیم الشان مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں" (مئی ۱۹۱۴ء - ص ۳)

یہ جملہ مولانا مرحوم کی جوہر شناسی کی اہلیت کا اچھا ثبوت ہے۔ تہر صاحب اس وقت طالب علم تھے لیکن مولانا نے ان کے پہلے ہی خط سے تاڑ لیا کہ یہ جوہر قابل ہے۔ تہر صاحب نے خط میں غالباً اپنے سیاسی عزائم کا ذکر کیا تھا، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ

"استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا، تو کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے، تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں،

ہاں رہ عشق است، کہ گشتن نہ دارد باز گشت جرم لا این جا عقوبت ہست و استغفار نیست

"دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیئے۔ لیکن جب اتر گئے، تو پھر موجوں کا شکوہ فضول ہے، اور کبھی بھی بنا نہ جائے گا، ممکن ہے کہ پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں سے سامنا ہو جائے۔ لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے۔ اُسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے"

استقامت کا یہ فلسفہ مولانا مرحوم نے ۱۹۱۴ء میں قلم بند کیا تھا۔ اور زندگی کے آخری لمحوں تک پوری استقامت کے ساتھ اس پر کاربند بھی رہے۔ جو لوگ مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، ان سے حسب ذیل باتوں کا وہ مطالبہ کرتے تھے۔

"جن عزیزوں نے گذشتہ سال، یا امسال، یا اس سے پہلے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، ان سب کی اطلاع کے لئے میں یہ سطریں شایع کرتا ہوں انھوں نے میرے ہاتھ پر پانچ باتوں کا عہد کیا ہے

"اول : امر بالمعروف نہی عن المنکر، اور توصیہ بصبر کا، یعنی ہمیشہ نیکی کا حکم دیں گے، بُرائی کو روکیں گے، صبر کی وصیت کریں گے۔

"ثانیا : الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کا، یعنی اس دنیا میں ان کی دوستی ہوگی تو اللہ کے لئے، اور دشمنی ہوگی تو اللہ کے لئے

"ثالثا: لا یخافون فی اللہ لائم کا، یعنی سچائی کے راستے میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کریں گے اور خدا کے سوا، وہ اور کسی سے نہیں ڈریں گے۔

"رابعًا : اس بات کا کہ وہ اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے سارے رشتوں، ساری نعمتوں اور ساری لذتوں سے زیادہ محبوب رکھیں گے۔

"خامساً: اطاعت فی المعروف کا، یعنی شریعت کے ہر حکم کی اطاعت بجا لائیں گے،
جو اُن تک پہنچایا جائے گا۔

"میں ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ اُن کا قول تھا، اور اب چاہئے کہ اپنے عمل سے بھی
اس کی پوری پوری تصدیق کریں اور کامل انقطاع اور راست بازی کے ساتھ اپنے تئیں
اللہ کے سپرد کر دیں ...."

حزب اللہ کی تحریک بہ ظاہر مذہبی لیکن حقیقتاً سیاسی تھی۔ اس بات کے واضح ثبوت بھی اسی تحریر سے فراہم ہوتے ہیں۔ بیعت امامت ہی کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، ان کا یہ فرض ہے کہ "حسب ذیل باتیں ان کی روزانہ کی زندگی میں نمایاں ہو جائیں اور ہر شخص اُن کو ان کی خصلتوں اور طریقوں کی وجہ سے ممتاز دیکھ لے:

"۱۔ ولایتی کپڑوں کا خریدنا، بیچنا، پہننا یک قلم ترک کر دیں اور دیسی کھدر کا لباس
اختیار کر لیں۔

"۲۔ اسلامی خلافت اور بلاد اسلامیہ کی حفاظت ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے،
پس جہاں تک ان کے امکان میں ہو، اپنے دل سے، اپنی زبان سے، اپنے مال سے،
اپنے عمل سے اس کام میں مدد دیں۔

..............."

"جو مسلمان مجھ سے بیعت کا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے، اس کا فرض ہے کہ ان باتوں پر
کاربند ہو۔ جس نے اس پر عمل نہ کیا، اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔........."

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے، تو یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً دشوار نہ ہوگا کہ انھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے پیشتر ہی اپنی راہیں متعین کر لی تھیں۔ اور ان کے فیصلے کی صحت مندی سے آج شاید ہی کوئی شخص انکار کرنے کی ہمت کرے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عام مسلمانوں کو اپنی متعینہ راہوں پر ڈالنے کے لئے مولانا نے جو راہیں اختیار کیں، انھوں نے مسلمانوں کے امراض کا ازالہ کرنے سے زیادہ ان کو مہلک تر بنا دیا۔ مندرجہ بالا اقتباس اس کا روشن ثبوت ہے کہ ابتدائی دور میں مولانا نے مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ انھوں نے مذہب اور سیاست کا ایسا

لذیذ مرکب تیار کیا، جس کو مسلمانوں نے شربت کے گھونٹ کی طرح فروحلق کرلیا۔ لیکن اس میں مذہب کی خوراک شاید ضرورت سے زیادہ تھی، چنانچہ جب مولانا نے اس مرکب سے مذہب کا جزو کم کرنے کی کوشش کی تو عام مسلمانوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے مسلمانوں کو جس درجہ نقصان پہنچا، اس کا صحیح اندازہ آج نہیں بلکہ کل لگایا جا سکے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ پہلی اور شاید آخری اجتہادی غلطی تھی، جس میں حالات کے تقاضوں سے زیادہ، غالباً ان کے سیاسی شعور کی ناپختگی کو دخل تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو جب خالص سیاسی دعوۃ دی، تو وہ لوگ بھی دامن جھٹک کر ان سے الگ ہو گئے، جنھوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ انھیں میں ایک مہر صاحب بھی تھے۔ یہ مہر صاحب کے کردار کی بلندی کا ایک روشن ثبوت ہے کہ نقش آزاد میں انھوں نے اس پہلو کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

۱۹۲۷ء میں مہر و سالک نے 'زمیندار' (روزنامہ لاہور) سے الگ ہو کر جب روزنامہ "انقلاب" کی داغ بیل ڈالی، تو مولانا آزاد مرحوم نے جی کھول کر ان کی ہمت افزائی کی اور بڑی فراخ دلی سے مفید مشورے دئے۔ اس سلسلے کے متعدد طویل خطوط نقش آزاد میں موجود ہیں لیکن جلد ہی انقلاب نے دوسری روش اختیار کر لی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے مہر صاحب سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ ایک خط (مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء) میں لکھتے ہیں۔

"انقلاب عرصے سے آپ نے بھیجنا بند کر دیا ہے۔ اس لئے نظر سے نہیں گزرتا، لیکن امید ہے سب دشتم میں آپ کی جانب سے کوتاہی نہ ہوتی ہوگی۔ معلوم نہیں، مقدار کا اب کیا حال ہے — روزانہ، یا ہفتہ وار یا بحساب فی ماہ

قند آمیختہ باگل نہ علاجِ دلِ ماست
بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند"

(نقش آزاد۔ ص۔ ۳۲۰)

مہر صاحب فٹ نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ نہرو رپورٹ کا دور تھا، جس کے سلسلے میں انقلاب کو کانگریس اور اس کے کارفرماؤں کی روش سے اختلاف پیدا ہوا۔ اور حالات کے تقاضے کی بنا پر اختلاف نے خاصی شدت اختیار کر لی۔ فرائض عامہ کی بجا آوری میں انسان اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق دیانتداری سے کام کرنا چاہے تو بعض اوقات نہایت محبوب و عزیز تعلقات کی پوری نگہداشت نہیں ہو سکتی۔ مجھے

پبلک زندگی میں، اسی موقع پر نہیں، بلکہ بارہا اس قسم کی آزمائشوں سے سابقہ پڑا ۔" (ایضاً)

جب ترجمان القرآن شائع ہوا، تو اس کا ایک نسخہ مولانا نے مہر صاحب کو بھی بھیجا، لیکن اس پر اپنے قلم سے نہ تو کچھ لکھا اور نہ دستخط ہی کئے۔ مولانا نے شاید یہ بات ارادتاً کی تھی، اور یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ چنانچہ مہر صاحب نے شکایتاً لکھا کہ "مجھے ترجمان کا جو نسخہ مرحمت فرمایا وہ تو میں ہر دوکان سے خرید سکتا تھا۔ میرے نسخے پر کچھ تحریر فرماکر بھیجتے تو اُسے میں واقعی ایک گراں قدر عطیہ سمجھتا۔" مولانا نے "از راہ نوازش دوسرا نسخہ اپنی تحریر سے مزین فرماکر بھیج دیا" (نقش۔ ص ۳۳، ۳۴۔ فٹ نوٹ)۔ ساتھ ہی انقلاب کی سابقہ تحریروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"......اگر نہیں لکھا تھا، تو غالباً اس لئے کہ میں نہیں سمجھتا تھا، آپ اب اس کے خواہشمند ہوں گے۔ جو شخص آٹھ سال سے مسلمانانِ ہند کے حقوق ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کرتا رہا ہو، جس نے تحفظ حقوق کے ہر موقع پر ایمان فروشی کی ہو اور جو گاندھی کے چیلوں اور راتبیوں میں داخل ہو، اس کی تحریر آپ کے لئے کیوں کر موجب برکت و افتخار ہو سکتی ہے، لیکن اب چوں کہ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مجھے تامل ہو۔ میں نے ایک دوسرے نسخے پر مطلوبہ تحریر لکھ کر بھجوادی ہے۔"

انقلاب نے یہ سب اور اس سے بھی بڑھ چڑھ کر باتیں مولانا کے متعلق لکھی تھیں۔ مندرجہ بالا اقتباس کے ایک ایک لفظ میں درد و کرب کی کتنی ہی دنیائیں پوشیدہ ہیں۔ اس پورے قصے میں مولانا کی سیرت کا ایک نہایت اہم پہلو اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ مولانا یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور غلام رسول مہر صاحب کے روحانی رشتے کا یہ تقاضا ہے کہ ترجمان القرآن کا ایک نسخہ اُن کو بھیجا جائے۔ اور اس تقاضے کو پورا کر کے انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ رہا اپنے ہاتھ سے اس پر نہ لکھنے کا معاملہ۔ اس سلسلے میں بھی ان کا تجزیہ صحیح تھا۔ مہر صاحب نے بھی اس کو محسوس کیا۔ اور اپنی مندرجہ بالا شکایت لکھ کر یہ بات واضح کردی کہ سیاسی اختلافات، خواہ ان کی نوعیت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، اور روحانی رشتہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۹۴۰ء میں پیش آیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

"لاہور سے کسی شخص نے مجھے انقلاب کا ایک کٹنگ بھیجا ہے جس میں آپ لکھتے کہ میں نے مسلمانوں پر بہتان لگایا اور قرآن کریم کی یہ آیت بھی مجھے یاد دلائی گئی ہے"

کہ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔ بہتان اگر فرد پر لگایا جائے تو سخت جرم ہے، لیکن اگر ایک مسلمان خود مسلمانوں پر لگائے، تو اس جرم کی شناعت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کی وہ رائے میری نسبت نہیں رہی ہوگی، جس کی بنا پر آپ اظہار اخلاص کرتے رہے ہیں اور یقیناً آپ یہ پسند نہ کریں گے کہ مداہنت و نفاق سے کام لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مخمصے سے آپ کو نجات دوں [یعنی اپنی مریدی کے بندھنوں سے آپ کو آزاد کردوں]۔ آپ نے اس وقت تک جو محبت و اخلاص مجھ سے رکھا ہے، اس کے لئے شکرگذار ہوں اور دعا کرتا ہوں۔"

(نقش۔ ص ۷۷۔ ۱۷۶)

مہر صاحب نے فٹ نوٹ میں اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انقلاب میں ایک تحریر شایع ہوئی تھی، جس کا اسلوب بڑا ہی افسوسناک تھا، لیکن میں اس وقت لاہور میں نہ تھا۔ بعد میں مولانا کا گرامی نامہ آیا اور میں نے وہ تحریر دیکھی۔ تو معذرت بھی کی، حقیقت حال بھی لکھی اور یہ بھی لکھا کہ آپ کو آخری فیصلے سے پہلے تحقیق فرمالینی چاہئے تھی"۔ مولانا نے اس عذر کو بھی قبول کرلیا اور یہ سلسلہ منقطع نہ ہوا۔

نقش آزاد کے وہ خطوط بھی بے حد اہم ہیں، جن کا تعلق ترجمان القرآن سے ہے۔ جب یہ کتاب شایع ہوئی تو بعض لوگوں کو عموماً اور اہل حدیث حضرات کو خصوصاً یہ شبہ لاحق ہوا کہ مولانا آزاد 'ایمان بالرسل' کو ضروری نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک اسلام کا نظام عبادت ہنگامی ہے۔ موخرالذکر گروہ نے اپنے اس خیال کی معاندانہ حد تک تشہیر بھی کی۔ اس سلسلے میں متعدد اصحاب نے مولانا کو خطوط بھی لکھے۔

غلام رسول مہر نے بھی اس معاملے کو ان سے رجوع کیا۔ مولانا نے تمام خطوط کے تفصیلی جواب دئے۔[1] اس سلسلے میں جو خطوط مہر صاحب کو لکھے گئے تھے، وہ اس مجموعے میں انھوں نے شامل کردئے ہیں۔ مہر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا جواب دیکھنے کے بعد "اپنے فہم کی نارسائی اور اپنے علم کی بے مائیگی پر حد درجہ ندامت ہوئی"۔ اس جگہ کم از کم ایک خط نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"۱۵ اپریل

عزیزی السلام علیکم، خط پہنچا۔ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ آپ کا اشتباہ

---

[1] یہ تمام جوابات، مکتبہ جامعہ نے، اب کتابی شکل میں، مولانا کے اصل خطوط کے نوٹ کے ساتھ شایع کردئے ہیں۔

سخت تعجب کا موجب ہوا۔ اگر ترجمان القرآن کے مطالعہ کے بعد آپ اس نتیجے تک پہنچے کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں اور اسلام کا نظامِ عبادت ہنگامی ہے، تو پھر میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تسلیم کر لینا چاہئے کہ ان ساری باتوں میں سے ایک بات بھی میں نے اس کے صفحات پر نہیں لکھی ہے جو مجھے لکھی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں!۔

آپ نے تفسیر فاتحہ کے خاتمہ کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس وقت از سرِ نو اس پر نظر ڈالی لیکن کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جو اس اشتباہ کا موجب ہو سکے۔ غالباً اس کا یہ جملہ موجب تردد ہوا ہے کہ اصل دین توحید ہے لیکن اگر یہ جملہ موجب تردد ہو سکتا ہے تو یقیناً قرآن کی بے شمار آیتیں بھی ہو سکتی ہیں اور عقاید و کلام کی وہ تمام کتابیں جو تیرہ سو برس کے اندر لکھی گئی ہیں کیونکہ ان سب میں یہی بات لکھی گئی ہے: ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدو الله الخ[1] وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون[2] وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاریٰ تلک امانیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ بلیٰ من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون[3] ولقد ارسلنا نوحًا الی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ الخ[4] کیا ہم ان آیات سے اور ان کی ہم معنی آیات سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ یقیناً نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی قرآن نے بے شمار مقامات پر یہ بھی بتلا دیا ہے کہ ایمان باللہ کی تفصیل کیا ہے، اور نہ صرف ایمان بالرسل بلکہ ایمان بالکتب، و بالملائکہ، و بالیوم الآخر، اس میں داخل ہے، اور اس لئے جب کبھی "ایمان" اور "عمل" کہا جائے گا تو ایمان سے مقصود یہی ایمان ہوگا نہ کہ کوئی دوسرا ایمان۔ اور "عمل" سے مقصود وہی اعمال ہوں گے جنھیں اس نے عمل صالح قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ عدم تفریق بین الرسل بھی اس میں داخل ہے۔ اور کوئی ایمان بالرسل جو تفریق بین الرسل کے ساتھ ہو، قرآن کے نزدیک ایمان نہیں وہ کہتا ہے اس زنجیر کی ایک کڑی کا انکار سب کا انکار ہے۔

پھر اگر قرآن کی ان آیات کا مطلب مقررہ و معلوم ہے تو یہ جملہ کہ اصل دین توحید ہے،

---

[1] رکوع ۱۰ سورہ النحل [2] رکوع ۲ سورۃ الانبیاء [3] رکوع ۱۴ سورہ بقرہ [4] رکوع ۱۱ سورۃ المومنون

یا اصل دین "ایمان" اور "عمل" ہے، کیوں موجب تردد ہو؟ بہ حیثیت مسلم ہونے کے ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اصل دین توحید ہے؟ یہ تو بہرحال کہنا ہی پڑے گا اس تیرہ سو برس کے اندر اصل دین کے باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آپ نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ خاتمہ کے مجمل خلاصہ کا مطلب پوری کتاب کی تفصیلات پیش نظر رکھ کر قرار دیا جاتا ہے۔ خاتمہ کی دفعات اس لئے ترتیب نہیں دی گئی ہیں کہ تمام عقاید و اعمال کی فہرست پیش کر دی جائے، بلکہ کوئی خاص مقصد پیش نظر ہے، اور اس مقصد پر زور دیتے ہوئے دکھلایا گیا ہے کہ دعوتِ قرآنی کا کیا حال ہے؟ وہ مقصد یہ ہے کہ اگر دینی صداقت کی کوئی عالمگیر حقیقت ہو سکتی ہے، تو وہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کی ہے، اور کسی طالب حق کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس دعوت سے روگردانی کر کے دینی صداقت کا مقام حاصل کر سکے۔

غالباً یہ اشتباہ اس لئے ہوا کہ کتب توحید و عقاید پیش نظر نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو میں نے لکھی ہے۔ تیرہ سو برس سے تمام مسلمانوں کا متفقہ اعتقاد یہی ہے کہ اصل دین توحید ہے، اور تمام انبیاء اسی کی دعوت و تلقین کے لئے مبعوث ہوئے۔

اچھا فرض کر لیجئے کہ یہ جملہ بجائے خود موجب تردد ہو سکتا ہے لیکن جو شخص یہ جملہ پڑھے گا یقیناً وہ تفسیر فاتحہ کے وہ تمام مقامات بھی پڑھے گا جہاں پوری تفصیل کے ساتھ دکھلایا گیا ہے کہ قرآن کے نزدیک نہ صرف انبیاء پر ایمان نہ لانا کفر ہے بلکہ کسی ایک رسول سے انکار بھی کفر ہے۔ مان لیجئے یہ مقامات بھی اس کے فہم و اذعان کے لئے کافی نہ ہوں، لیکن آخر اسی کتاب میں بقرہ کے بھی نوٹس ہیں۔ عمران، نساء، مائدہ، انعام کے بھی نوٹس ہیں۔ اور ان میں بے شمار آیاتِ ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب وغیرہا کے بارے میں موجود ہیں، نیز ان کی تشریحات ہیں۔ آخر یہ سب کچھ بغیر کسی مفہوم و معنی کے ہے؟

باقی رہا نظامِ عبادت کا مسئلہ، تو یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرانی کا موجب ہے۔ کاش آپ کسی قدر تفصیل سے لکھتے کہ کون سی بات موجب اشتباہ ہوئی ہے؟ کیا یہ بات کہ قرآن اصل دین سے شرع و منہاج کو الگ کرتا ہے، اور کہتا ہے جو کچھ اختلاف ہوا شرع میں ہوا نہ کہ اصل دین میں؟ لیکن یہ تو خود قرآن کی تصریح ہے اور ہم مسلمانوں کا سیزدہ صد سالہ عقیدہ۔ یقیناً ہمارا

اعتقاد یہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت باطل تھی، یا حضرت مسیح کے احکام باطل تھے۔
البتہ قرآن کی یہ تصریح گذشتہ کی نسبت ہے۔ جس کا اختلاف اہل کتاب بطور حجۃ کے لاتے
تھے نہ کہ آئندہ کی نسبت۔ آئندہ کے لئے اس کا اعلان معلوم ہے کہ نعمت تمام ہو چکی
اور یہ اتمام نہ صرف اصل دین میں ہے۔ بلکہ شرع و منہاج میں بھی، اور اتمام کے بعد
مزید تبدل ممکن نہیں۔ اکمال کے بعد مزید تکمیل کی گنجائش نہیں۔

ﷺ ....

ابوالکلام

غبار خاطر کے ایک مکتوب میں 'صدیق مکرم' کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے لکھا تھا کہ "میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا ہوں، تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے" (ص ۱۲۰)۔ مہر صاحب اور مولانا کی سیاسی راہیں جب مختلف ہوگئیں، تو ان کو خط لکھتے وقت بھی احتیاط کا یہ عمل مولانا برتنے لگے۔ صرف دو مواقع ایسے ضرور آئے، جب کہ احتیاط کا دامن بے اختیارانہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

ہندستان میں صرف دو صوبے ایسے تھے، جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے ماتحت، جب انتخابات ہوئے اور نئی حکومتیں بنیں، تو مولانا کی خواہش تھی کہ یہ دونوں صوبے اپنی اپنی اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کریں تاکہ ان کا یہ طرز عمل ہندو اکثریت کے صوبوں کے لئے مثال قائم کرسکے۔ صوبہ سرحد کی حکومت، جو کانگرسی تھی، اس نے بسم اللہ ہی غلط کی۔ وہاں سکھوں کے اسکولوں میں، گورمکھی رسم الخط رائج تھا، اور ان اسکولوں کو سرکاری امداد بھی ملتی تھی۔ ڈاکٹر خاں کی حکومت نے "وحدت زبان و رسم الخط کا راگ، گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرل اسکول کی سرکاری اعانت بند کردینی چاہی"۔ اس سلسلے میں انقلاب نے بھی حسب معمول خامہ فرسائی کی۔ اس کو پڑھ کر مولانا نے مہر صاحب کو لکھا کہ

> " میں کبھی آپ کو اخبار [انقلاب] کے مسائل اور روش کی نسبت کچھ نہیں لکھتا، اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں ہر شخص اپنے اخبار کی روش بہت سی مقامی و ماحولی مصلحتوں کی بنا پر تجویز کرتا ہے، اور جب تک وہ خواہش مند نہ ہو کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں

ﷺ۔ نقش آزاد۔

دینا چاہئے، لیکن بعض وقت آپ فریقانہ مخالفت کے جوش میں اتنے دور چلے جاتے ہیں کہ منطق واستدلال کی کوئی حد باقی نہیں رہتی، اور اُس محبت کی وجہ سے جو آپ سے ہے خیال ہوتا ہے کہ آپ کو ایسا تو نہیں کرنا چاہئے"۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اس معاملے کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تصور کرتے ہیں، جو فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کے مقاصد کے لئے زیادہ سے زیادہ مہلک معاملہ ہے، اور جس سے بڑھ کر شاید ہی فتنہ پردازی کی کوئی بات موجودہ سیاسی دور میں ہوئی ہو........."

مولانا مرحوم نے اس وقت جو سوال اُٹھایا تھا، اور اس سلسلے میں جن امکانات کی طرف اشارہ کیا تھا آج ہم انھیں سے دوچار ہو رہے ہیں۔

"......سوال صرف یہ ہے کہ ایک صوبے کی ایک اقلیت صحیح بنیادوں پر یا غلط بنیادوں پر، اپنے بچوں کو کسی رسم الخط میں تعلیم دینا چاہتی ہے۔ اُس کو اس کا حق ہے یا نہیں؟"

اور صوبہ سرحد کی حکومت کے طرزِ عمل کو نمونہ بنا کر

"ٹھیک اُن ہی دلائل کی بنا پر کل کو بہار، یو۔پی، مدراس، آسام اور بمبی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا، تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟"

اسی سلسلے میں مولانا مرحوم نے مسلمانوں کی نفسیات کے ایک عبرتناک پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا جو آج بھی لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔

"قرآن جا بجا اسماء اور ان کی پرستش کا ذکر کرتا ہے۔ اسماءٌ سمیتموھا انتم و اٰباءُکم۔ ٹھیک یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ چند اسماء و اعلام ہیں اور جوں ہی کسی کی زبان سے نکل جائیں، فوراً ان کی حمایت میں چیخنے لگنا چاہئے۔ باقی رہا حقیقت کا سوال، تو یہ غیر ضروری ہے۔ اسلام، حقوق، مسجد، اُردو، گائے، اور اسی طرح کا کوئی لفظ زبان سے نکل جانا چاہئے، پھر ہر مسلمان کے لئے، بلا کسی شرط ضروری ہے کہ اس کی تائید کرے، اگرچہ یہ تائید اسلام

اور مسلمانوں کے مقاصد و مصالح کی قطعاً نفی ہی کیوں نہ ہو" (ص - ۱۲۲ تا ۱۲۶)

اس سلسلے کا ایک اور خط ہے۔ خط ختم کرنے اور دستخط کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں

"ہاں آپ کے —— نے تو حد کر دی۔ میں نے تیس سال کی پبلک لائف میں بے شمار دروغ بافیاں دیکھی ہیں، خصوصاً کانگریس کی مخالفت کے سلسلے میں، لیکن جھوٹ بولنے کی ایسی بے باکانہ جرأت جیسی اس شخص نے دکھائی ہے، شاید ہی کسی نے دکھائی ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو کوئی بات، ایک خاص حد تک، یا ایک خاص شکل میں کی جاتی ہے، اور مخالف اس کا سراغ پا کر اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگتا ہے، لیکن یہ بات کہ ایک سرتاسر کذب خود اپنے جی سے گڑھ لی جائے اور اسے پوری ڈھٹائی کے ساتھ کسی پارٹی کے ذمہ دار اخبار میں شایع کرے، ایک ایسی صورت حال ہے، جس کے بعد اخلاق و شرافت میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔

"میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوں۔ یہ شخص کہتا ہے کہ ورکنگ کمیٹی نے پنجاب میں مسلمانوں میں کام کرنے کے لئے ڈھائی لاکھ کی رقم منظور کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پنجاب کے لئے کسی رقم کا نکلنا ایک طرف رہا، دو سال سے ورکنگ کمیٹی کے کسی جلسے میں پنجاب کا نام تک نہیں آیا۔ اب بتلائیے ایسی حالت میں میرے دل پر جو اثر پڑ سکتا ہے، وہ کیا ہوگا۔ کیا ایک لمحے کے لئے میں ایسے لوگوں سے کوئی حسن ظن رکھ سکتا ہوں؟ .... ڈاکٹر گوپی چند .... اپنے جی میں کیا کہتے ہوں گے؟ یقیناً یہی کہتے ہوں گے کہ ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولنے میں ذرا بھی عار نہیں۔"

اس خط کا آخری ٹکڑا خاص طور سے قابل ذکر ہے، جو مولانا کی سیرت اور ان کے سیاسی کردار کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا، جو اس وقت تھا، جب الہلال نکلتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کس عالم بیان میں، میرے قلم سے کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا

مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اُسے پبلک میں بُرا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونک اُٹھتا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے، تو خود اپنے نفس کو بُرا کیوں نہ کہوں؟ اس سے زیادہ بُرائی اور کس میں ہوگی؟ بہادر شاہ کا ایک سیدھا سادھا شعر ہے، جس میں شعریت کی کوئی بات نہیں، لیکن میرے دل پر نقش ہوگیا ہے:

نہ تھی اپنی بُرائی پہ جب کہ نظر، تو نظر میں برا تھا ہر ایک بشر

پڑی اپنی بُرائی پہ جب سے نظر، تو نظر میں کوئی بھی بُرا نہ رہا" (ص ۱۴۱، ۱۴۲)

اس کے جواب میں مہر صاحب نے مولانا کو یہ لکھا تھا کہ ممکن ہے کانگرس کا کوئی ایسا خفیہ صیغہ ہو، جس کے وجود سے آپ بے خبر ہوں اور اسی شعبے نے یہ ڈھائی لاکھ کی رقم منظور کی ہو۔ اس کے جواب میں مولانا نے جو کچھ لکھا، وہ ان کے کردار کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ فرماتے ہیں

"آپ نے میرے بیان کی صداقت کا تحفظ کرتے ہوئے جو وجہ تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ آپ لکھتے ہیں غالباً ان معاملات کے لئے کانگرس کا کوئی علیحدہ اور پوشیدہ صیغہ ہے، جس کا مجھے علم نہیں۔ عزیز من! کیا آپ سمجھتے ہیں، میں ایک لمحے کے لئے کسی ایسے ادارے میں اپنے کا ننگ گوارا کر سکتا ہوں جس کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی میرے علم سے باہر ہو؟ صرف یہی ایک بات اس کے لئے کافی ہے کہ آپ لوگ کس درجہ ناواقفیت اور غلط اندیشی کے تصورات میں غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔"

اسی سلسلے میں مہر صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "کانگرس سے آپ کی وابستگی کی کوئی شق سمجھ میں نہیں آتی"۔ اس کے جواب میں مولانا نے لکھا

"عزیز من! اگر آپ کو عقائد و افکار کی اس دنیا سے، جس میں میں تیس سال سے زندگی بسر کر رہا ہوں، اس درجہ بعد ہوگیا ہے کہ اگر آپ میرے کانگرس میں ہونے کی کوئی وجہ نہیں محسوس کر سکتے، تو میرے لئے ناممکن ہے کہ کوئی وجہ آپ کو بتلا سکوں۔

اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ میرے خطوط رکھتے ہیں یا ضائع ہوجاتے ہیں۔ بہرحال یہ خط کہیں سنبھال کر

رکھ دیجئے۔ میری زندگی کا بڑا حصہ گزر چکا ہے، جو باقی ہے وہ بہت کم ہے، ممکن ہے کہ میں اس وقت تک نہ رہوں لیکن یہ سطور باقی رہ سکتی ہیں۔ ایک وقت عنقریب آئے گا اور وہ میری 'وابستگی' کی علت آشکار کر دے گا" (ص ۱۳۴ - ۱۳۷)

'نقش آزاد' سے مولانا مرحوم کی علمی زندگی کے بعض اہم گوشے بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔ اگر یہ مکتوبات، جو نقش آزاد میں شامل ہیں، شایع نہ ہوتے، تو شاید کم ہی لوگوں کو اس کا اندازہ ہوتا کہ تاریخ ہند پر مولانا کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ اور کم از کم میرا شمار تو ان ہی لوگوں میں ہوتا۔ ابھی چند ہی روز کی بات ہے کہ اختر راے پوری صاحب نے، جو آج کل پیرس میں مقیم ہیں، مجھ سے کہا کہ انھوں نے کسی اخبار میں پڑھا ہے کہ نانا کے دست راست عظیم اللہ خاں کی ایک ڈائری ہے، جو حال ہی میں گورنمنٹ آف انڈیا نے حاصل کی ہے۔ اختر راے پوری صاحب اس کی نقل چاہتے تھے۔ میں نے اس کا پتہ لگانے کی کوشش کی، تو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) کے ایک ذمہ دار عہدہ دار نے مجھے بتلایا کہ عظیم اللہ خاں کے کسی عزیز کے پاس وہ ڈائری ہے اور اس نے یہاں بھیجی تھی، لیکن مولانا صاحب نے اس کو دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ جعلی ڈائری ہے۔ اور وہ واپس کر دی گئی۔ میں اس ڈائری کو دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا، اس لئے مجھے یہ معلوم کر کے سخت مایوسی اور تکلیف ہوئی، اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ "مولانا ۱۸۵۷ء کے متعلق کیا جانتے تھے؟" میرا یہ جملہ میرے مخاطب کو سخت ناگوار ہوا۔ اس نے کہا کہ "تم آج جو کچھ کہہ رہے ہو، مولانا کی زندگی میں یہ کہنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی تھی؟" اور وہ اس وقت خاموش ہو گیا۔ پھر اسی نے ایک اور موقع پر مجھے بتلایا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ایک ایک گوشے سے مولانا اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد نقش آزاد پڑھ کر اپنی خام خیالی پر مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء پر میں نے بہت پڑھا تھا۔ اور جو کتابیں میں نے نہیں بھی پڑھی ہیں، وہ میرے علم میں تھیں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مولانا کے خطوط نے میری معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

اسی طرح ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے سلسلے میں بھی مولانا مرحوم نے جن کتابوں کے نام گنائے ہیں، ان میں سے اکثر کے وجود سے بھی لوگ واقف نہ ہوں گے۔ انگریزی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"ضمناً ٹیپو سلطان کا ذکر فرنچ اور عربی کی بعض کتابوں میں بھی آگیا ہے، اور

میری نظر سے گزرا ہے ...... فرنچ میں کئی کتابیں حیدر علی اور ٹیپو کے حالات میں لکھی گئی ہیں، جن کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی ماہر سے اس بارے میں خط و کتابت کی جائے۔ بہتر ہوگا کہ مونشیر فلیچر سے خط و کتابت کیجئے، جو نیشنل لائبریری پیرس کے مہتمم ہیں۔"

اسی سلسلے میں ایک جگہ مولانا نے یہ بھی بتایا ہے کہ ٹیپو سلطان کے خاندان کے جو افراد کلکتے میں مقیم تھے، وہ مولانا کے والد مولوی خیرالدین مرحوم کے مرید تھے۔ لکھتے ہیں

"ٹیپو سلطان کے خاندان کے قبضے میں چند کتابیں اور بھی تھیں۔ یہ لوگ چوں کہ والد مرحوم کے مرید تھے، اس لئے گھر میں آتے رہتے تھے، اور بچپنے کی بات یاد ہے کہ کئی قلمی کتابوں کا ذکر کرتے تھے لیکن بعد کو جب مجھے خیال ہوا، اور ان کتابوں اور یادداشتوں کو دیکھنا چاہا تو انقلاب حال نے سارا کارخانہ درہم برہم کر دیا تھا۔ کوئی چیز بھی کسی کے قبضے میں باقی نہیں رہی تھی۔" (ص - ۱۰۴ و ۱۰۵)

ادبی اعتبار سے نقش آزاد کا وہ حصہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، جو مرزا غالب کے حالات اور ان کی شاعری سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں غالب کے بعض معاصرین کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے۔ نقش آزاد کا یہ حصہ ایک مستقل اور طویل مضمون کا مطالبہ کرتا ہے۔ بعض پہلو تاریخی بحث کے محتاج ہیں۔ "غالب مولانا ابوالکلام آزاد کی روشنی میں" ایک اچھا مضمون بن سکتا ہے، جس کے لئے یہاں گنجائش نہ نکل سکے گی۔ لیکن ضمناً بعض باتوں کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ بیسویں صدی میں غالباً وہ پہلے نقاد تھے، جس نے غالب کی شاعری اور غالب کی زندگی کا نئے زاویے سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے الہلال (جلد ۴ - نمبر ۲۴ - ۱۷ جون ۱۹۱۴ء) میں مرزا غالب پر ایک اڈیٹوریل لکھا، جس کا عنوان تھا۔

"اسمٰار علیہ خطیۃ ــــ مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام - مصائب غدر قلعہ معلیٰ کی تباہی وفاداری و بغاوت کی ایک قدیمی حکایت"

مولانا لکھتے ہیں کہ

"مرزا غالبؔ مرحوم کا سالِ وفات "آہ غالبؔ بمرد" ہے یعنی ۱۲۸۵ ہجری۔ اس لحاظ سے فی الحقیقت ان کا شمار موجودہ عصرِ جدید کے عہد میں ہونا چاہئے۔ ہندستان میں پریس سترھویں صدی عیسوی [اٹھارویں ؟] کے اواخر میں رائج ہو چکا تھا..... پس ان کو اپنی تصنیف و تالیف کے لئے ابتدا ہی سے پریس موجود ملا، اور اپنے حاصلِ عمر کو اشاعت و طباعت کے لئے غیروں پر چھوڑ کر دنیا سے چلے جانے کی مصیبت سے دوچار نہ ہونا پڑا، جو فی الحقیقت کسی صاحبِ کمال کے لئے زمانۂ گذشتہ میں سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جانکاہ صدمہ رہا ہے۔"

پریس کے سلسلے میں مولانا نے یہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ غالبؔ کی زندگی میں پریس ہندستان میں عام ہو چکا تھا، اور یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس دور میں پریس سے جس قدر فائدہ مرزا غالبؔ نے اٹھایا ہے، اس کی دوسری مثال ان کے ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتی۔ مرزا کی ذہانت کا یہ بھی ایک بڑا ثبوت ہے کہ وہ پروپگنڈے کے جدید فن (Technique) سے پوری طرح پر واقف تھے اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ انھوں نے اس فن کو برتا ہے۔

الہلال کے متذکرہ بالا ایڈیٹوریل کے مطابق مرزا غالبؔ کا اردو دیوان "غالباً پہلے مطبع اودھ اخبار میں، اور پھر مکرر سہ کرر دہلی و لکھنؤ" سے شائع ہوا ــــ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مطبع اودھ اخبار ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا۔ لیکن غالبؔ کا دیوان اس سے سترہ اٹھارہ سال قبل ۱۸۴۱ء میں دہلی میں سید محمد خان بہادر کے لیتھو گرافک پریس میں، شہر شعبان سنہ ۱۲۵۷ ہجری مطابق ۱۸۴۱ء کو سید عبدالغفور کے اہتمام میں چھاپا ہوا تھا۔ یہی غالبؔ کے اردو دیوان کا پہلا اڈیشن تھا، اور مندرجہ بالا عبارت اسی دیوانِ غالب کے سرورق سے نقل کی گئی ہے۔

الہلال ہی غالباً پہلا اخبار یا رسالہ تھا جس میں پہلے پہل غالب کی متعدد غیر مطبوعہ غزلیں اور ایک غیر مطبوعہ اردو قصیدہ شائع ہوا، جو لفٹننٹ گورنر پنجاب کی مدح میں لکھا گیا تھا۔

مہر صاحب نے جب اپنی کتاب "غالب" شایع کی، تو مولانا نے جی کھول کر ان کی محنت و کاوش کی داد دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ

"مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ایک مکمل سوانح عمری لکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ خیال ہوتا تو

بہت سی باتیں آپ کو لکھ کر بھیج دیتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہر تیسرے چوتھے ورق کے بعد ایسے مقامات آئے۔ میرے لئے اس طرح کی معلومات کا زبانی کہہ دینا آسان ہے، لکھنا مشکل ہے۔ تاہم کوشش کروں گا کہ پہلی فرصت میں بعض ضروری باتیں لکھ بھیجوں تاکہ دوسرے اڈیشن میں کام آئیں۔ (ص ۱۰۴)۔

اسی سلسلے کے ایک خط میں مولانا نے اپنے ابتدائی دور کے بعض حالات بھی قلم بند کر دئے ہیں، جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یادگار غالب میں مولانا حالی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ غالب کی نوعمری میں ان کے کچھ اشعار میر تقی میر تک پہنچے، جن کو سن کر انھوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اگر استاد کامل مل گیا تو یہ لاجواب شاعر بن جائے گا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

"میر تقی میر والی حکایت مندرجہ یادگار غالب عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیں .. ..

اسی طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا لیکن محض رفع غرابت کے لئے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا ہے۔ سنہ ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء کی بات ہے۔ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنج بہار" نکالا کرتے تھے، ایک گلدستہ ارمغان فرخ کے نام سے نکالا، اور کلکتے میں بعض شعرا اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

"میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعر ان مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضایع نہیں کئے ہیں:

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی ۔۔۔ نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گرد باد، تو ہے شامیانہ گرد ۔۔۔ شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ ۔۔۔ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

"یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس وقت انھیں لغویات نے لوگوں کو

متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی جبکہ چھتیس برس گزر چکے ہیں [یہ خط دسمبر ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا] اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں، جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب ارمغان فرخ میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی، اور زندگی میں پہلی بار اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

”اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے، انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں، میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے، جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے، ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں، وہ غزل کے لئے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا، امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین بتلا دی۔ یاد نہ ہو۔ شاد نہ ہو۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دئے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

”کہنے لگے“ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی“۔ اس وقت سوچتا ہوں تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کل کی بات ہو۔

”پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ مخزن نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں چند تحریریں بھیجیں۔ لکھنؤ سے نوبت رائے نظر خدنگ نظر نکالتے تھے۔ اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انھیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کر دیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمہ لے لی۔ اسی زمانے میں مولوی احمد حسن مرحوم فتحپوری نے کلکتہ سے احسن الاخبار اور تحفۂ احمدیہ نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہئے۔ چناں چہ لسان الصدق

جاری کیا۔ یہ تمام معاملات ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء کے ہیں، اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

"تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چوں کہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصے تک درس دینا بھی ضروری سمجھتا تھا تاکہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں، وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ پختہ ہو جائیں۔ اس لئے والد مرحوم نے چند طلباء کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا۔ ان میں قندھار کے ایک خاں صاحب تھے، جن کی داڑھی میری قد سے بھی دراز تھی۔

"اسی زمانے میں تقریر کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۰ء میں کی، اس وقت عمر پندرہ تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔"

(ص ۱۰۷ تا ۱۱۹)

انڈیا ونس فریڈم

غلام رسول مہر صاحب نے یا کسی اور صاحب نے مولانا کے سوانح مرتب کرنے کا ارادہ کیا، تو اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ سوانح حیات مرتب کرنے کے لئے "قدرتی راہ یہی ہے کہ موت کا انتظار کیا جائے۔ جب تک میری زندگی مجھ میں اور لوگوں میں حائل ہے، شاید وہ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ صحیح وقت اس کا میرے بعد آئے گا، کیوں نہ اس کا انتظار کیا جائے۔"

یہ الفاظ پتھر کی لکیر بن گئے۔ خود مولانا نے جب اپنے سوانح مرتب کرنے کا ارادہ کیا، تو پہلی جلد سے آگے نہ بڑھ سکے، اور اس کی اشاعت سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انڈیا ونس فریڈم، مولانا کے خود بیان کردہ حالات ہیں۔ زبان مولانا کی نہیں بلکہ ہمایوں کبیر صاحب کی ہے، جن کا کہنا یہ ہے کہ مولانا نے انتقال سے قبل اس پر نظر ثانی کی تھی، اور ایک نہیں بلکہ دو مرتبہ اس کو دیکھا تھا۔

اس کتاب کا ایک قابل ذکر اور اہم پہلو یہ ہے کہ مولانا نے اس میں اپنے کچھ ابتدائی حالات بھی قلم بند

کئے تھے، جو ابتک منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ مثلاً ہم کو پہلی بار یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی اس دہشت پسند تحریک سے مولانا نے باضابطہ تعلق قائم کرلیا تھا، جو تقسیم بنگالہ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح مولانا نے پہلی بار کھل کر یہ کہا تھا کہ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے مشرق وسطی کا سفر کیا تھا بلکہ فرانس تک گئے تھے۔ مولانا کے اس سفر نے اردو کے اخبار و رسائل میں ایک عرصے سے نزاعی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور اس کا سلسلہ مولانا کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ اس پر تفصیلی بحث آگے چل کر کی جائے گی۔

کتاب کے پہلے باب میں، جو صرف بارہ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا نے اپنے ابتدائی حالات، الہلال، تحریک خلافت و ترک موالات اور دوسرے متعلقہ مسائل کا صرف اجمالی ذکر کیا ہے۔ یہ باب بڑی حد تک تشنہ رہ گیا ہے۔ اس باب میں بعض شدید غلطیاں بھی جگہ پاگئی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۶ پر ۱۹۰۸ء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ "مصر میں مصطفےٰ کمال کے متبعین سے میری ملاقات ہوئی"۔ یہ مصطفےٰ کمال نہیں بلکہ مصطفےٰ کامل ہے۔ کیوں کہ یہ مصطفےٰ کمال سے پہلے کی بات ہے۔ مصر میں مصطفےٰ کامل کے متبعین سے ان کی یقیناً ملاقات ہوئی ہوگی جو اس وقت مصر کی سیاست میں دخیل ہو رہے تھے۔ ہمایوں کبیر صاحب نے غلطی سے مصطفےٰ کامل کو مصطفےٰ کمال سمجھ لیا ہے۔

اسی طرح صفحہ ۱۰ پر الہلال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ دو ہزار کی پہلی ضمانت کی ضبطی کے بعد دس ہزار کی دوسری ضمانت مانگی گئی اور "وہ بھی جلد ہی ضبط ہوگئی"۔ اس جگہ مولانا کے حافظے نے غلطی کی ہے۔ دس ہزار کی ضمانت جمع ہی نہیں کی گئی اور الہلال بند ہوگیا۔ اس کے سال بھر بعد البلاغ جاری ہوا۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریک تفصیلی تجزیہ کی محتاج تھی اور پھر ان تحریکوں کے جلو میں جو فرقہ وارانہ تحریکیں پیدا ہوئیں اور جنھوں نے ہماری سیاسی زندگی کو زہر آلود کردیا تھا، مولانا نے ان کی طرف مبہم اشارے بھی غیر ضروری سمجھے۔ اسی طرح نہرو رپورٹ اور گول میز کانفرنس کا بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ان فروگذاشتوں کی متعدد تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا نے اپنے سوانح مرتب کرنے کا جو خاکہ مرتب کیا تھا، وہ ایک نہیں بلکہ تین جلدوں کا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بعض جگہ مولانا نے لکھا ہے کہ اس مسئلے پر میں دوسری جلد میں بحث کروں گا، کرشنا مینن کے معاملے کو انھوں نے تیسری جلد کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کا مرکزی موضوع مولانا کی صدارت کا عہد تھا، جو غیر معمولی حد تک طویل اور ہماری سیاسی تاریخ کے اہم ترین حالات و واقعات کا حامل تھا۔ مولانا کی صدارت ہی کے دور میں برطانوی حکومت نے ہندستان کی آزادی کے اصول کو تسلیم کرلیا تھا، اس لئے قدرتاً ہندستان کی آزادی اور تقسیم وطن کے

حالات کا بھی ایک حد تک تفصیلی ذکر آ گیا ہے ۔

اس کتاب میں جتنے واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ سب، بہ استثنا چند، معلوم عوام تھے لیکن ان کی ضمنی تفصیلات نئی ہیں ۔ مولانا نے واقعات کا تجزیہ بھی بڑی بے باکی و بے لاگی سے کیا ہے جس نے کتاب کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے، اور یہی اس کا اصل کارنامہ ہے، اس کو لوگوں نے بم کے گولے اور ڈائنامائٹ سے تعبیر کیا ہے ۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد دہلی کے ایک انگریزی روزنامے نے، جو بعض وجوہ کی بنا پر جواہرلال نہرو کا مخالف ہے، اپنے پہلے صفحے پر پہلی خبر یہ چھاپی کہ مولانا آزاد نے جواہرلال نہرو کو تقسیم ہند کا ذمے دار قرار دیا ہے ۔ اس بیان کا حقیقت سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا کہ بتوں کو کعبے سے ۔ اس دروغ بافی کا ایک اچھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اور اس کا دوسرا اڈیشن بھاری تعداد میں شائع کرنا پڑا۔ پچھلے چند برسوں میں کسی کتاب کی اس تیزی سے ہندوستان میں کھپت نہیں ہوئی تھی، جیسی کہ اس کتاب کی ہوئی۔

اردو اخبارات نے اقتباسات کی آڑ میں اس کتاب کے بیشتر اور اہم حصے شائع کر دئے ہیں، جس نے اس ملک کے اردو داں طبقے کو بڑی حد تک اس کی روح سے آشنا کر دیا ہے ۔ اس لئے کتاب کے اقتباسات اس جگہ پیش کرنا تحصیل حاصل ہے ۔ اس کا اردو ترجمہ بھی عنقریب شائع ہو رہا ہے ۔ اردو ترجمہ ایک طویل مقدمے کا بھی محتاج ہے، جو اس کتاب میں یقیناً شامل نہ ہوگا۔ اس لئے کتاب کو بے حد احتیاط کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہوگی ۔

اس کتاب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تشنۂ تحقیق کی راہیں کھولی ہیں ۔ پچیس تیس سال کے بعد جب حکومت کے سرکاری کاغذات عام استفادے کے لئے کھولے جائیں گے، تو اس کتاب کو سامنے رکھ کر ان کاغذات کا جائزہ لیا جا سکے گا اور پوری صورت حال سمجھی جا سکے گی ۔ اگر یہ کتاب شائع نہ ہوتی تو کام آسان نہ ہوتا اور ممکن ہے کہ اکثر و بیشتر محققین کی نظریں ان گوشوں کی طرف سرے سے اٹھتی ہی نہیں جن کی طرف مولانا نے اشارے کئے ہیں ۔

ایک عظیم بہتان کی تردید

اس سلسلے کی تیسری قابل ذکر کتاب "آزاد" (انگریزی) ہے، جس میں ہندستان، مغربی ایشیا اور یورپ بیں بائیس مستند اہل قلم حضرات نے مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کے مرتب بھی ہمایوں کبیر تھے۔

اس جگہ ان تمام مقالات کا تفصیلی یا اجمالی ذکر کرنا مقصود نہیں ہے جو اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں، بلکہ صرف ایک مقالے کی طرف اشارہ کرنا ہے، جو مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو لوئی ماسی نوں (Louis Massignon) نے "مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں" کے عنوان سے لکھا ہے۔ غیر اردو داں طبقہ اس مقالے کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے گا، لیکن اردو داں طبقے کے لئے یہ مقالہ ایک اہم ترین دستاویز ہے، کیوں کہ اس مقالے سے ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے، جو بعض حضرات نے ارادتاً پیدا کی ہے۔

غبار خاطر کے صفحات میں مولانا مرحوم نے پہلی بار اس واقعے کا بر سبیل تذکرہ اظہار کیا تھا کہ اوائل عمر میں انھوں نے عراق، ایران، لبنان اور مصر کا سفر کیا تھا۔ ان کے سیاسی مخالفین نے ان کے اس بیان کو غلط سمجھ کر لمبے لمبے مضامین لکھے اور جی کھول کر مولانا کو گالیاں دیں۔ بعض حضرات نے معاندانہ لب ولہجہ میں سوالنامے شایع کئے۔ ان سب کے جواب میں، حسب عادت، مولانا نے سکوت اختیار کیا۔ ملیح آبادی صاحب نے مولانا کی وفات کے بعد جب "آزاد کی کہانی" شایع کی، تو اس میں بھی اس سفر کا ذکر موجود تھا۔ اس کتاب پر ایک صاحب نے "الفرقان" میں طویل تبصرہ شایع کیا، اور مولانا کے اس بیان کو مشتبہ قرار دیا۔ ہندستان کے اکثر اخبارات نے اس تبصرے کو نقل کر کے اس بہتان کی تشہیر بھی کی۔ مولانا کے بعض معتقدوں نے بھی ان کے بیان کو مشتبہ سمجھا۔

یہ سب طوفان جب برپا ہو چکا تو "آزاد" میں موسیو لوئی ماسی نوں کا متذکرہ بالا مقالہ شایع ہوا، جس سے مولانا کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں مغربی ایشیا کا سفر کیا تھا۔ موسیو میسگنوں لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد سے

> "۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں پہلی بار میری ملاقات بغداد میں ہوئی۔ مسجد مرجان میں ہم لوگ شیخ آلوسی کے یہاں ملے ...." (آزاد۔ ص ۱۷)

مولانا کے بیان کی صداقت کا یہ ایک دستاویزی ثبوت ہے، جس کے بعد شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اہم تاریخیں

۱۸۸۸ پیدائش ۔ مولد و منشاء تفویت وادی غیر ذی زرع ، عند بیت اللہ الحرام

۱۸۹۰ ہندستان میں ورود اور کلکتے میں قیام

۱۹۰۲ مخزن میں پہلا مضمون لکھا

۱۹۰۳ لسان الصدق کا اجرا

۱۹۰۴ انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے جلسے میں پہلی تقریر کی

عراق کا سفر ۔ لسان الصدق بند ہوگیا

۱۹۰۵ (؟) الندوہ کی اڈیٹری

تا

۱۹۰۶ بنگال کی دہشت انگیز جماعت سے تعلق پیدا ہوا ۔

وکیل امرتسر کی اڈیٹری کی

۱۹۰۸ مغربی ایشیا اور فرانس کا سفر

۱۹۱۲ الہلال کا اجرا

۱۹۱۳ الہلال پریس سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی

۱۹۱۴ ضمانت کی ضبطی ، دس ہزار کی دوسری ضمانت کا مطالبہ ۔ الہلال بند ہوگیا

۱۹۱۵ البلاغ کا اجرا

۱۹۱۶ نظر بندی ۔ البلاغ بند ہوگیا ۔ نظر بندی قید میں تبدیل کر دی گئی

۱۹۱۹ تذکرہ شایع ہوا

۱۹۲۰ رہائی ۔ تحریک خلافت و ترک موالات

۱۹۲۱ دوبارہ گرفتاری

۱۹۲۳ رہائی

کانگرس کے اجلاس دہلی کی صدارت

۱۹۳۰ نمک کی ستیہ گرہ

لہ تاریخوں کی ترتیب کے سلسلے میں "انڈیا ونس فریڈم" ، "آزاد کی کہانی" اور "غبار خاطر" کو پیش نظر رکھا گیا ہے

کانگریس کے قائمقام صدر

گرفتاری

۱۹۳۱ ترجمان القرآن کی اشاعت

۱۹۳۲ گرفتاری

۱۹۳۷ صوبائی کانگریس حکومتوں کا قیام

کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی ممبری

۱۹۳۹ دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز

۱۹۴۰ رام گڑھ کانگریس کی صدارت

گرفتاری

۱۹۴۱ رہائی

۱۹۴۲ کرپس مشن کی آمد

مشن سے گفت وشنید کے لئے کانگریس کے واحد نمائندے منتخب ہوے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ۹ راگست کی تجویز "ہندستان چھوڑدو"

۱۰ راگست کو گرفتاری

۱۹۴۵ رہائی

۱۹۴۶ غبارِ خاطر کی اشاعت

کیبنٹ مشن کی آمد۔

مشن سے گفت وشنید۔

۱۹۴۷ کانسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کا قیام، اور اس کی ممبری

انٹی ریم گورنمنٹ کا قیام۔

۱۵ راگست کو ہندستان کی آزادی

آزاد ہندستان کی پہلی حکومت میں وزارت کا عہدہ قبول کیا

۱۹۵۱ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوے

۱۹۵ آزاد ہندستان کے پہلے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے
ہندستان کی پہلی منتخبہ حکومت میں وزیر تعلیم کا عہدہ قبول کیا

۱۹۵۰ وزیر تعلیم کی حیثیت سے یورپ اور مغربی ایشیا کا دورہ کیا

۱۹۵۰ دوسرے عام انتخابات میں دوبارہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے
دوبارہ وزیر تعلیم مقرر ہوئے

۱۹۵۰ ۱۵ فروری کو انجمن ترقی اردو ہند کے اجلاس دہلی میں آخری تقریر کی
۲۲ فروری کو وفات پائی اور دہلی میں اسی جگہ مدفون ہوئے جہاں آخری تقریر کی تھی۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

(رومی)

آزاد، ایک صحافی

الہلال اور البلاغ: ہندستانی اخبار نویسی کا ایک اہم باب

از عابد رضا بیدار

اس مقالہ میں ہندوستان کے ایک عظیم صحافی کے تجزیاتی مطالعہ کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک حصہ الہلال اور البلاغ کے ایڈیٹر کے ذہنی تجزیہ کے لئے وقف ہے؛ دوسرے حصہ میں تفصیلی اشاریہ دیا گیا ہے جس میں غیر اہم مندرجات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ضمیموں کے عنوان سے تیسرا حصہ صحافت، متعلقات صحافت، ٹائپ اور لیتھو، الہلال کی تحریک جماعت حزب اللہ، اور الہلال کی اہمیت کے بارے میں مولانا کے اپنے بیانات پر، بالکل آخری وقت میں طوالت کے سبب انھیں روکنا پڑ گیا۔ ان عنوانات پر میرے مقالہ کی تشنگی کی یہی معذرت ہے۔

ملت، قوم، وطن، اسلام، مذہب اور سیاست کے بارے میں ایڈیٹر الہلال کے تصورات کا تجزیہ تفصیل طلب کام ہے۔ میں نے اپنے مطالعہ کے نتائج صرف اشارۃً ہی پیش کئے ہیں۔

(عابد رضا بیدار)

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک شبلی کے 'الندوۃ' کے مددگار ایڈیٹر رہنے کے بعد[1]، مولانا نے امرتسر پہنچ کر اس زمانہ کے مشہور اخبار 'وکیل' کی ادارت سنبھالی۔ وکیل کے مالک غلام محمد جوہر شناس تھے صحافت کی دنیا میں 'ابوالکلام اور عمادی' یہ دو نام باقاعدہ طور پر انھیں نے روشناس کرائے۔ غالباً 'وکیل' میں کام کرنے کے دوران میں ہی مولانا کو اس بات کا احساس ہوا کہ اخبار نویس کے ذہن اور قلم کو مکمل آزاد ہونا چاہیے اور یہ بات جب ہی ممکن ہے کہ اخبار اس کی اپنی ملکیت میں ہو۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء تک وہ ایک معیاری، نفیس، ٹائپ میں چھپنے والے، اخبار کا

[1] مکاتیب شبلی: ۱، ص ۲۶۳؛ حیات شبلی ص ۱۲؛ ضمیمہ - ۱

خواب دیکھتے رہے۔ اس عرصہ میں علمی اور صحافتی حلقوں میں یہ بات پھیل چکی تھی اور لوگ ہمہ تن انتظار تھے[۵۲] مئی - جون ۱۹۱۰ء میں اخبار کے لئے دو ناموں میں سے ایک کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا: 'ملک و ملت' یا 'وقت'۔[۵۳] جولائی میں صرف 'ملک و ملت' نام لیا جارہا تھا اور معلوم ہوتا تھا چند ہی روز میں نکلنے والا ہے[۵۴] شبلی کی رائے تھی کہ "اخبار کا نام نہ ملک و ملت موزوں ہے نہ وقت؛ ایک مطول ہے، اور ایک زائد از ضرورت مختصر۔ صرف آزاد نام ہونا چاہیئے"[۵۵]۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو یہ اخبار الہلال کے نام سے کلکتہ سے شائع ہوا، جو چھ سات برس کے خوابوں کی حسین، معیاری اور حسبِ دلخواہ تعبیر تھی!

رائل سائز کے ۱۶ صفحات پر مشتمل، یہ دو کالمی، ہفت روزہ اخبار کئی اعتبار سے اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ پہلی بار ایک سیاسی نوعیت کا پرچہ حسن صورت اور حسن سیرت سے مرصع ہو کر نکلا تھا۔ اُردو صحافت میں ٹائپ، کی روایت بالکل نئی نہیں تھی؛ علی گڑھ تحریک کا سارا بنیادی کام ٹائپ میں چلا تھا۔ الہلال نے ٹائپ کی خوبصورتی کی طرف بھی توجہ دی اور اخبار کو مصور بھی بنایا۔ ترتیب میں بنیادی طور سے سیاسی پرچہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ایک ہمہ گیر انداز تھا جس میں علمی، ادبی، لسانی، تہذیبی؛ مذہبی اور تاریخی موضوعات و مباحث بھی شامل تھے۔ ایڈیٹر کو ایڈٹ کرنے کا سلیقہ آتا تھا؛ الہلال سے پہلے اسی راہ میں برسوں دشت نوردی کرنے کا تجربہ تھا، جو یہاں کام آیا[۵۶]

عرب ماحول کے پروردہ، مولانا نے اپنے شعور کی ابتدائی منزلیں مصر میں طے کیں اور قیام مصر نے ان پر بے اندازہ اثر چھوڑا۔ ۱۹۰۱ - ۱۹۰۵ء میں ندوۃ العلما میں قیام رہا جہاں عربی ماحول کے ساتھ مصر کی علمی دنیا سے بھی وابستگی رہی۔ جب الہلال نکلا تو نہ صرف نام بلکہ پیٹرن (PATTERN) تک مصری صحافت سے مستعار لیا۔ مصر میں ٹائپ میں چھپنے والے مصور پرچے عام تھے۔ انھیں میں جرجی زیدان کا 'الہلال' بھی تھا، جو نام کے ساتھ پوری ترتیب میں بھی ہندستانی 'الہلال' کے لئے نمونہ بنا۔ پھر ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے بعد ترکی میں بھی صحافت قدرے آزاد ہو چکی تھی اور وہاں کے اخبار و رسائل بھی ترتیب و تہذیب میں مصری نمونہ پر چل رہے تھے۔ لبنان میں بیروت سے نکلنے والے چند پرچے اسی انداز پر شائع ہوتے تھے (انھیں میں ایک 'البلاغ' بھی تھا؛ الہلال بند ہونے کے بعد نیا نام البلاغ یقیناً اسی پرچے سے لیا گیا ہوگا)۔ یہی ترکی اور عربی اخبار الہلال کا پس منظر بھی تھے اور اس کی ترتیب و تہذیب کا سرچشمہ بھی۔

---

[۵۳] تبصرہ، مسلم گزٹ، ۲۴ جولائی، ۱۹۱۲ء؛ مکاتیب شبلی: ۱ صفحہ ۲۰۳ [۵۴] مکتوب شبلی مورخہ ۱۲ جون، مکاتیب۔ ۱ صفحہ ۲۰۴ [۵۵] مکتوب شبلی مورخہ ۱۸ جولائی مکاتیب۔ ۱ صفحہ ۲۰۳ [۵۶] ۱۸۹۹ء میں گلدستہ شعر و سخن نکالا؛ یہ ۸ ماہ چلا۔ ۱۹۰۰ء میں پہلا اخبار المصباح ایڈٹ کیا، یہ تین ماہ چلا۔ مولوی احمد حسین کا 'احسن الاخبار' ترتیب دیا؛ خدنگ نظر کا نثر کا حصہ کچھ عرصہ ایڈٹ کیا؛ پندرہ روزہ 'لسان الصدق' نکالا جو ۱۶ ماہ بعد بند ہو گیا۔ یہ ۱۹۰۴ء تک کی بات ہے پھر ۱۹۰۸ء تک 'الندوہ'، 'وکیل' اور 'دار السلطنت'۔ (حسن نظامی: اتالیق خطوط نویسی؛ ملیح آبادی: "آزاد کی کہانی"؛ مہر: "نقش آزاد" صفحہ ۱۵)

ہندستانی، عربی اور ترکی ادب وصحافت سے عام طور سے ناواقف تھے اس لئے الہلال بالکل نئی چیز معلوم ہوا اور اپنے انوکھے پن کے سبب معاصرین میں ممتاز ترین حیثیت اختیار کر گیا۔

مولانا کے بعض پرستاروں نے الہلال کے تیز و تند اسلامی رنگ کو بھی اس کی ایک نمایاں خصوصیت قرار دیا ہے۔ اول تو یہ رنگ اسلامی نہیں بلکہ 'پان اسلامی' ہے؛ اور پھر یہ رنگ کچھ الہلال ہی سے مخصوص نہ تھا؛ الہلال کے اکثر معاصرین اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے،

وکیل، زمیندار، مسلم گزٹ، پیسہ اخبار، مشرق، حبل المتین، مسلمان، الحکم، الحق، وطن، ہمدرد اور انگریزی کا کامریڈ، سب کے سب پان اسلامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے؛ اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں لکھتے وقت الہلال کا انداز ان اخباروں سے بالکل مختلف نہ تھا۔ الہلال کی اصل خصوصیت مولانا کا مخصوص انداز تحریر تھا؛ جذباتی قسم کا اسلوب بیان، جس میں تحریر میں خطابت کی شان نظر آتی تھی۔ جملوں اور لفظوں کے تو وہ بادشاہ تھے اور محض ترتیب کے اُلٹ پھیر سے اپنی تحریروں میں وہ گرمی پیدا کر دیتے تھے، جس کی آنچ مدھم ہوتے ہوتے بھی پڑھنے والے کے شعور کو بے بس کر جاتی تھی۔ اس کے لئے وہ کبھی ایک ہی بات کو ایک یا کئی پیراگراف تک پھیلا دیتے، اور ایک خطیب کے انداز پر کسی ایک نکتہ کی وضاحت کے لئے تابڑ توڑ جملے شروع کر دیتے: ایک جملہ پھر دوسرا، پھر تیسرا! اور اب بھی انھیں اپنی کامیابی پر شک ہوتا تو اسی بات کو دور تک پھیلا دیتے۔ اور جب بات ختم کر لیتے تو فتحمندی کے احساس اور اعتماد سے بھرپور، سرشاری کے عالم میں اس پیراگراف، کالم یا مضمون کو کسی قرآنی آیت، کسی فارسی یا اردو کے شعر یا کبھی کبھی کسی عربی کے شعر پر ختم کر کے ابتک کے پیدا کردہ تاثر کو کئی گنا لطیف اور جاں نواز بنا جاتے!

ایک نئی پرجوش تحریک کے ساتھ، لکھنے کا یہ اسلوب، اُردو نثر کو ایک نئی دین تھی، جس میں بڑی جان تھی؛ شگفتگی تھی کہ الفاظ رنگیں سے ٹپکی پڑتی تھی؛ مردانہ وقار تھا اور فتح کر لینے کا انداز؛ چھا جانے والی ادا!

یہاں تک پہنچ کر مولانا کے منفرد انداز بیان کے سرچشمے کی بات چھڑ تی ہے اور ساتھ ہی ان کی فکر کے عناصر ترکیبی کی بھی: الہلال نکلنے سے ٹھیک تیس سال قبل الہلال کے شہر کلکتہ میں معاصر اسلامی دنیا کی عظیم ترین شخصیت، سید جمال الدین افغانی نے چند ماہ گزارے[۴۰]، اور دو سال بعد پیرس پہنچ کر اپنے شاگرد اور دوست، مصری عالم محمد عبدہ،

---

[۴۰] یہ ۸۲-۱۸۸۱ء کی بات ہے، جب اعرابی پاشا کی قیادت میں مصر میں آزادی کے لئے پہلی بغاوت ہوئی تھی۔ یہ جنگ آزادی، ہندستان کی سن ستاون ہو کر رہ گئی اور مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ جب تک بغاوت پر قابو نہ پا لیا گیا: افغانی کو کلکتہ چھوڑنے کی اجازت نہ ملی۔ افغانی ۸ سال مصر میں رہ چکے تھے اور اس تحریک کو پروان چڑھانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ ملاحظہ ہو، بلنٹ: "مصر پر انگریزی قبضہ کی اندرونی تاریخ" اور "گارڈن خرطوم میں"۔

کے ساتھ مل کر العروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک عربی اخبار نکالا جس میں افغانی کی ہلچل مچا دینے والی شخصیت ہر سطر میں حلول کیے رہتی تھی۔ معلوم نہیں عبارت افغانی کی ہوتی تھی یا عبدہٗ کی، لیکن خیالات یکسر افغانی کے تھے اور فنائی تحریر کا بڑا حصہ بھی افغانی ہی کے قلم سے تھا۔ مجھے اس العروۃ اور الہلال کی تحریک اور تحریر میں حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے۔ خود مولانا پر افغانی کے کھلے ہوئے اثر کا کسی قدر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ الہلال کے صفحات میں جتنا اور جس جس طرح افغانی کا ذکر کیا گیا ہے اتنا کسی اور عظیم اسلامی شخصیت کو یاد نہیں کیا گیا ——— اور الہلال کے اولیں شمارے ہی افغانی، افغانی کے شاگرد محمد عبدہٗ اور عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا کی تصاویر و یادو تذکروں سے مزین ہیں۔

مولانا اور افغانی دونوں کے یہاں حیرت انگیز متوازی طور پر پریس کی اہمیت کا شدید احساس ملتا ہے۔ افغانی پریس کو چوتھی ریاست (FOURTH ESTATE) سمجھتے تھے اور اس کی اثر پذیری کی وسعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ العروۃ سے بہت پہلے حیدرآباد میں قیام کے دوران میں اور اس سے بھی پہلے مصر میں ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیانی عرصہ میں انھوں نے اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو اخبار نویسی پر اُبھارا؛ اس کے فوائد سمجھائے[۸] حیدرآباد کے مولانا محب حسین نے جب ان کے مشورے سے اپنا پہلا پرچہ معلم شفیق جاری کیا تو اس کے پہلے شمارے ہی میں افغانی کا ایک مقالہ "فوائد جریدہ" شائع ہوا۔ یہ مقالہ صحافی افغانی کو سمجھنے میں آج بھی مدد دے سکتا ہے۔ مولانا کے ہاں صحافت کی اہمیت کا کتنا احساس تھا اس کا کسی قدر اندازہ الہلال کے متعدد شماروں میں پریس کے مباحث سے ہو سکتا ہے[۹]۔

العروۃ صحافی دنیا میں پان اسلامی تحریک کا بانی تھا۔ جہاں گرد افغانی کے لئے ایران، ترکی، مصر، سوڈان اور ہندستان، سب الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک غیر منقسم اکائی تھے۔ سب پردیسی یا بدیسی سامراج کا تسلط تھا؛ سب میں اسلامی عنصر مشترک تھا؛ ان سب کو مغربی سامراج سے ٹکر لینے کے لئے ایک ہو جانے کی مسلسل تلقین اور پیہم جد و جہد افغانی کا مشن تھا۔ سامراج العروۃ کو زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکا؛ ہندستان اور مصر میں اس کا داخلہ ممنوع ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد مالی اور سیاسی دباؤ میں آ کر نشیدِ حریت نے دم توڑ دیا۔ یہ ۱۸۸۴ء کا ذکر ہے۔

ہندستان افغانی کی تحریک سے بے حد متاثر تھا؛ اس کے شواہد خود العروۃ میں ہندستانی اخباروں اور افراد کے حوالوں سے ملتے ہیں۔ ترکی میں ۱۹۰۸ء کا دستوری انقلاب، اور پھر دولِ یورپ کی ریشہ دوانیاں، جنگ بلقان اور جنگِ طرابلس، ان سب نے ہندستان میں انیسویں صدی کے پان اسلامزم کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔

---

[۸] عبدالرحمٰن الرافعی، "عصر اسمٰعیل"؛ عبداللطیف حمزہ: "الصحافۃ والادب" [۹] "مقالات افغانی" مرتبہ مبارزالدین رفعت ص ۴۵؛ "سب رس"، حیدرآباد اگست ۱۹۵۸ء مقالہ "محب حسین"؛ قلم سنبھالتے ہی مولانا کی اولین تحریروں میں سے ایک کا موضوع اخبار نویسی ہی تھا۔ مطبوعہ مخزن، ۱۹۰۱ء

لگتے کے الہلال نے اس موقع پر جو موقف اختیار کیا، اگر افغانی مولانا کی جگہ ہوتے تو اس سے سرِمو فرق نہ ہوتا۔ الہلال کے سامنے پوری اسلامی دنیا ایک اکائی کی حیثیت رکھتی تھی جس کا مرکز خلافتِ عظمیٰ تھا ـــــــ اور مکمل الہلال کے تقریباً ایک تہائی حصے میں شئونِ عثمانیہ یا عالمِ اسلام کے موضوعات بھرے ہوئے ہیں۔

خود لکھنے کے انداز میں مولانا، افغانی کے اسلوب سے کس قدر متاثر ہیں، اس کا اندازہ العروۃ کا سرسری سا مطالعہ کرنے سے ہی ہو جاتا ہے۔ العروۃ کا پرجوش خطیبانہ اسلوب اور جھنجھلا جھنجھلا کر جھنجھوڑنے کا انداز ہو بہو الہلال میں مل جاتا ہے۔ افغانی کی ایک اور خصوصیت کو بھی مولانا نے بڑی خوبی سے اپنایا ہے۔ لکھتے لکھتے بیچ بیچ میں یا آخر میں قرآنی آیات کو ایسے انداز سے استعمال کر جانا کہ وہ عبارت کا جزو معلوم ہونے لگیں، افغانی کے العروۃ اور مولانا کے الہلال، دونوں میں مشترک ہے۔ ترجمہ میں وہ اصلی شان نہیں رہتی، پھر بھی العروۃ کے کسی اداریہ کا ترجمہ الہلال کی عبارتوں میں چھپا دیجئے، دونوں میں امتیاز مشکل ہو جائے گا۔

خود ہندستان میں علی گڑھ تحریک نے مولانا کی فکر اور ان کے قلم دونوں کو متاثر کیا۔ علی گڑھ تحریک بھی ایک مخصوص نہج پر انگریزی ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے احیا کے لئے اٹھی تھی؛ مولانا کا بھی بالکل یہی مقصد تھا۔ منزل ایک تھی، راستے الگ الگ تھے۔ تحریک کی ساری اندرونی توانائی وہ بہرحال اپنا سکتے تھے، اور یہیں سے انھوں نے اپنا سفر شروع کیا۔ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق جس ذوق و شوق سے وہ علی گڑھ تحریک کی ٹائپ میں چھپی ہوئی مطبوعات منگاتے تھے، اس اضطراب کا اظہار انھوں نے کسی اور لٹریچر کے لئے نہیں کیا۔ سرسیّد افغانی کے بعد ان کے دوسرے بڑے مرشد تھے۔ یہ بظاہر عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ تحریکِ سرسیّد کا سب سے بڑا مخالف سرسیّد کے شاگردوں میں شمار کیا جائے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے اپنی فکر و نظر کی عمارت سازی انھیں آثار پر کی۔ ملیح آبادی کی روایت میں انھوں نے اپنی اس بےچینی کا مزے لے لے کر ذکر کیا ہے جو علی گڑھ کے اس 'فوق البشر' کی سوانح عمری 'حیاتِ جاوید' کے پریس سے باہر آنے اور ان کے ہاتھوں تک پہنچنے کے درمیان عرصہ میں ان پر گزری۔ مذہب کے بارے میں سرسید کی عقل پرستی کے تاثر کا تو انھوں نے کئی جگہ اظہار کیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ سرسیّد نے انھیں کسی دین کا نہ رکھا۔[۵۱] سرسیّد کی تفسیر کا ایک اور اثر مولانا کی قرآن کی ترجمانیوں میں ملتا ہے جب وہ سرسیّد کی طرح قرآن سے وہ موزوں ترین مطلب اخذ کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کی انھیں ضرورت ہے۔

---

۵۱ مکتوب شبلی بنام آزاد، مورخہ ۱۲ جون ۱۹۱۰ء "آپ کو اب زیادہ مولویت کی صورت میں رہنا چاہیے۔ اس سے بہت اچھے کام نکل سکتے ہیں" مکاتیب ۱، ص۱۲۱ میں نے اس اقتباس کے بین السطور کچھ پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ مزید ملاحظہ ہو ہمایوں کبیر: "آزاد کی خود نوشت ہندستان آزاد ہوتا ہے" ص۱۳

ایک تحریک کے سنچالک کی حیثیت سے وہ سرسید سے شروع ہی سے ایک اور سبق بھی سیکھ رہے تھے: یہ سبق تھا تحریک اصلاح کے لئے صحافت کے حربے کا استعمال۔ سرسید نے اپنی تحریک، گزٹ اور تہذیب الاخلاق سے شروع کی۔ اُردو میں کسی تحریک کے لے صحافت کا یہ پہلا سنجیدہ استعمال تھا۔ مولانا نے بھی بہت جلد محسوس کر لیا تھا کہ اخبار یا رسالہ کے ذریعہ وہ اپنی آواز موثر انداز میں دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے 'انا' کو تسکین دے سکتے ہیں۔ آغازِ شعور سے ان کے نام کے ساتھ کسی نہ کسی اخبار یا رسالے کی ترتیب لگی ہوئی ہے۔ یہ محض حادثہ نہیں، سوچے سمجھے سفر کی منزلیں تھیں۔ صحافت کی اہمیت، اخبار نویس کا منصب، آزادیٔ رائے کی عظمت، مضامین کی ترتیب، صحافی دنیا میں تقسیم کار کی ضرورت، اور تہذیب و ترتیب کی فنی نکتہ سنجیوں سے لے کر ٹائپ کے جوڑوں تک، صحافت کی معمولی جزئیات تک کے بارے میں ایک صاحب فن کی سی عالمانہ رائیں ۲۵ برس کے نوجوان نے پچھلے ۸، ۱۰ برس میں اپنے اندرون میں پرورش کی تھیں ——— اور ایک اردو صحافی کی حیثیت سے ان کا براہ راست سرچشمہ سرسید ہی تھے۔ الہلال ٹائپ میں نکلا، اس کے نقش اولیں کے لئے وہ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مرہون منت ہیں۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ الہلال نکالنے سے پہلے ایک تنہا مضمون کے سوا، اور وہ بھی کسی حد تک[1] ان کے قلم سے سرسید کی تحریک کے خلاف کوئی اہم چیز نہیں نکلی۔ علی گڑھ تحریک الہلال کے زمانہ میں پڑھے لکھے طبقے میں مسلمانوں کی اعلیٰ اور مقبول ترین تحریک تھی۔ ممکن ہے اس کی مخالفت سے مولانا کے بت شکن جذبہ کو بالیدگی ملتی ہو۔ جہاں سب لوگ اپنی دکانیں لگائیں، وہاں مولانا تو اپنی دکان نہیں لگا سکتے تھے۔ میں اس تحریک کی ذاتی اچھائی یا برائی سے قطع نظر مولانا کے مزاج کے اعتبار سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے مولانا کو اس راہ پر لگانے میں شبلی کا بھی ہاتھ ہو، لیکن مجھے تو خود شبلی میں بھی فکری انحراف سے زیادہ ایک مجروح انفرادیت کی چیخ نظر آتی ہے۔

مولانا کی تحریک اور تحریر پر کوئی اور اثر ہے تو وہ شبلی ہی کا ہے۔ شبلی اور مولانا دونوں لیگ کے مخالف اور اپنے وقت کی اصطلاح میں نیشنلسٹ تھے؛ دونوں اسلام، ہیروز آف اسلام، عالم اسلام اور اسلامیانِ عالم کا کلمہ پڑھتے تھے، دونوں فارسی، اردو اور عربی ادب کا یکساں بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے؛ دونوں شاعر تھے؛ دونوں آرٹ کے دلدادہ تھے، موسیقی پر دم دیتے تھے اور جمالیات کا نکھرا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ پھر کوئی تعجب نہیں اگر شبلی سے کسی قدر قریب رہنے کے بعد، خاص کر الندوہ کی ادارت کے زمانے میں، وہ شبلی کے طرزِ فکر اور

---

[1] 'الندوۃ' میں غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس پر بہت سخت تنقیدی تحریر۔

طرزِ نگارش سے متاثر ہوئے ہوں[۱۱۲]

صرف طرزِ نگارش کی حد تک ایک نمایاں اثر کو نظر انداز کر جاؤں گا، اگر میں مولانا کے پیشرو آزاد (مولانا محمد حسین آزاد) کا نام نہ لوں۔ آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کی آواز بازگشت الہلال کے استعارات اور تشبیہات، اور "اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھنے میں"، جگہ جگہ ملے گی۔ خود آزاد تخلص بھی، جو ملیح آبادی کی روایت کے مطابق ایک حادثہ کی پیداوار ہے، براہ راست محمد حسین آزاد سے لیا گیا ہے[۱۱۳] اسی سے ان کی ذہنی وابستگی اور اثر پذیری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

انوکھے اندازِ تحریر کے ساتھ، خود ہندستان کے قومی اور ملی مسائل میں ان کا جو عام ڈگر سے ہٹا ہوا رویہ تھا، الہلال کو ایک بلند امتیازی مقام دینے میں اس کا بھی اہم حصہ تھا۔ مولانا اپنے اس رویہ کو الہلال کی تحریک یا دعوت کہتے تھے۔ اس کا تصریحی تجزیہ تو آیندہ سطور میں ملے گا یہاں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ انگریزوں کے زیر سایہ مکمل حکومت خود اختیاری حاصل کرنے پر مسلمانوں کو پُر امن طریقے سے جد وجہد کرنے پر آمادہ کرنا، اور اس جد وجہد کو ایک اسلامی فریضے کی حیثیت سے پیش کرنا، یہ تھا الہلال کا تحریکی مقصد۔ اور یہ اس عہد میں کوئی معمولی مقصد نہ تھا عظیم نصب العین، اس کے لئے مجنونانہ لگن، اور خود اپنے مشن کا بے طرح احساس، ان سب نے مل کر الہلال کے ایڈیٹر کے قلم کو ایسی توانائی اور جان بخش دی تھی کہ محض الہلال کو پڑھ پڑھ کر مسلمانوں کے اندر دم خم، کس بل، احساس برتری، اور آزادی کے دشمن عناصر سے ٹکرا کر پاش پاش کر دینے یا ہو جانے کا جذبہ اُمنڈنے لگا تھا۔ الہلال کے براہِ راست مخاطب ہندستان کے مسلمان ہی تھے جن میں وطن دوستی، اسلام پرستی اور پان اسلامیت کے ساتھ ساتھ، اپنی قوت، اہمیت اور عظمت کا شعور بیدار کرنے میں الہلال کی حوصلہ مند اور ولولہ انگیز تحریروں نے جو رول ادا کیا وہ اسلامی ہندستان کے عہدِ جدید کے خوبصورت دیباچے کی حیثیت سے تاریخ میں اپنے لئے مستقل جگہ بنا چکا ہے!!

الہلال کا پہلا پرچہ ۱۲ ۱۹ء میں نکلا اور (دورِ اول یعنی بدلے ہوئے نام البلاغ کا) آخری ۱۹۱۶ء میں۔ پہلی اشاعت کے وقت ہندستان میں تقسیم بنگال کی تنسیخ عمل میں آ چکی تھی اور نتیجے کے طور پر قومی تحریک کا دہشت پسند طبقہ

---

۱۱۲ مکتوب شبلی بنام مہدی افادی ۱۶ مارچ ۱۹۰۹ء: "آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا" قلم وہی ہے معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔ مکاتیب۔ ۲ صفحہ ۲۰۴ ۱۱۳ حادثہ صرف اتنا ہے کہ گلدستہ میں غزل بھیجی تھی، ہی تھی اور چاہتے تھے کہ حروفی ترتیب کے سہارے ان کا نام کہیں شروع ہی میں نظر آ جائے۔ مولانا نے ابتدائی عمر میں آبِ حیات سے وابستگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملیح آبادی، ہمایوں کبیر والی خود نوشت میں مولانا نے تاویل کی ہے کہ مذہبی پابندیوں کے ردِ عمل میں آزاد تخلص رکھا۔ مجھے اس سے پورا اتفاق نہیں ہے لیکن ادھوری صداقت ماننے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔

کسی حد تک رام ہو چکا تھا۔ گرم دل کے قائد، تلک، قید میں تھے، گاندھی جنوبی افریقا میں ہندستانیوں کے حقوق کے لئے جد و جہد کر رہے تھے اور گھو کھلے ہندستان میں گاندھی جی کی تحریک کے لئے رائے عامہ ہموار کر چکے تھے۔

ہندستان میں قومی تحریک ۱۹۰۹ء کی اصلاحات ملنے کے بعد غیر متعین نصب العین اور کسی خاص اسٹنٹ کے میسر نہ آنے کے سبب (جیسے اس سے پہلے تقسیم بنگال نے مہمیز کا کام کیا تھا) سست پڑ گئی تھی۔ علی گڑھ تحریک کی بدولت مسلمانوں میں البتہ ایک نیا پڑھا لکھا متوسط طبقہ ابھر آیا تھا جس نے پہلے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور اب حقوق طلبی اور مسلم یونیورسٹی، دو مانگوں کے ساتھ مسلم لیگ اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر سایہ دن بدن سیاستِ قومی پر چھایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت رفتہ رفتہ علی گڑھ تحریک کے حلقۂ اثر میں آتی جا رہی تھی۔

بالکل دوسری طرف، علی گڑھ کی سیاست سے گریزاں، دو مختلف جاندار دھارے بہ رہے تھے: ایک روشن خیال علما کا گروپ، جس نے شبلی کی قیادت میں علی گڑھ کی انگریزیت کے خلاف ایک تحریک چلا رکھی تھی، اور جس کا ایک مظہر ندوۃ العلما کی شکل میں موجود تھا؛ اور دوسرا ان چند گنے چنے مسلمانوں کا حلقہ جنھوں نے اپنے آپ کو کھلے طور پر اس قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا جو ہندوؤں کی قیادت میں آئینی اصلاحات کے لئے کوشاں تھی[۱۱۵]۔ مولانا ذہنی طور سے ایک بڑی حد تک اسی آخری تحریک کے ساتھ تھے۔ بڑی حد تک سے میری مراد اصولی حد ہے، ورنہ الہلال کے صفحات پر 'وطنی تحریک' کا کوئی براہ راست اثر نہیں ملتا۔ وہ شدت کے ساتھ انگریزی حکومت پر تنقید کرتے تھے اور آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کرتے تھے؛ لیکن یہ اس وطنی تحریک سے وابستگی کی بنا پر نہیں بلکہ انفرادی جوش اور جذبے سے سرمست ہو کر۔ اصول سے آگے بڑھ کر عملی سیاست میں، مثلاً انھیں تنسیخ بنگال کا اتنا ہی رنج تھا جتنا کسی خالص مسلم لیگی کو ہوگا۔ تفاصیل میں یوں بھی کانگریس اور مسلم لیگ کی، اس وقت تک، اتنی متضاد اور متخالف راہیں بھی نہ ہو پائی تھیں اور بہت سے دوسروں کی طرح مولانا بھی دونوں جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ کانگریس یا 'وطنی تحریک' سے ان کی اصولی وابستگی کو ایک بار پھر ان کی ہجوم سے الگ رستہ تلاش کرنے کی نفسیات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ندوۃ، مولانا کی دلچسپی کا مرکز تھا اور الہلال کا تقریباً ایک تہائی حصہ ندوۃ یا مباحث ندوۃ ہی پر مشتمل رہا۔ ۱۹۱۴ء کا تو شاید ہی کوئی شمارہ اس ذکر جمیل سے خالی ہو۔

---

[۱۱۵] "ہندستان میں آج دو تحریکیں موجود ہیں: ایک وطنی تحریک، جو ہندستان کی سب سے بڑی کثیر التعداد قوم میں پیدا ہوئی اور اس کا مرکز بنگال ہے؛ دوسری مسلمانانِ ہند کی بیداری کی ہے۔" [الہلال: جلد ۴ شمارہ ۴، ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء]

علی گڑھ تحریک کی سیاست ان کے نزدیک دم توڑ چکی تھی، حالانکہ یہ محض خوش گمانی تھی۔ الہلال بہرحال اس کا سب سے سخت ناقد تھا[۱۵]۔ جس کا ایک ساتھی شمالی ہند میں، مولوی وحیدالدین سلیم کا مسلم گزٹ بھی تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک چل پڑی تھی؛ علی گڑھ والے بہر قیمت یونیورسٹی چاہتے تھے۔ مولانا کے خیال میں بنیادی چیز یہ تھی کہ حکومت کا عمل دخل کم سے کم ہو، اور شرائط میں یہ بات پہلے سے طے پا جائے۔

بین الاقوامی سطح پر صورتِ حال یہ تھی کہ یورپی طاقتوں کی سازشوں اور قومی جذبات کے ابھرنے کے سبب بلقان کی ریاستوں میں سلطنتِ عثمانیہ سے علیحدگی کی تحریک چل پڑی تھی، جس نے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر جنگِ بلقان کی شکل اختیار کر لی۔ ایک سال پہلے، اطالوی سامراج نے سلطنتِ عثمانیہ کے ایک اور حصے طرابلس (افریقا) پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا جہاں طرابلس کے قوم پرست اپنے رہنما سنوسی کی قیادت میں اس کے خلاف نبرد آزما تھے۔ جلد ہی یورپی طاقتوں میں آپس میں جنگ چھڑ گئی۔ روس، فرانس اور برطانیا نے جرمنی کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں باقاعدہ اعلانِ جنگ ہو گیا۔ ترکی، جرمنی کے ساتھ تھا اور نومبر میں اپنے اس ساتھ کا اعلان کر دیا۔

مرکزِ خلافت کی حیثیت سے ہندستانی مسلمان ترکی میں ہندستان سے کچھ کم دلچسپی نہ رکھتے تھے؛ بلکہ ہندستان تو پھر اپنا گھر تھا، نبٹتے رہتے؛ ایک مستقل اور مسلسل اجتماعی مزاج کے تحت وہ ہمیشہ کی طرح اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر میں گھلتے رہتے؛ یہی حال اس وقت تھا اور اسی کا عکس الہلال کے صفحات پر نظر آتا ہے؛ جیسا کہیں نے کہیں اور بھی کہا ہے، الہلال کا ایک قابلِ لحاظ حصہ عثمانیات سے بھرا پڑا ہے۔ بلقان، طرابلس، ہلالِ احمر، شئونِ عثمانیہ مستقل قسم کے عنوانات رہے ہیں۔ مقالات، اطلاعات اور تصاویر کا بڑا حصہ بھی اس موضوع کے لئے وقف تھا۔ خود اپنے ذاتی رجحان سے زیادہ شاید اخبار کی کامیابی کے لئے بھی یہ ناگزیر تھا۔ اور ایک اعتبار سے آج بھی اس کی افادیت کم نہیں: ۱۹۱۲ - ۱۹۱۶ء کے مشرقِ وسطیٰ پر کام کرنے والے کے لئے الہلال اور البلاغ میں اس عہد کا بہترین مواد موجود ہے۔

الہلال کا اہم ترین حصہ اس کا دینی حصہ تھا، اور مولانا تو ہمیشہ اس پر اصرار کرتے تھے کہ الہلال خالص دینی پرچہ ہے، سیاسی ہرگز نہیں؛ شروع ہی سے اس بات پر خاص زور دیا جاتا تھا کہ الہلال ایک اہم دعوت لے کر اٹھا ہے، محض اخبار نکالنے کی خاطر اخبار نہیں نکالا گیا، اور وہ دعوت ایک دینی دعوت ہے۔ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی وغیرہ اور خود مولانا کے قلم سے اسلامی موضوعات پر الہلال کے مقالے آج بھی خاصے کی چیز ہیں۔

---

[۱۵] پنڈت جی نے الہلال کے اس پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے ملاحظہ ہو "ڈسکوری آف انڈیا" صفحہ ۳۴۹

یہ سچ ہے کہ الہلال خالص اسلامی اخبار تھا؛ محض مسلمانوں کے مسائل اس کے پیشِ نظر رہتے تھے اور ہر چیز کو خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اپنے گمان میں مولانا نے الہلال کی دعوت کو مدلل طریقے سے بیسیوں صفحات کے اندر پیش بھی کیا؛ اس کی بنیاد پر حزب اللہ کے نام سے ایک دینی پارٹی کی بنیاد بھی ڈال دی جس کا باقاعدہ دستور العمل بھی ترتیب پا گیا اور اپنے خیال میں انھوں نے اس کی تشکیل بھی کر ڈالی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مولانا کا پورا طرزِ فکر، ہر نوجوان کی طرح (خاص طور سے اس عہد کا نوجوان) رومانوی تھا، اور یہی حال اُس دعوت کا بھی تھا جو شاید سچ مچ کبھی پارٹی کی شکل میں عالمِ وجود میں نہیں آئی۔ خود مولانا کے بقول یہ ساری تحریک، کام سے زیادہ "کام کی پکار" تھی[۱۱۹] خود الہلال کے بعض پڑھنے والوں کو بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ دعوت دعوت کی پکار ہے۔ صفحے کے صفحے اس کی تمہید میں لکھے جا رہے ہیں مگر دعوت کی وضاحت نہ ہو پائی۔ اس کے جواب میں مولانا نے لکھا تھا:

"میرے اعتقاد میں پہلی چیز کاموں کی تلاش نہیں ہے، بلکہ کام کرنے والوں کی تلاش ہے۔ دنیا میں کاموں کی کمی نہیں رہی؛ اصل کمی کام کرنے والوں کی ہے ...... پس قبل اس کے کہ میں اپنے کاموں کا معرکۂ زار دکھلاؤں، چاہتا ہوں کہ معلوم کروں کہ کتنے سپاہی مستعد ہیں اور کتنے ہیں جو اپنے خدا اور اپنی ملت کو اپنی زندگی اور اپنی قوت کا کچھ حصہ دے سکتے ہیں[۱۲۰]"

ان الفاظ میں بڑی بلندی ہے، وقار ہے، قوتِ تحریکی ہے۔ الفاظ اور فقرے اس سلیقے سے ترتیب دئے گئے ہیں کہ قائد کی آواز پر آواز دینے کا فوری جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ میں سچ مچ نثر کا جادو ہوتا ہے لیکن 'مری زمین کی سیہ راتوں کے لئے کیا ہے'؛ وہ اس بات کی وضاحت کبھی نہ کر سکے کہ قائد سپاہیوں سے کیا کام لے گا۔

۱۴ مئی ۱۹۱۳ء کے پرچے میں، اس مبہم الہلالی اسلامی دعوت نے کسی قدر تحریکی شکل اختیار کرنی چاہی، جب ایک سادہ سا دو چار سطری فارم اسی شمارہ کے ساتھ تتمہ کے طور پر لگا دیا گیا۔ فارم پر سب سے اوپر نحن انصار اللہ چھپا ہوا تھا؛ اس کے نیچے "ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین، لاشریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین (۶: ۱۶۲)۔ اس کے نیچے آیت کا ترجمہ تھا اور آخر میں، نام، پیشہ، عمر اور پتا۔ جذباتی عہد کی جذباتی دعوت کا جذباتی عہد نامہ، جس میں منزل کا پتا تھا نہ رستے کا؛ صرف چل پڑنا تھا، باقی سب کچھ قائد کے ذہن میں تھا جسے واضح کرنے کے لئے وقت نے اُسے نہ فرصت دی نہ مہلت؛

---

[۱۱۹] الہلال جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۹۱۴ء [۱۲۰] جلد ۲ شمارہ ۱۹، ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء

۱۹۱۳ء گزر گیا ۱۹۱۴ء کا فائل بھی سال ختم ہونے سے ڈیڑھ مہینہ قبل، مجبوراً مکمل ہوگیا، مگر ان "سپاہیوں" کے لئے ایک رومانیت زدہ پارٹی حزب اللہ، اور اس کے محض انشائی دستور العمل کی اشاعت کے سوا کچھ بھی سامنے نہ آسکا، پورا پورا مسلمان بننا اور اپنی زندگیاں تج کر نوع انسان کی خدمت میں لگ جانا اس کا خلاصہ بھی ہے تفصیل بھی؛ عملاً یہ کیسے ممکن ہوگا اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

لیکن اپنی جگہ یہ بھی کچھ کم اہم بات تھی، آئندہ عملی کام کرنے والوں نے انھیں خطوط پر چل کر عظیم دینی اور سیاسی تحریکوں کی بنیادیں ڈال دیں۔[۵۱]

دینی حیثیت سے الہلال کا اہم ترین کارنامہ، قرآن کی دلنشین تعمیم اور تفسیر بھی۔ قرآن اس کے ہر صفحے، ہر پیراگرافوں اور کئی کئی سطروں میں پڑا رہتا تھا۔ ندوہ کا مسئلہ ہو، یونیورسٹی کی بحث ہو، جنگ کی خبریں ہوں، قرآنی آیات ہر جگہ موجود ہیں۔ اس طرح قرآن کو اونچے اونچے طاقوں اور بند الماریوں سے نکال کر عام آدمی تک پہنچا دیا گیا۔ اس بے محابا استعمال نے اُسے ہر روز کی چیز بنا دیا اور پڑھتے پڑھتے آخر یہی ذہن میں رچ جاتا تھا کہ قرآن میں سب کچھ ہے۔ پھر قرآنی آیات کی دلآویز ترجمانی، دلکش تفسیر، اور ان کا باسلیقہ اطلاق الہلال کو سچ مچ ترجمان القرآن بنائے ہوئے تھا ——— اور میں نے اس قسم کا کوئی شمار تو کیا نہیں، لیکن "ترجمان القرآن" کے نام سے مولانا کی تفسیر کی اشاعت سے پندرہ سولہ سال پیشتر الہلال اس کام سے شاید اس حد تک فراغت پا چکا تھا کہ بہت اندنے کے مطابق قرآن کا ایک چوتھائی حصہ کسی نہ کسی طریقے سے اس میں ضرور استعمال ہوگیا تھا۔

الہلال کا ایک حصہ علمی، انتشائی، اطلاعی اور ہنگامی مضامین اور خبروں کے لئے مخصوص تھا۔ یہ حصہ زیادہ تر بین الاقوامی مواد کے لئے، مصری، ترکی، انگریزی، اور امریکی اخباروں اور رسالوں کا مرہون کرم تھا۔ ہر شمارے میں چند تصاویر بھی ہوتیں جو غالباً مصری اور ترکی ماخذ ہی سے لی جاتی تھیں۔

ہر پرچے میں ایک دو صفحے مراسلات کے لئے مخصوص تھے، جن میں اتفاقاً ہی کوئی اہم بات درج ہوتی تھی: زیادہ تر الہلال اور ایڈیٹر الہلال کی خدمات کے چرچے اور جاں نثاری کے عہد نامے ہوتے تھے۔ اخبار کو چلانے کے لئے شاید یہ ضروری بھی تھا؛

الہلال کے ممتاز معاصرین میں مولوی بشیر الدین کا البشیر (اٹاوہ)، حکیم برہم کا مشرق (گورکھپور)، بیلدین سلیم کا

---

۵۱ آگے ملاحظہ ہو، الہلال کے اثر کا تجزیہ؛

مسلم گزٹ (لکھنؤ) گنگا پرشاد ورما کا ہندستانی (لکھنؤ)، حکیم محبوب عالم کا، پیسہ اخبار (لاہور)، ظفر علی خاں کا زمیندار (لاہور)؛ علی گڑھ کا گزٹ، الہ آباد کا مساوات، اور کامریڈ کے محمد علی کا اردو روزنامہ ہمدرد قابلِ ذکر اخبارات تھے۔ ان میں الہلال کے ساتھ سرخیل، زمیندار (اجرا ۱۹۱۰ء) اور ہمدرد (اجرا ۱۹۱۳ء) تھے۔

زمیندار، الہلال سے سینیر تھا اور روزناموں میں غالباً سب سے زیادہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کی مقبولیت سیاسی شعور پیدا کرنے اور عام بیداری پھیلانے کا ایک اچھا اور سستا ذریعہ تھی اور جب پہلی بار ۱۹۱۳ء میں، اس کی ضمانت ضبط ہوئی تو خود مولانا نے زمیندار کے بند ہونے کو ایک عظیم قومی سانحہ سمجھا اور اس پر غیر معمولی طویل اداریے لکھے جو صحافت کی عمومی اہمیت پر روشنی ڈالنے سے قطع نظر خود زمیندار کی بے اندازہ مقبولیت کا کچھ اندازہ کرا دیتے ہیں؛ مولانا کے یہ احتجاجی مقالے خود مولانا کے صحافتی اسلوب کی بہترین مثالوں میں سے ہیں۔

مگر زمیندار باوجود تمام تر اچھائیوں کے صحافت کا وہ اعلیٰ معیار قائم نہ رکھ سکا جیسا الہلال کا تھا۔ الہلال ہفتہ وار تھا اور زمیندار روزنامہ؛ بظاہر مقابلہ بے جوڑ ہے، لیکن اکثر موضوعات اور مباحث کے اشتراک کی بنا پر انھیں آسانی سے تولا جا سکتا ہے۔

ظفر علی خاں کی طرح محمد علی بھی مولانا سے سیاسی اور صحافتی تجربے میں سینیر تھے، لیکن ہمدرد کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک سال جونیر۔ ہمدرد، زمیندار سے زیادہ سنجیدہ، متین اور جری تھا لیکن اسٹاف کی کمی اور وسائل کے فقدان نے ایک روزنامے کی حیثیت سے اس کی ترتیب کو بھی اونچا نہیں اٹھنے دیا۔

تنوع جتنا، ہفتہ وار کی حیثیت سے، الہلال میں آ سکتا تھا ان دونوں روزناموں میں ممکن بھی نہ تھا پھر عبداللہ عمادی، سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالواحد ندوی (کانپوری) اور حامد علی صدیقی جیسے مددگار میسر آ جانے کے سبب ایڈیٹر الہلال کو ترتیب اور معیار کی طرف سے زیادہ پریشانی بھی نہ تھی۔[۱۹] اور یہ واقعہ ہے کہ اُس نے ایک آئیڈیل ہفتہ وار کی ترتیب پیش کی جس پر عرصہ تک، شاید اب تک، کوئی اضافہ نہ کر سکا۔

لیکن الہلال کی اصل امتیازی خصوصیت اس کی نئی زبان اور ایڈیٹر کی علوم اسلامیہ پر گہری نظر تھی۔ جواہر لال نہرو نے الہلال کی اس "نئی زبان" پر خاص زور دیا ہے۔[۲۰] اس انوکھی زبان اور گہرے علمی پس منظر کے ساتھ کسی قدر انوکھے خیالات نے پڑھنے والوں کو ایک دم سے چونکا دیا۔ ایک طرف ان کی دینی بصیرت، اسلامی علوم سے گہری واقفیت اور مجتہدانہ اندازِ نظر کا رعب پڑتا تھا، دوسری طرف، قدیم عربی خطبوں کے انداز کی پُرجوش سحرکار زبان تھی

[۲۰] "ڈسکوری آف انڈیا" صفحہ ۳۵۵ [۱۹] ضمیمہ ۳: مکتوب گرامی مولانا عبدالماجد دریابادی

جس میں پہاڑوں کا شکوہ تھا، طوفان کا شور تھا، تیز ستھرے کوہستانی چشموں کی روانی تھی اور گھنے جنگلوں میں چلنے والی تیز ہوا سے پیدا ہونے والی قدرتی موسیقی تھی —— میں ان الفاظ کے سوا ان کے فن کے تجزیے کے لئے کوئی دوسرے الفاظ نہیں رکھتا۔ ظفر علی خاں اور محمد علی جوش و خروش، تجربے اور سوجھ بوجھ میں مولانا سے کچھ نکلتے ہوئے ہی تھے؛ صحافتی انشا میں بھی اپنے اپنے رنگ میں اُنھوں نے خاصی پختگی حاصل کرلی تھی؛ لیکن مولانا جیسی علمیت اور بالکل اچھوتا اسلوب ان میں سے کسی کو میسر نہ تھا۔ اسی سرمایہ نے الہلال کو بنا دیا[۲۱]۔

الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا اور آخری ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو؛ البلاغ کے نام سے ایک سال بعد ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو یہ دوبارہ نکلا اور ۳۱ر اپریل ۱۹۱۶ء کا آخری البلاغ نکل کر یہ دور بھی ختم ہوا[۲۲]۔ گیارہ سال بعد ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کو ایک بار پھر الہلال کے نام سے شائع ہوا اور دسمبر تک چل کر، غالباً اسی سال ختم ہو گیا[۲۳]۔ یہ دوسرا الہلال، چودہ پندرہ سال پہلے کے الہلال کا نقش سایہ تھا، نام کا اشتراک تھا، کلکتہ سے شائع ہوتا تھا، عام ترتیب میں بھی وہی پچھلا انداز برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی، لیکن اس الہلال کی حرکی روح غائب تھی۔ خود مولانا اسکی ترتیب میں غالباً کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے شاید اُسی کا ایک مظہر تھا کہ اس میں کہیں کسی ایڈیٹر کا نام نہیں ہوتا تھا۔ اس میں اکادمیت زیادہ تھی، صحافت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مولانا بھی ۱۹۱۲ء سے اب تک بقدر ۱۵ سال پختہ عمر ہو چکے تھے؛ اور بھی غم تھے زمانے میں محبت کے سوا؛ اپنی عملی سیاسی سرگرمیوں اور جنگ عظیم سے پہلے کے رومانوی صحافتی جادو کے ٹوٹنے کے سبب وہ شباب رفتہ لوٹ کے آ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسی لئے اردو ادب میں الہلال کی اصطلاح (مثلاً الہلالی زمانہ، الہلالی اردو، الہلالی صحافت) سے مراد ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا عہد ہوتا ہے۔ اور میں نے بھی جہاں عمومی تبصرہ کیا ہے وہاں یہی دور پیش نظر رہا ہے۔

۱۹۱۲ء کے شماروں کا اہم ترین موضوع —— اور یوں یہ کب اہم ترین نہیں رہا —— خود الہلال ہے۔ اس کی اشاعت، مقصد، تحریک اور دعوت کی لذیذ حکایت جسے دراز تر انداز میں بڑے دلآویز نقوش میں بیان کیا گیا ہے۔

---

[۲۱] ادب، صحافت اور سیاست کے ان تینوں اکابرین کا موازنہ شورش کاشمیری نے بھی کیا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو "ظفر علی خاں" از شورش کاشمیری [۲۲] عمر کے صرف ۲۷ برس گزرے تھے۔ الہلال البلاغ کے نام سے جاری تھا۔۔۔ اپریل ۱۶ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا۔۔۔" (غبار خاطر ص۲۱۰)؛ "۳۰ر مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے حدود بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور دفعۃً البلاغ اور البلاغ پریس کے ساتھ تصنیف و طباعت کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔" (ترجمان القرآن جلد اول ص۶ دیباچہ)؛ [۳۰ر اپریل کو شاید غلطی سے مارچ لکھ دیا ہے] [۲۳] ۱۹۲۷ء میں مجھے ۳۰ دسمبر کا آخری پرچہ مل سکا ہے جس کا شمارہ نمبر ۲۵ ہے۔

صحافتی کامیابی کے اصولوں کے تحت کوئی نہ کوئی اہم قومی یا ملی مسئلہ چھیڑ کر اس میں عام رائے کی شدت سے مخالفت، اور سب سے آگے۔ ایک نمایاں انفرادیت حاصل کر لینا الہلال کی دوسری ترتیبی خصوصیت رہی ہے ---

وحسن اتفاق سے اپنے مسائل کو کھوجنے کی زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑی، یہ ہمیشہ موجود رہے: مسلم یونیورسٹی، ندوۃ العلما، مسجد کانپور، جنگ بلقان، جنگ طرابلس؛ اور یہ بھی ختم ہوئے تو پھر 'الندوہ' اور شبلی، مسجد لشکر پور، اردوئے معلی، مسلم گزٹ، زمیندار، وغیرہ۔

۱۹۱۲ء کے ۲۳ شماروں کا اہم ترین موضوع مسلم یونیورسٹی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر ساری دلچسپی طرابلس اور امیر سنوسی کے جہاد پر مرکوز ہے۔ ایک مستقل عنوان 'شئونِ عثمانیہ' کا ہے جس میں سلطنتِ ترکی کی انتظامی اور عسکری خبریں شامل رہتی تھیں۔

پہلے پرچے کی ترتیب ... ضمیمے کے طور پر ... شامل کر دی ہے۔

دوسرے پرچے میں، اندرونِ سرورق، الہلال کی اشاعت، دو ہزار بتائی ہے، اور تیسرے پرچے سے قیمت تین آنے سے سات آنے کر دی گئی ہے۔ چوتھے نمبر میں، الہلال میں تصویروں کی اشاعت کے بارے میں لکھا ہے، "سچ پوچھئے تو تصویروں کی اشاعت تو ہمارا ایک ضمنی کام ہے اور زیادہ تر اس لئے ہے کہ بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی۔" : شیخ عبداللہ (بانی گرلز کالج مسلم یونیورسٹی) 'ایڈیٹر خاتون' کی انجمن تبلیغ اسلام کی تجویز پر ایک تفصیلی نوٹ ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کے ورثا ان کی قومی خدمات کے اعتراف میں علی گڑھ کالج میں کوئی یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ کالج کے ٹرسٹی اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ اس کے بارے میں مرحوم کے ورثا کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس دروازے کو کسی بوجھل جیب سے کھٹکھٹائیے تو جواب ملے گا"؛ اسی پرچے میں ایک جگہ 'کامریڈ' کی ممالک اسلامیہ میں روز افزوں مقبولیت کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ مصر کے تمام مشہور اخباروں میں اس کے تراجم چھپتے ہیں۔ پانچویں نمبر میں ایڈیٹر کے نام خطوط شائع کئے گئے ہیں جن میں ان کی قومی اور مذہبی خدمات کے مبالغہ آمیز اعترافات ہیں؛ مزاحیہ انداز میں 'نظر سے خوش گزرے' کے عنوان سے کشاف (شبلی) کا پچھلے پرچوں کے بارے میں ایک تحسینی نوٹ ہے؛ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے عنوان سے اداریہ ہے جو مسلسل تین قسطوں میں جا کر تمام ہوا۔

چھٹے شمارے میں ایک جگہ لکھا ہے: "الحمد للہ کہ یونیورسٹی کے عدم الحاق کی قینچی نے تنسیخ کے زخموں کو پھر سے ہرا کر دیا ہے"؛ اسی شمارے میں، اکبر الہ آبادی نے پہلے پرچے کو دیکھ کر ایک خط لکھا ہے: "مکرمی وحبیبی! علیل و

ناتواں ہوگیا ہوں۔ اب زبردستی کا جینا ہے۔ دل کو دنیا سے بہت کم تعلق رہ گیا ہے۔ کچھ تو میرے حالات خاص اور کچھ میرے عام خیالات جہانِ فانی کی نسبت۔ آپ کو مبارک ہو کہ آپ کا دلی ارادہ اب قریب تکمیل ہے ۔۔۔ بسبب ناتوانی کے ان روزوں مضمون وضمون کچھ نہیں سوجھ سکتا لیکن آپ نے یاد آوری سے عزت بخشی۔ دل میں ایک حیاتِ تازہ پیدا ہوئی اور آپ کے پرچے کی نسبت یہ شعر ذہن میں آیا:

"فروغِ حق کو نہ ہوگا زوال دنیا میں ہمیشہ یہ رہے گا ہلال دنیا میں"

اس پرچے میں ایک اہم تحریر "مسلم یونیورسٹی کے خواب کی تعبیر" ہے۔

ساتویں نمبر میں "زندہ دلانِ دہلی" کے عنوان سے زندہ دلانِ وطن کی باہمی آویزش پر تنقید کی ہے۔ دہلی سے چار صفحوں پر مشتمل روزنامہ شائع کرنے کی اطلاع ہے۔ "نصف شب کی نصف شب یا مسلم یونیورسٹی" کے عنوان سے اداریہ ہے جو اگلے نمبر میں ختم ہوا ہے۔

باقی شماروں میں اہم شمولات یہ ہیں:

پنجاب کے اسماعیلی ہندو؛ مسلم یونیورسٹی کمیٹی (شمارہ ۸)۔ الہلال کی پولیٹکل تعلیم (۸، ۹)؛ ایڈیٹر کا مرؔیڈ کی کھلی چٹھی؛ مسلم یونیورسٹی کمیٹی" اس کے ساتھ ہی ایڈیٹر الہلال کا نوٹ (۹)؛ محمد علی کی دوسری چٹھی ـــــ اور اس پر الہلال کا اداریہ؛ افتتاحیہ: عید الفطر؛ (۱۰) عبدالماجد دریابادی کا فرنچ سے ترجمہ ایک مقالہ "تمدن خطرے میں" (۱۰، ۱۱)۔ "الندوۃ" کے بند ہونے کی اطلاع؛ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں لکھنؤ سے ایک گمنام مذہبی چٹھی ـــــ اور اس پر اداریہ؛ یونیورسٹی ہی پر "صبح امید" کے عنوان سے افتتاحیہ۔ کشاف (شبلی) کی نظم "مسلم یونیورسٹی" (۱۱)۔ مسلم گزٹ میں مسلم یونیورسٹی پر ابوالکمال عبدالودود بریلوی کے ایک مضمون کی اشاعت پر اظہارِ مسرت، کہ یہ عین الہلال کی تائید ہے؛ "اسلامی پریس کا تغیر" کے عنوان سے زمیندار، وکیل، البشیر اور مسلم گزٹ کے رویوں میں (مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں) معقول تغیر کا خیر مقدم (۱۲)۔ یونیورسٹی کے بارے میں لکھنؤ سے دوسری گمنام چٹھی اور اس کا جواب؛ مجوزہ روزانہ الہلال اور ماہنامہ البیان کے اشتہار؛ العطاس المستقیم کے عنوان سے افتتاحیہ، جو چار نمبروں میں مکمل ہوا (۱۳)۔

اداریہ "مسلمانوں کا سچا لیڈر کون ہوسکتا ہے"؛ "من انصاری الی اللہ" کے عنوان سے الہلال کی تحریک کی ابتدا؛ ہندوستان میں پین اسلامزم پر ڈاہبری کے خیالات؛ ازلندن ٹائمز (۱۴)؛ سرسید کا مضمون "آزادی رائے"، ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ (۱۴، ۱۵)؛ "مسلم یاس" پر کشاف کی مزاحیہ نظم (۱۵)۔ یونیورسٹی پر شذرات؛

یونیورسٹی پر مراسلات؛ "یونیورسٹی اور الحاق"؛ "کشاف کی نظم"؛ اشاعتِ اسلام کے عنوان سے شبلی کا ایک مراسلہ؛ ایڈیٹر الہلال کی تعریفیں؛ کلکتہ میں موجودہ اسلامی مسئلہ پر ایڈیٹر الہلال کی طویل تقریر کا متن (۱۶ - ۱۷)؛ النبأ العظیم؛ جنگ کے ماضی و مستقبل پر ایک نظر: "الجہاد فی الاسلام"؛ یونیورسٹی پر وصاف (شبلی) کی نظم (۱۸)؛ عید اضحیٰ (۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲)؛ دعواں کب تک، کے قافیہ ردیف میں شہر آشوب اسلام یا تعزیتِ عید کے عنوان سے، غالباً خود مولانا کی، ایک طویل نظم (۱۹)۔ "مسئلہ الحاق": وصاف کی نظم؛ علی گڑھ میں طرابلس اور ترکوں سے ہمدردی کے اظہار میں ایک جلسہ کی کارروائی پر "کفر از کعبہ" کے عنوان سے تبصرہ (۲۰)

شذرات میں، "اگر الہلال کی ضخامت دوگنی کر دی جائے اور مجھ سے کہا جائے کہ تنہا اس کو مرتب کر دو، تو میں انشاءاللہ دو راتوں کے اندر مرتب کر دوں گا، لیکن اگر الہلال سولہ صفحے کی جگہ ایک صفحے کا نکلے اور مجھ سے کہا جائے کہ اس کو صحیح چھاپنے کا ذمہ لو، تو میں بغیر ایک منٹ کے وقفے کے انکار کر دوں گا کہ یہ میرے امکان سے باہر ہے" (۲۱)؛ "حضرۃ مولانا شبلی رفیوضہ" کا ایک فارسی ترکیب بند: "اے کہ نیرنگ سراپردۂ عالم دیدی" (۲۱) المنٹے کے انگریزی پرچے "سعد" سے ایک ترجمہ (۲۱، ۲۲)۔ نواب وقار الملک کے طرزِ عمل پر یونیورسٹی تحریک کے سلسلہ میں ایک توصیفی شذرہ؛ "وصاف" کی نظم "خطاب بہ رائٹ آنریبل سید امیر علی" (۲۲)۔ "کشاف" کی نظم: "الہلال کا لب و لہجہ" (۲۳)؛ "الجہاد! الجہاد"۔ ۱۹۱۲ء کی چند منتخب تحریروں میں سے ایک جس میں مسلمانوں کو آزادی کی راہ میں تن من دھن کی بازی لگا دینے کے لئے بُری طرح جھنجھوڑا تھا (۲۳)۔ ۲۵ دسمبر کا شمارہ نمبر ۲۴ اس جلد کا آخری پرچہ تھا۔ اس میں نیاز صاحب (نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری) کا ایک طویل مراسلہ شائع ہوا تھا۔

یہ جلد ختم ہوتے ہوتے الہلال ہندستانی صحافت میں ایک باوقار جگہ حاصل کر چکا تھا۔ ایڈیٹر کو اس کا احساس تھا اور اس احساس نے اس میں اپنے اوپر مزید اعتماد پیدا کر دیا تھا!

۱۹۱۳ء کی پہلی جلد (پہلی چھماہی) میں فہرست زیر اعانۂ ہلالِ احمر، منظوماتِ شبلی و نیاز فتحپوری اور شبلون عثمانیہ (جس کا اہم حصہ قضیۂ بلقان تھا) کے علاوہ مندرجہ ذیل اہم چیزیں شائع ہوئیں:-

مسلم لیگ کے صدر ابراہیم رحمت اللہ کا خطبۂ صدارت؛ ایڈیٹر الہلال کی تحسین کے ساتھ (۱، ۲)؛ ایڈیٹر الہلال کے ایک طویل نوٹ کے ساتھ شبلی کا دیباچہ "سیرت النبی" (۳)؛ "اطلاع منجانب سکریٹری شعبۂ اردو، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس"۔ "... کانفرنس کے سالانہ جلسہ بابت سن ۱۹۱۲ء میں شعبۂ اردو کی خدمت کے

سپرد ہوئی ہے ....." ، "عبدالحق بی اے (علی گڑھ)، اورنگ آباد" (۴) ۔ حسرت موہانی کی ایک خالص سیاسی غزل: غضب ہے کہ پابند اغیار ہوکر (۴) ۔ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں لکھنؤ کے جلسوں پر "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے مسلسل اداریے (۵، ۶، ۷، ۸، ۱۲) ۔ "مسئلہ و اجوبتہا" کے تحت "مجلس مولد نبوی اور موضوع احادیث" (۶) ۔ "مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی" کی کارروائی لکھنؤ پر نواب وقارالملک کا ایک طویل مضمون (۶) "جواب شکوہ کا اقبال" از مصطفےٰ علی خاں شرر (۸) ۔ خلیفہ المامون اور الزام قتل امام رضا" (۹) ۔ انتقاد کے ذیل میں ریویو کے اصول بتائے ہیں (۹) مسلم یونیورسٹی ڈپوٹیشن ٹوٹ گیا: نئی کمیٹی کی تشکیل ہوگی (۱۲) ۔ الحیاۃ (۱۳) ۔ اکبر کی ایک غزل: "کیا ہے جس نے اس عالم کو قائم اس کو کیا کہئے (۱۳) ۔ مسئلہ تعطیل جمعہ پر شبلی کا گشتی مراسلہ (۱۴-۱۵) ۔ ہلال اور صلیب اور مستقبل اسلام (۱۴-۱۵) "شبلی اور مسئلہ الندوۃ" رسالہ الندوہ میں کسی عبدالکریم (ندوی) کا مضمون "الجہاد فی الاسلام" کے موضوع پر شائع ہوگیا، جو شبلی کی نظر میں ابن الوقت کی حد تک سرکار انگریزی کے خلاف تھا شبلی کے کہنے پر عبدالکریم پر ایکشن لیا گیا جس کا عام طور پر بڑا برا اثر پڑا، یہ اداریہ اسی کا ردعمل ہے (۱۶) "من انصاری الی اللہ" کے عنوان سے تحت ایک دینی پارٹی بنانے کی اسکیم، اور لوگوں کو شرکت کی دعوت (۱۶) ۔ خدام کعبہ کی اسکیم (۱۶) ۔ "من انصاری الی اللہ" کی پکار پر آواز دینے والوں کے لئے فارم بعنوان:

ان صلاتی ..... اول المسلمین (۶: ۱۶۲) : میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، غرضکہ میری ہر چیز صرف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے ۔ اسی قربانی کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں پہلا مسلم ہوں۔

نام .... پیشہ .... عمر .... پتہ .... (۱۷)

یہ فارم جو سترھویں شمارہ میں الگ سے نتھی تھا اگلے پرچے میں دوبارہ چھپا اور باقاعدہ جزو بندی میں شامل ہے (۱۸) ۔ ایک نئے اخبار "آزاد" کا خیر مقدم جو "زمانہ" کے نگم نے نکالا (۱۸) ۔ الہلال کی تفصیلی دعوت، جس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ قائد کے پیچھے پیچھے آجاؤ (۱۹) ۔ رسالہ توحید (میرٹھ)، ایڈیٹر حسن نظامی، اور آگرے کے "نقاد" شاہ دلگیر کے رسالہ پر ریویو (۱۹) ۔ معاصر اسلامی دنیا کے اہم پرچوں کے نام: المؤید، الجریدہ، الزہرہ، اتحاد و ترقی، البرہان، المنار، الہلال، چہرہ نما، شہپال، تصویر، افکار، السلام (۱۹) ۔ علی گڑھ سے نکلنے والے اردوئے معلٰی کی ضمانت ضبط ہونے پر "اردو پریس علیگڑھ کی ضمانت" کے عنوان سے دو شماروں میں تند و تیز اداریے (۲۰، ۲۱) "سید فضل الحسن حسرت موہانی کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں موجودہ مصائب اسلامی کی تحریکوں میں خاص طور پر حصہ لے رہے تھے، علی الخصوص علی گڑھ اور بعض دیگر مقامات میں ان کی سعی مشکور سے ملکی صنعت و حرفت اور مصنوعات کی تحریک مسلمانوں میں جگہ

پکڑ رہی تھی - چونکہ یہ واقعہ ہز آنر کی .... شاہنشاہانہ اور مطلق العنانہ تہدید کے خلاف تھا۔ اس لئے اس کو روکنے کے لئے ضروری تھا کہ حربۂ حکومت حرکت کرتا۔ چنانچہ رسالہ اُردوئے معلیٰ کے پریس سے یکایک تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی ہے، اور چونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا فقیر و بوریہ نشین مالک تین ہزار کی جگہ دس روپے کے تین نوٹ بھی ایک وقت میں نہیں دے سکتا، اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ پریس بند ہوگیا۔" (۲۰)

"اردوئے معلیٰ کے مضمون پر گرفت نہیں کی گئی، اس میں پولیٹکل مباحث کا حصہ عرصہ سے نادر کالمفقود ہے۔ اس کے ایڈیٹر کا صرف یہی جرم نظر آتا ہے کہ اس نے اسلامی حسیات و جذبات کے اظہار میں حصہ لیا اور آخری دنوں میں ملکی مصنوعات کی طرف توجہ اور غیر ملکی مصنوعات سے احتراز دلانے کی کوشش کی (۲۱)۔

"دولت بنی امیہ" از مولوی عبداللہ، الہلال کے ایک طویل نوٹ کے ساتھ (۲۱)۔ رام پور میں امداد امام اثر کا دیوان زیر طبع ہے، اس کا اشتہار (۲۱)۔ "حیات بعد الممات" از نواب علی - بڑودہ کالج (۲۱) مسجد کانپور کے بارے میں مختصر سا نوٹ (۲۳) - زیر اعانۂ اردوئے معلیٰ (۲۴) - مفردات جذبات: علم النفس کا ایک باب: حظ و کرب" از عبدالماجد بی۔ اے (۲۴، ۲۵)۔ احرارِ اسلام کے سلسلہ کا آغاز، ذیلی سرخی: "الحریۃ فی الاسلام" (۲۵) "الداء والادا، یعنی جماعت حزب اللہ کے اغراض و مقاصد - پہلی قسط (۲۵)۔

۱۹۱۳ء کی دوسری جلد جولائی سے شروع ہوئی اور دسمبر میں ختم ہوئی۔ اس وقت تک مسجد کانپور کا مسئلہ سامنے آچکا تھا، مقامی حکام نے سرکاری ضرورت کے لحاظ سے مسجد کا ایک حصہ گروا دیا تھا جس پر مسلمانانِ ہند میں غم و غصہ کی عام لہر دوڑی ہوئی تھی - یہی مسجد کانپور مشہدِ اکبر بن گئی جب کانپور کے مسلمانوں نے مسجد کی تکمیل و تحفظ کے لئے خونیں عہد و پیمان کر کے اپنی جانوں کی بازی لگا دی - الہلال کی اس جلد کا اہم ترین مسئلہ یہی ہے اور کچھ اس مسئلہ نے، کچھ دوسرے اہم عنوانات نے اس جلد کو الہلال کی اہم ترین جلد بنا دیا ہے۔ اس مسئلہ کانپور پر کئی اداریے تو اس قدر آتشیں ہیں کہ اس وقت کے مستبدانہ حالات کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ آخر انھیں برداشت کیسے کر لیا گیا - سید سلیمان ندوی کچھ عرصے پیشتر الہلال کے ادارہ میں آچکے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے "مشہدِ اکبر" کے نام سے بہت سخت قسم کا سلسلۂ مضامین لکھا۔ کئی معاصر لکھنے والوں نے اس بات کا خاص زور دیا ہے کہ الہلال کے بہت سے اہم حصے سید سلیمان کے لکھے ہوئے تھے، اور "مشہدِ اکبر" کا اس سلسلہ میں خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے۔ "مشہدِ اکبر" یا اس قسم کی طوفانی تحریریں لکھی ہوئی کسی کی بھی ہوں، اداریے کے الہلال کی طرح

خیالات اور بیشتر تحریر کا رنگ بھی براہِ راست ایڈیٹر الہلال سے متاثر ہی نہیں ماخوذ کہنا چاہیے اور اسی لئے جیسا کہ ایڈیٹر الہلال نے متعدد بار دعویٰ کیا ہے کہ سب کچھ اس کے اپنے قلم سے ہوتا تھا —— یہ کوئی غلط بات نہیں، ایڈیٹر الہلال ہر تحریر میں جھانکا پڑتا تھا!

اس جلد کے دوسرے مستقل اور مسلسل عنوانات 'شؤن عثمانیہ'، 'مسئلہ شرقیہ' اور 'برید فرنگ' تھے جن میں اتفاق ہی سے کوئی مستقل قدر و قیمت کی چیز نکل آتی تھی۔ اس جلد کے اہم مشمولات یہ ہیں:۔

"فاتحۃ السنۃ الثانیۃ" —— قرآنی آیات میں اپنی عربی اور پھر اردو ملا کر (شمارہ ۱، ۲ر جولائی)۔ 'حزب اللہ' کے سلسلہ میں "الداء والادواء" کا سلسلہ جو پچھلی جلد کے آخری نمبر میں شروع ہوا تھا (۱، ۲، ۳، ۴۔۱۴، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳)۔ مصر کے لئے رفارم اسکیم، ۱۹۱۳ (۱)۔ "دعوت الی الحق کی اسکیم" —— قرآن سے ماخوذ، مگر مبہم (۱، ۲) اُحرار اسلام' کے ذیل میں "نظامِ حکومت اسلامیہ" —— جس میں۔ [معارف سلیمان نمبر، آجکل آزاد نمبر میں ظفر حسین خاں کا مضمون۔ سلیمان نمبر میں شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے کہ خود سید صاحب نے کراچی کے کسی پرچہ میں لکھا تھا: "الحریۃ فی الاسلام، اذکارِ نزولِ قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں"۔ ۹۔ا سید صاحب، ۱۹۱۳ء کے وسط میں الہلال میں آئے اور جیسا کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے اس سال کے آخر میں الہلال کو چھوڑ کر دکن کالج پونا پہنچ گئے تھے۔ م۔ ۹ا] اسلام میں جمہوریت ثابت کی ہے (۱، ۲، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵)۔ ایک اشتہار، 'نیل تاج مینوفیکچری' جس میں متعدد مشاہیر کی رائیں بھی دی گئی ہیں۔ رائے دینے والوں میں محمد اقبال اقبال اور اکبر بھی ہیں۔ اکبر نے لکھا ہے؛

زیتون، بادام، بنولہ وغیرہ کے خواص طبی کتابوں میں مندرج ہیں؛ بسایا تو بڑی حکمت کی ہے، یہ ترکیب لائق تعریف ہے۔ کیا بھینی بھینی خوشبو ہے۔ سر دست لیبل پر لگانے کے لئے یہ شعر اچھا ہوگا:

دماغ کے لئے خوشبو کا کھیل اچھا ہے ہوا بھی مست ہوئی ہے کہ تیل اچھا ہے" (۱)۔

شذرات، مسجد کانپور۔ اس کا باغیانہ آغاز اس انداز پر ہوا تھا:۔

"یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا —— اما علی الذین انصار و اعوان!

سودا قمار عشق سے خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشقباز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

نہیں سمجھتا کہ اس واقعہ کی بہ نسبت کیا لکھوں، سوا اس کے کہ دعا مانگوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانان کانپور پر رحم فرمائے اور

جس بے غیرتی اور بے حمیتی کی مثال انھوں نے قائم کی ہے اس کو اور زیادہ متعدی نہ کرے ۔۔۔۔ کیا آج خدا کی زمین پر کوئی نہیں کہ اس کی پرستش گاہوں کی عظمت کو برقرار رکھ سکے" (۲) ؛ نامورانِ غزوۂ بلقان (۲) "ہمدرد" دہلی کی اشاعت پُرجوش آمدید، جس کے سرِآغاز "اقبال کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ" ہے۔ یہ ذکر کرنے کے بعد اس بات کا پُرزور اظہار ہے کہ "فاطمہ پر سب سے پہلے ہم نے الہلال میں شائع کیا تھا" ؛ یعنی اقبال کی نظم الہلال سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے (۳) ۔ علم الانسان (۳) ۔ شبلی کی نظم "اسلام کا نظامِ حکومت" (۳) ۔ لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کے عنوان سے ایک طنزیہ ؛ آیت کا مفہوم اس انداز پر لیا گیا ہے کہ حکومت یا انگریز کے خلاف آواز بلند مت کرو ! (۳) ۔ "حظ و کرب بالذت والم" ۔۔۔۔ ایک اصطلاحی بحث ، از عبدالماجد بی۔اے (۲،۸) ۔ "قرآن کریم اور اصطلاح لفظ کفار" (۳) ۔ مسئلۂ کانپور ۔۔۔۔ "ہندوستان کے انگریزی عہد کی آزادی کا خاتمہ (۳) ۔ ملکِ حبش میں اسلامی حکومت (۳ ، ۱۴) ۔ مسجد کانپور کے سلسلہ میں مراسلے ، جن میں ہر جگہ ایڈیٹر الہلال کا ذکرِ خیر (۴) ۔ مجوزہ ماہنامہ البصائر (جس کا نام پہلے البیان تجویز ہوا تھا) کا مزید اشتہار ، جو دفتر الہلال سے نکلے گا اور جس کا موضوع قرآن اور متعلقہ علوم ہوں گے ؛ جس کا عربی ایڈیشن "الاتحاد الاسلامی" مہینہ میں دو بار نکلے گا (۵) ۔ مراسلات کے ذیل میں نواب محمد اسحاق خاں کا ایک مراسلہ ، انجمن الفرض ، محمڈن کالج ، کے بارے میں (۵) سرمد شہید کی سوانح مصنفہ ایڈیٹر الہلال کا اشتہار ، خواجہ حسن نظامی کی رائے کے ساتھ (۵) ۔ کانپور پر شذرات (۶ ، ۷) "مشہدِ اکبر" ۔۔۔۔ قضیۂ کانپور پر (۷ ، ....)[۲۴] ۔ "الشرک والعرب" کے عنوان سے علامہ رشید رضا کا ایک طویل مکتوب ، اصل عربی مع اردو ترجمہ کے (۷) ۔ "وثائق و حقائق" کی مستقل سرخی کے تحت "تبرّاتِ صوم" (۷) ۔ "جزائر الحبین" (۷) "کشفِ ساق" سے ، حضرت سلیمان کے قصہ میں ، قرآن کا صحیح مفہوم (۸ ، ...) ۔ "میں کون ہوں" ۔۔۔۔ انشائیہ از عبدالغفار اختر (۸) ۔ "کائناتِ الجوّ" از مرزا محمد عسکری لکھنوی (۸)[۲۵] "حظ و کرب" یا "لذت والم" کے سلسلہ میں اکبر الہ آبادی کا ایک مکتوب ، جس میں انھوں نے مولانا کی حمایت کی ہے اور لکھا ہے کہ "مسٹر ماجد علی کا ایڈریس ارشاد ہو تو ارادہ ہے کہ ان سے مراسلت کروں" (۸)[۲۶] ۔ "مشہدِ کانپور ، رویت و روایت" از ناظر ، نیاز ، سید رضا علی ، مظہر الحق اس ہنگامہ کے لیڈر ، مقدمہ کے پلیڈر (۸) ۔

---

[۲۴] "مضمون اس قدر پُرجوش تھا کہ گورنمنٹ نے قابلِ ضبطی قرار دیا ، اور اسی جرم میں الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی" ۔ سید سلیمان ، مکاتیب ، ۲ ، صفحہ ۹۶ [۲۵] مرزا محمد عسکری کے لئے مزید ملاحظہ ہو ضمیمہ ۔ ۱۴ [۲۶] عبدالماجد صاحب کو ماجد علی لکھا ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود عبدالماجد صاحب کے بقول اکبر انھیں اس سے پہلے سے خوب اچھی طرح جانتے ہی نہ تھے بلکہ بزرگانہ شفقت بھی تھی ۔

"عربی زبان اور علمی اصطلاحات" از مولانا سید سلیمان۔ (۹، مسلسل)۔ "مطالبۂ حق پر اصرار" از رحیم قدوائی
—— مصری زعیم مصطفیٰ کامل کے اقوال سے پُر ایک مضمون (۹)۔ عربی زبان اور علمی اصطلاحات از ایڈیٹر الہلال
(۱۰-۱۱)۔ مراسلات میں ایڈیٹر الہلال کی خدمات اور علم و فضل کے چرچے (۱۰-۱۱)۔ "شیعہ سنّی اتحاد پر" از فدا حسین،
شعبۂ تھیالوجی، علی گڑھ (۱۰-۱۱)۔ "انسانیت کا غم": مسئلہ کانپور، مقدمۂ کانپور، مجلس دفاعِ مسجد کانپور کی تشکیل:
ابوالکلام صدر، فضل الحق سیکریٹری (۱۲)۔ "الفتنۃ اللغویہ" کے عنوان سے وہی 'خطِ کرب' کی بحث جس میں ماجد صاحب
خوب رگید ا ہے۔ (۱۲، ۱۴)۔ مراسلات کے ذیل میں حاجی اسماعیل کا مراسلہ جس میں ایڈیٹر الہلال کو زجر و توبیخ اور
تنبیہ کرنے کے بعد مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے کو مذہب تک ہی محدود رکھیں، سیاست میں دخل نہ دیں۔ انداز کچھ
یہ ہے کہ: رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند + گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش! 'خسرواں' میں علی گڑھ والوں کو
سمجھ لیجیے (۱۲) خواجہ حسن نظامی کے ایک مراسلہ میں 'حزب اللہ' کے ذیل میں مولانا کی مدح سرائیاں، انداز یہ ہے
کہ اسکیم اگرچہ مبہم ہے، مگر، واہ! (۱۳) الہلال پریس کی ضمانت ۱۸ ستمبر کو (۱۳)۔ شبلی کی ایک نظم (۱۳)۔ قصص
بنی اسرائیل (۱۳، ۱۶، ۲۰، ۲۱)۔ شبلی کی نظم "مساواتِ اسلامی" (۱۴) "الہلال کی ضمانت: ایک نہایت اہم
خزینۂ مدافعت کی تاسیس: مجلس دفاعِ مطابع و جرائد ہند، انڈین پریس ایسوسی ایشن" —— اس عنوان سے
الہلال کی ستمبر میں دو ہزار کی ضمانت کے ردِّ عمل میں انڈین پریس ایسوسی ایشن کی پرزور تجویز (۱۴) تصاویر عبرت،
کانپور (۱۳ —— ۱۶)۔ مسلم گزٹ سے وحید الدین سلیم کے نکالے جانے پر اداریے (۱۴، ۱۵) "شہدائے کانپور اعلی اللہ مقامہم":
مسلمانوں کو خوب غیرت دلائی ہے! آخر میں پس ماندگان کے لئے چندے کی اپیل کی ہے (۱۴)۔ اظہارِ وفاداری کے لئے
۲۰ اکتوبر کو نواب رام پور کی صدارت میں جلسہ: مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ کانپور کا ہنگامہ اب ختم کر دینا چاہیے! اور
اس بات کا اظہار کہ مسلمانوں کی صحیح نمائندگی محمد علی نہیں کر رہے ہیں، اس لئے نیابت کا حق نواب رام پور کا ہے (۱۵)۔
"اسلام میں مساجد کی حیثیتِ دینی: مساجدِ اسلامیہ اور خطباتِ سیاسیہ" —— انجمن اسلامیہ لاہور کا رزولوشن کہ
مسجدیں اس کام کے لئے نہیں: مولانا نے اس کی سخت مخالفت میں یہ طویل آرٹکل لکھا ہے (۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸)۔
انڈین پریس ایسوسی ایشن بنانے کے سلسلہ میں، سریندر ناتھ بینرجی، موتی لال گھوش ایڈیٹر 'پتر کا' اور مجیب الرحمٰن
ایڈیٹر 'مسلمان' کا تعاون: 'پوجا' کے بعد کام شروع ہوگا یعنی نومبر بعد (۱۵) شبلی کی نظم "احرارِ قوم" (۱۵) "شاہ جارج
الہلال اور اشغالِ سیاسیہ" کے تحت اسماعیل خاں کا ایک اور خط (۱۵)۔ فتنۂ عمّان پر سیکریٹری سلطان مسقط کا خط،
مولانا کے نام: اس میں عمان کے سلطان کی پوزیشن صاف کی گئی ہے۔ [عمان کا مسئلہ ان دنوں مشرقِ وسطیٰ کے

اہم مسائل میں سے ایک تھا؛ جلد ہی انگریز اُسے اپنے سایۂ عاطفت میں لینے والے تھے اور سلطان معاہدہ پر راضی ہوگیا تھا] ؛ اس کے ساتھ ایڈیٹر الہلال کا ایک نوٹ اِسی سلسلہ میں۔ (۱۵)۔ شذرات: "گمشدہ ضلع کی واپسی: ہز ایکسلنسی لارڈ ہارڈنگ کی دانشمندی اور مزید دانشمندی کی ضرورت" ——— مسجد کانپور واپس مل گئی (۱۶-۱۹) "عربی زبان اور علمی اصطلاحات: استدراک" از ابو المکارم عبدالوہاب + آخر میں وضع اصطلاحات پر الہلال کا نوٹ، کہ عربی کو ماخذ بنانا چاہیے ثقل سے بچنا چاہیے؛ لفظ مختصر اور رواں ہوں اور کوئی ضرورت نہیں کہ اپنے اصلی مفہوم میں مستعار لئے جائیں، ہاں اصولِ لسانیہ کے لحاظ سے صحیح ضرور ہوں (۱۶) شبلی کی نظم "شر الصلح" (۱۶)۔ "حادثۂ فاجعہ کانپور": فوٹو گروپ: ڈاکٹر ناظر الدین، راس مسعود، مظہر الحق، تصدق حسین، سید فضل الرحمٰن، ڈاکٹر محمود اور خواجہ عبدالمجید (۱۷)۔ "الفتنۃ اللغویۃ" کے سلسلہ میں عبدالماجد صاحب کا ایک تلخ خط (۱۷) "پریس ایکٹ اور الہلال" کے سلسلہ میں مراسلات میں ایڈیٹر الہلال کا پروپیگنڈا (۱۷)۔ "ان فی ذالک لآیات لقوم یوقنون: آئرلینڈ ہوم رول بل" ——— تاریخی پس منظر (۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱)۔ "فن مکالمہ" از ظفر حسن + الہلال کی تجویز کہ مکالمہ کی جگہ خطابت کا لفظ زیادہ مناسب ہے (۱۷)۔ شبلی اور نیاز فتحپوری کی منظومات (۱۸، ۱۹) خطوط میں ایڈیٹر الہلال کا پروپیگنڈا "روح روانِ اسلام مولانا ابوالکلام" (۱۸، ۱۹)۔ مسئلہ عمان: مرحوم سلطان فیصل امیر عمان۔ (۱۹، ۲۰، ۲۱)۔ "النبأء الالیم" ——— "جنوبی افریقا اور رئیس الاحرار مسٹر گاندھی" پر شذرات (۲۰، ۲۱، ۲۲)۔ مطبوعاتِ جدیدہ کی بی۔ کے۔ داس کی انگریزی کتاب "مسجد کانپور" کا تذکرہ (۲۰-۲۱)۔ "مجالس ذکر مولد: ادارہ سیرۃ نبوی" ——— ایک معیاری مجموعہ مولود کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے تیار کیا جائے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ وہ خود ایسا مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ (۲۰، ۲۱) تصویر: "رئیس الاحرار مسٹر گاندھی ——— جو بیس سال سے جنوبی افریقا میں ہندستانیوں کے حقوق کی قیادت کر رہے ہیں" (۲۲)۔ تصویر: "مسٹر ربندر ناتھ ٹیگور ——— ——— جنھیں حال ہی میں ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ کا نوبل پرائز دیا گیا ہے" [ٹیگور کی اس سے اچھی تصویر شاید ایک آدھ ہی ہو] (۲۲)۔ اہل تسنن و اہل تشیع میں اتفاق کی ضرورت" از خادم حسین (۲۲)۔ "عہد اسلامی اور تجربات" (۲۲)۔ "اسئلۃ و اجوبتہا" کے ذیل میں "طریق تذکرہ و تسمیۂ خواتین" ——— لکھا ہے کہ خواتین کا نام لے کر تذکرہ کرنا بالکل ٹھیک ہے (۲۲)۔ [الہلال کے صفحات کی تعداد جو ۱۹۱۳ء کے شروع میں ۱۶ ہونے لگی تھی اب ۲۰ کر دی گئی]۔ "عشرۂ محرم الحرام" (۲۳)، انڈین نیشنل کانگریس، کراچی، اور مسلم لیگ کانفرنس آگرہ۔ (۲۳)۔ شبلی کی نظم "خلقِ عظیم" (۲۴)۔ جنوبی افریقا (۲۳ ——— ۲۵)۔ اس انداز کے شذرات جیسے

مسلمانوں کو پس الہلال ہی نے جگایا ہے (۲۴) مسئلہ عراق، اور ـــــ مسئلہ شام (۲۵) شبلی ایک گروپ میں (۲۵)۔

۱۹۱۴ء میں الہلال کی چوتھی جلد، اور ۱۹۱۴ء کی پہلی جلد شروع ہونے سے پہلے سید سلیمان الہلال کو چھوڑ چکے تھے اور باوجود مولانا کے بے حد ملتجیانہ اصرار کے پھر کبھی شامل نہیں ہوئے۔[۵۲] عبدالسلام ندوی اس جلد کے خاتمہ کے قریب شاملِ ادارہ ہوئے اس عرصہ میں ندوی گروپ کی نمائندگی غالباً عبدالماجد ندوی تنہا کرتے رہے یا پھر عبداللہ عمادی تھے۔

اس جلد کے مستقل قسم کے عنوان "شئونِ عثمانیہ"، "کارزارِ طرابلس" اور "ندوۃ العلماء" تھے۔ اہم چیزیں یہ تھیں: شیعہ سنی اتحاد (۱، ۲؛ ـــ ۷، اور ۱۴ جنوری) ۔ مسقط (۳)۔ صدر مسلم لیگ کی تقریر کا متن (۲۰۳)۔ ندوۃ العلماء (۳ ـــ ۱۴)۔ مرادآباد کے اخبار "نیرِ اعظم" کا اشتہار، جو ۲۹ سال سے جاری ہے (۳)۔ حاجی اسماعیل خاں کے "افادہ" (آگرہ) پر تبصرہ (۴)۔ صدر مسلم لیگ ابراہیم رحمت اللہ کی تقریر کی بے حد تعریف (۵)۔ حادثۂ زمیندار پریس (۵، ۶) زمیندار کے لئے چندہ جمع ہونا شروع؛ پریس ایسوسی ایشن قائم ہو چکی مگر کوئی کانفرنس نہ ہو سکی اس پر افسوس کا اظہار (۷)۔ "علوم القرآن" از سید سلیمان (۶)۔ "اخوان الصفا" کی سرخی کے ذیل میں دارالمصنفین کے نام سے شبلی کی ایک اکیڈیمی کی تشکیل کی تجویز؛ ایڈیٹر الہلال کے طویل تمہیدی نوٹ میں مفصل تائید (۶)۔ زمیندار شائع ہو گیا (۸)۔ ارضِ مقدس میں یہودیوں کا عود (۶، ۲۳)۔ کلکتہ کی مسجد لشکر پور کا قضیہ (۹، ۱۰، ۱۳، ۱۹، ۲۰، ۲۱) جنوبی قطب (۹، ۱۰)۔ حقیقۃ الصلوٰۃ (۹، ۱۰، ۱۱)۔ ندوہ میں اسٹرائک (۹-۱۰)۔ "صدا بصحرا": الہلال پر کافی مالی دباؤ پڑ چکا ہے، اب اگر دو ہزار خریدار نہ بنے تو الہلال کو بند کر دیا جائے گا، اور یہ کہ الہلال کو دورِ اول کے

---

[۵۲] "افسوس کہ جس خط کا منتظر تھا وہ باوجود وعدہ آپ نے نہیں لکھا اور اس طرح اصلاح و مشورہ کی سعی نہ کی جو ایماناً و اخلاقاً آپ پر فرض ہے۔ بہرحال آج اپنی شورشِ قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے تو غیر از صبر چارہ نہیں ......۔ آپ نے پونا میں پروفیسری قبول کر لی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے ...... کیا حاصل اس سے کہ چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھا دی؛ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ لاکھوں کو زندگی سکھا سکتے ہیں ......۔ آپ آ کر الہلال بالکل لے لیجئے؛ جس طرح جی چاہے اُسے ایڈٹ کیجئے۔ مجھے سوا اس کے اصول و پالیسی کے (جن میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں ......۔ عربی کے لئے مولوی عبدالماجد صاحب کا وعدہ گریز کے لئے ہے، ایک اور شخص آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے، اور وہ علناً دوسرا آپ کی ایڈیٹری میں روزِ اول سے ہو گا ...... سردست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپے منظور فرمائیں، تیس کلکتہ کے انتظام و مصارف کے لئے ہیں۔ اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہو گا یہاں تک کہ دو سو پورے ہو جائیں ..... پروف کریکشن کے لئے انور علی آ گئے ہیں"۔ (مکاتیب ابوالکلام آزاد: مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، مورخہ ۹ جنوری ۱۹۱۴ء، لکھنؤ)

طور پر جوشن پورا کرتا تھا وہ پورا کر چکا ہے وغیرہ وغیرہ (۱۱، ۱۲) ۔ مسلم گزٹ ختم ہو گیا (۱۲) مسلم گزٹ بار دوم (۱۳)۔ دہلی ڈیپوٹیشن (۱۳) ۔ نظامت ندوۃ (۱۳ — ۱۶) "اساطیر الاولین" از سید سلیمان (۱۵ — ۱۶)۔ مساجد اسلامیہ اور مجالسِ سیاسیہ (۱۴) ۔ ندوۃ کے اسٹرائک کے بارے میں عبدالسلام ندوی کے خط کے متعلق حسرت موہانی کی طویل تحریر (۱۷) "اسئلۃ واجوبتہا" کے تحت احیاء العلوم میں مندرجہ احادیث پر بحث (۱۸) مسلم گزٹ پھر بند (۱۹، ۲۰) ۔ ندوۃ کے سلسلہ میں عبدالسلام ندوی کا ایک اور خط (۲۲) ۔ "اسئلۃ واجوبتہا" کے تحت واقعۂ ایلا کی تحقیق (۱۹ — ۲۰ — ۲۴) ۔ یمن، عمان اور حضرموت (۲۳) ۔ ۱۰ رمئی کا جلسہ دہلی، ندوۃ کے سلسلہ میں: از حکیم محمد اجمل خاں (۱۹، ۲۵) مرزا غالب مرحوم کا کلام: "کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام"، اس قصیدہ کا مکمل متن، مع تمہید، تجزیہ اور تعیینِ تاریخی پر بحث کے۔ تجزیہ اور تاریخ کے تعین میں مولانا نے اس میں بچکانہ غلطیاں کی ہیں[۲۵]۔ تاہم کلام غالب سے ان کے شغف اور نکھرے ہوئے شعری ذوق کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ (۱۷ جون ۱۹۱۴ء) ۔ "رباعیاتِ عمر الخیام کا ایک نیا امریکن ایڈیشن"؛ خیام کی رباعیوں کی ترتیب پر بہت عمدہ تبصرہ (۲۵) ۔ شبلی کی عدلِ جہانگیری (۲۵) ۔

۱۹۱۴ء کی دوسری جلد اور الہلال کی پانچویں جلد کا خاص موضوع تو کچھ ہی عرصہ بعد چھڑ جانے والی عالمگیر جنگ ہی ہو گئی، مگر دوسرے اہم موضوعات بھی اپنی مستحق جگہ حاصل کرتے رہے، جن میں مندرجہ ذیل چیزیں قابلِ ذکر تھیں۔
اقبال کے شکوہ کے انداز پر نیاز فتحپوری کی "التجائے پروانہ"؛ ۔ خیام والے مضمون کی دوسری قسط؛ غیر مطبوعہ کلام غالب: "ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں"؛ ۔ ان الحکم الا للہ (۱) "حادثۂ کراچی بائسکوپ"؛ بائسکوپ میں رسول کو عشق کرتے دکھایا گیا ہے؛ ۔ بابو گنگا پرشاد ورما ایڈیٹر "ہندستانی" لکھنؤ کی تعزیت؛ ۔ اعلان تشکیل جماعت "حزب اللہ" ۔ "علوم القرآن"؛ "الفاظ القرآن" از سید سلیمان ندوی (۲) ۔ تفسیر القرآن (۳)
آئندہ سے سالانہ قیمت ۸ کے بجائے ۱۲ روپے اور پورے دسمبر میں تعطیل کا اعلان؛ ۔ ندوۃ العلما؛ ۔ غیر مطبوعہ کلام غالب: "شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ" (۴) ۔ "حزب اللہ کے مرکزی دار الجماعۃ کی تاسیس"؛ — ندوۃ؛ — اعتصام اور اسلام (۵) — "اعتصاب اور اسلام" اسلام کے اسٹرائک کی شرعی نوعیت از عبدالسلام ندوی (۱ — ۵) جنگ چھڑنے پر اداریہ؛ — ندوۃ (۶) رائل سائز کے چار صفحے اور ۴ کالم پر مشتمل،

---

[۲۵] مولانا مہر کے توجہ دلانے پر مولانا نے خود اس کا اعتراف کر لیا تھا۔ "نقشِ آزاد" ص ۴۲-۴۳، ۱۹۹۱ء۔ مزید دیکھئے دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی (انجمن ترقی اردو۔ ہند) کے حواشی ص ۳۰۸

زمانۂ جنگ کے لئے ایک روزانہ' الہلال کا ضمیمہ' نکالنے کا ارادہ (۷)۔ اشتہارات میں دہلی کے ایک اخبار اللہ اکبر کا اشتہار بھی (۸ —— ۹) مصری صحافی اور الہلال کے مشہور اڈیٹر جرجی زیدان کی وفات کی خبر اور تعزیت (۱۰)۔ الحرب فی القرآن (۱۰) ۔ ماہِ قدس: رمضان؛ —— لیلۃ القدر؛ —— بابُ التفسیر: "علی الذین یطیقونہ" (۱۲) شبیر احمد عثمانی' عبدالسلام ندوی کے جواب میں، "الاعتصاب فی الاسلام" پر، کہ یہ اسلام میں جائز نہیں (۱ —— ۹) —— نواب راجاؤں کے فوٹو جنھوں نے جنگ میں برطانیا کی مدد کی ہے (۱۹ —— ۱۱)۔ فاتحین کا داخلہ مفتوح ممالک میں" (۱۹) ۔ "الہلال اور پایونیر۔ کلکتہ میں پرو جرمنزم" (۱۹): پایونیر نے لکھا ہے: "آغازِ جنگ کے وقت سے اس (الہلال) کی روش حیرت انگیز طور پر پرو جرمن رہی ہے؛ جو لوگ اخبارات پڑھتے رہتے ہیں ان کے لئے یہ امر متعجب انگیز ہے کہ کیونکر گورنمنٹ ابتک اس کی تحریروں کو برداشت کرتی رہی"؛ ایک سبب کلکتہ سے اس کی اشاعت ہے جہاں اردو کم سمجھی جاتی ہے؛ "ایک اور سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے سب سے زیادہ شرارت انگیز مضامین کا اسلوب کنایہ آمیز مخفی استہزا یا پوشیدہ تمسخر اور اشارات سے لبریز ہوتا ہے' جن میں سے اکثر کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ان کا ترجمہ انگریزی میں کیا جاتا ہے تو یا تو ان کا اثر غائب ہوجاتا ہے یا وہ اثر کارگر نہیں ہوتا..... اس کا اڈیٹر جو قرآن کے اقتباس کرنے کا بے حد شائق ہے، اس نے قرآن کی مشہور آیت (جرمنی کی پیرس کی طرف پیش قدمی کے موقع پر) اقتباس کی تھی جس میں مکڑی کے جالے کے کمزور ہونے کا ذکر ہے"۔ —— پایونیر کا یہ اداریہ نقل کرنے کے بعد الہلال نے مفصل تبصرہ کیا ہے (۱۹) "القارعۃ"، ترکی کے پہلی نومبر کو اعلان جنگ پر: "مسلمان شرعاً اور دیناً ترکوں سے محبت پر مجبور ہیں مگر اس سے ہندستان پر کیا اثر؟" (۱۹)۔ وفات شبلی + تصویر (۲۰)۔ الہلال کی دو ہزار کی ضمانت ضبط، اور اس سلئے یہ آخری پرچہ (۲۰)۔

---

۱۶ - ۱۵ ۱۹ ء میں الہلال، البلاغ کے نام سے نکلا۔ اگر نام کی تبدیلی کو نظر انداز کردیا جائے تو یہ الہلال کی چھٹی جلد تھی سرِورق "لاتحضوا ولا تحزنوا..... کے بعد" ھذا بلاغ للناس ولینذروا بہ ولیعلموا انما ھو الہ واحد ولیذکر اولوالالباب" لکھا رہتا تھا۔ پھر "ترجمان القرآن" کا اشتہار (جو ۱۵ سال بعد جاکر پوری ہوئی)۔ پہلا پرچہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو شائع ہوا اس میں پہلے صفحہ پر اقبال کی نظم "عرفی" تھی: "نوا را تلخ ترمیزن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"۔ پانچ صفحوں میں قرآنی آیات کی مدد سے فاتحۃ البلاغ ترتیب دی گئی تھی۔ "اسوۂ حسنۃ"؛ "جنگ کا اثر اخلاق پر"، اور "جنگ کا اثر فنِ روایت پر" کے عنوانوں سے اداریہ، "بصائر و حکم" اور "مقالات" کا حصہ

ترتیب دیا گیا تھا۔ 'مذاکرۂ علمیہ' میں نیند کی حقیقت پر ایک مضمون تھا اور 'آثار عتیقہ' کے تحت "آثار اسلامیہ امارت بیجاپور" پر سید سلیمان کا مصور مضمون۔ دارالارشاد کے افتتاح کی خبر تھی اور 'البیان فی مقاصد القرآن' کا اشتہار تھا۔

دوسرے پرچے، مورخہ ۲۶ نومبر میں فاتحۂ البلاغ جاری تھی۔ پھر "ما لا بد منہ" کے تحت اخبار کی اشاعت میں گوناگوں مشکلات کی تفاصیل تھیں۔ علاوہ ازیں:۔

امام حسین کے سلسلہ میں ایڈیٹر البلاغ کی ایک تقریر: توصیۂ شہادت:۔۔۔ جنگ کا اثر اخلاق پر (مسلسل، دو قسطوں میں تمام ہوا)؛ ۔۔۔ حادثۂ محزنۂ کربلا؛ ۔۔۔ امن اور اسلام (باب التفسیر، فلسفۂ احتساب):۔ حسرت موہانی کی غزل:

اربابِ وفا پرست وحق کوش تھا جن سے دیارِ صدق آباد
سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت گویا ہیں ابوالکلام آزاد

تاریخ امۃ مسلمہ؛۔ سید سلیمان کے آثارِ عتیقہ کی دوسری قسط:۔۔۔ غزواتِ اسلامیہ اور تجارت؛۔ المراسلۃ والمناظرہ کے تحت: 'النوم' از روئے طب قدیم، از محمد علی بیگ، دہلی:۔

تیسرے شمارہ میں (مورخہ ۱۰ دسمبر):۔

بعض اطلاعات مہمہ (تجارتی باتیں)؛۔۔۔ شذرات: عہد التوا و انتظار: یادِ رفتہ کا ایک لمحۂ فکریہ؛۔۔۔ نظرے خوش گزرے: معاونین البلاغ اور اہم مسائل، مسئلۂ اعراضِ نظر و مطالعہ؛۔۔۔ السلم والحرب یعنی جنگ اور صلح؛۔۔۔ الحرب فی الاسلام از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی؛۔۔۔ "اسیرانِ جنگ"؛ مقالہ؛۔۔۔ اشتہار: گریٹ یورپین وار میپ، ایڈیٹر الہلال کی رائے۔۔۔۔

شمارہ ۴ و ۵ (۱۷ اور ۲۴ دسمبر):۔

بعض اسئلۂ مہمہ: حدیث 'اختلاف امتی رحمۃ'، از مولانا علی احمد مدراسی؛ مقالہ "اسیرانِ جنگ" کی دوسری قسط:۔۔۔ مرحوم مولانا شبلی نعمانی، حیاتِ علمی و ادبی پر ایک سرسری نظر؛۔۔۔ فلسفۂ اجتماع اور جنگ؛۔۔۔ الحریۃ فی الاسلام؛۔۔۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تاریخ معتزلہ کا ایک صفحہ: غیلان دمشقی؛۔۔۔ مراسلات میں 'سورۂ والتین'، از مولانا مظہرالدین شیرکوٹی؛۔۔۔ الہلال کے بارے میں مرتضیٰ نونہروی کا نثری قصیدہ۔

شمارہ ۶ و ۷ (۱۴ اور ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ء)

البلاغ کی اشاعت میں تاخیر کی معذرتیں اور آئندہ کے لئے اعلان کہ آئندہ سے بدستور قدیم ہفتہ وار

شائع ہوگا — عید التوا و انتظار؛ — تذکار مقدس ماہِ ربیع الاول؛ ولادت نبوی؛ — مواعظ؛ خطب ماہِ ربیع الاول؛ — مقالات: الدین والسیاست؛ — بصائر و حکم: جنگ اور مطالعۂ علم النفس؛ — اسوۂ حسنہ، (جو البلاغ کی آغازِ اشاعت سے چل رہا تھا، جاری ہے)؛ اسوۂ محمدیؐ کا ایک صفحہ؛ — اسئلہ واجوبتھا؛ حکومتِ شوریٰ اور اسلام، خلافت راشدۂ اسلامیہ کا نظام جمہوری، از مصباح الدین، لشکر گوالیار؛ — تاریخ معتزلہ؛ نظائر و امثال؛ — آل انڈیا محمڈن کانفرنس اور دعوت اسلام؛ — مختارات؛ الحرب فی الاسلام (مسلسل)۔

شمارہ ۸ و ۹ (۲۸ جنوری و ۸ فروری): دعوت الی القرآن (مسلسل)؛ — شذرات: مسلم لیگ۔ احمار اسلام۔ الامر بالمعروف و نہی عن المنکر؛ — تربیت عسکریہ اور قرآن حکیم (مسلسل)؛ —

شمارہ ۱۰ (۱۱ فروری): مراسلات۔ سید سلیمان کا اسلام اور سوشلزم (از دار المصنفین اعظم گڑھ)؛ —

شمارہ ۱۱ (۱۸ فروری)، شذرات، مجوزہ شیعہ کالج — علم الانسان (انیتھراپولوجی)؛ ایک نئی زمین کا اکتشاف؛ دائرۂ قطب شمالی (بریدِ فرنگ)؛ — "اصلاح معاشرت اور اسلام" از سید سلیمان (مسلسل)؛ —

شمارہ ۱۲ (۲۵ فروری): — عراق و لیلائے عراق؛ — اسئلہ واجوبتھا؛ تفسیر سورہ والتین از وصی احمد بلگرامی؛ — مطبوعات جدیدہ، معراج العقول؛ "حضرت سلمان فارسی" از عبد السلام ندوی (اسوۂ حسنہ)؛

شمارہ ۱۳ و ۱۴ (۳ و ۱۰ مارچ)؛ —

"شیعہ کالج" کی آخری قسط؛ — افسانۂ ہجر و وصال — حقیقتِ بنائے اسلام و فنائے کفر؛ — انسان کی حیاتِ صالحہ اور اسکی طبعی عمر — نسیم شمال (ایران)۔ اور سراج الاخبار (افغانستان) میں البلاغ پر تبصرہ؛ — تفسیر سورۂ کریمہ ماعون، از خواجہ عبد الحی سابق پرفیسر میرٹھ کالج؛ — "جامعہ ازہر" از سید سلیمان ندوی (مسلسل)؛ —

شمارہ ۱۵ و ۱۶، ۱۷ (۱۷ و ۲۴ مارچ و ۳۱ اپریل)، آخری شمارہ:۔

اداریہ: قفا نبک من ذکری حبیب ومنزلٍ: الی مہاجرالی ربّی انہ ھوالعزیز الحکیم"؛ (اداریہ میں کہا ہے کہ حکومت بنگال نے مجھے حدود بنگال چھوڑ دینے کا حکم دے دیا ہے اس لئے میں چلا)؛ — مسئلہ مسلم یونیورسٹی اور علوم و معارفِ جدید؛ — افسانۂ زلف یا مسلم یونیورسٹی؛ — میرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام: (قصیدۂ یوسف علی خاں): "مرحبا سال فرخی آئیں"؛ — اسئلہ واجوبتھا: حکم رضاع و محرمات رضاعۃ؛ —

ز حکیم غلام غوث ؛ ـــ مسئلہ تسمیہ طٰہٰ و یاسین ، ایک مستفسر ، از آرہ ؛ ـــ المراسلۃ والمناظرۃ : بیع خرید مسئلہ جارۂ اراضی مروجہ ؛ از ابوالنصر محمد عبدالقادر مفتی ریاست جموں" ـــ اسوۂ حسنہ : صحابۂ کرام ؛ ـــ مراسلات یں : مجوزہ شیعہ کالج ؛ ـــ غلام علی آزاد بلگرامی کی "ماثرالکرام" اور "سروِ آزاد" ، چراغ علی کی "اعظم الکلام" رعلی لطف کے "گلشنِ ہند" پر ریویو -

[۳ر اپریل کا پرچہ نکال کر مولانا رانچی پہنچ گئے ۔ خود تو کلکتہ نہیں رہ سکتے تھے مگر البلاغ کی اشاعت کا تو کچھ بچھ انتظام ہو ہی سکتا تھا ، کلکتہ میں کچھ انتظام کر کے گئے اور رانچی پہنچ کر ۸ ، اپریل کو سید سلیمان ندوی کو لکھا :

" میں سرِ دست رانچی آگیا ہوں ؛ البلاغ جاری رہے گا ۔ آپ اور تو کچھ نہیں کر سکتے ، کم سے کم اتنا کیجئے کہ ہر دو ہفتہ میں ایک مضمون بقدر آٹھ کالم کے دیدیا کیجئے ۔ اور مولوی عبدالسلام سے کہئے کہ ہر دو ہفتہ میں وہ بھی اتنی ہی مقدار کا لکھ بھیجیں ؛ اس طرح دو فارموں کا انتظام ہو جائے گا ۔ باقی تین فارم میں خود لکھ لوں گا ۔ مولوی عبدالسلام سے لئے کہ یا تو علمی ذوق سے لکھیں یا معاوضہ لیں ، میں ہر طرح تیار ہوں ؛ کم سے کم چند نمبر تک تو ایسا کیجئے ...... بلاغ کے ابواب آپ کو معلوم ہیں ؛ مقالات ، اسوۂ حسنہ ، مذاکرۂ علمیہ ، انتقاد ، تاریخ وغیرہ ۔ ان کے مقاصد بھی علوم ہیں ؛ باب التفسیر میں خود لکھا کروں گا ......" [28]

مگر باوجود تمام تر کوششوں کے البلاغ پھر کبھی نہ نکلا]

تیرہ سال بعد ، ۱۰ر جون ، ۱۹۲۷ء کو ۲۸ صفحات پر مشتمل الہلال ہی کے نام سے مرحوم الہلال نے دوسرا جنم لیا ۔ س بار وہ اپنی ہیئت بالکل بدل چکا تھا ، سرورق بالکل سادہ تھا جس پر صرف الہلال ، البلاغ پریس کلکتہ ، اور قیمت ا پرچہ پانچ آنہ لکھا تھا اندر پہلے صفحے پر ،

الہلال : ایک ہفتہ وار مصوّر رسالہ

کلکتہ (دن) (ہجری تاریخ) (انگریزی تاریخ)

لکھا ہوتا تھا ؛ نہ ایڈیٹر کا نام تھا نہ ترتیب میں وہ جوش و خروش ؛ نہ سیاست گری تھی نہ لیڈری ـــ شاید وہ اب ن سب سے بالاتر ہو چکے تھے ، مولانا کے ساتھ ان کے مددگار مرتبوں میں غلام احمد جامعی ، چراغ حسن حسرت اور ولانائے ملیح آبادی [29] (اور غالباً خواجہ عبدالحی بھی) تھے [30] ۔ اس بار صرف ۱۲ صفحے ٹائپ میں چھپتے تھے ، باقی سب لیتھو میں

---

۲۸ "مکاتیب ابوالکلام آزاد" شائع کردہ ادبستان ، لاہور ؛ ۲۹ عبداللہ بٹ کی "ابوالکلام آزاد" میں حسرت کا مضمون "مولانا آزاد کلام" ، ص ۲۴۳-۲۴۴ ؛
۳۰ خواجہ صاحب کے بارے میں مجھے بالکل صحیح اطلاع نہیں مل سکی ۔ انھوں نے الہلال میں کام ضرور کیا ہے پہلے دور میں یا اس دوسرے میں ۔ پہلے کے ے میں مجھے اب اسلئے شک ہونے لگا کہ ماجد صاحب نے اپنے مکتوب میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے ۔ ویسے البلاغ میں ان کا ایک مضمون میں نے ضرور یکھا ہے اور اس لئے کچھ خیال ہوتا ہے ۔

یہ الہلال اخبار یا مولانا کے اصطلاحی رسالہ سے زیادہ انھیں کی اصطلاح میں مجلّہ کہلانے کا زیادہ مستحق ہے
ہر صفحے پر اکادمیت نمایاں تھی۔ ترتیب میں مستقل قسم کے عنوان یہ تھے :

آثارِ عتیقہ : اس کے ذیل میں شہرِ رقیم، بابل، وغیرہ کے انکشافات پر معلوماتی نوٹ ہوتے تھے ۔

مکاتیب : جرمنی، لندن، فرانس، امریکا، حجاز، مصر، شام، قسطنطنیہ، اور انگورہ سے الہلال کے نمائندوں کے خطوط مطبوعات جدیدہ سے اقتباسات۔ سیاحوں کے تاثرات۔ دلچسپ خبریں۔ احرارِ اسلام۔ مغرب کی تاریخ جدیدہ کی شخصیتیں۔ مشرق کی تاریخ جدیدہ کی شخصیتیں۔ "انسانیت موت کے دروازے پر"؛ مشاہیر کا آخری وقت۔ مذاکرۂ علمیہ : "حیات کا آغاز" وغیرہ جیسے موضوعات۔ مختصرات مختارات: یعنی انتخاب۔ اور کبھی کبھی ایک افسانہ۔

۲۴ر جون کی اشاعت میں لکھا تھا :

" الہلال کے لئے اب اہم موضوعات یہ ہوں گے:

ملک کی سیاسی زندگی کے اہم مسائل؛ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا موجودہ ذہنی اور انتشار جو پچھلی حرکت کے ردِعمل کی صورت میں ظاہر ہوا، اور اس کے عملی مسائل و مباحث؛ مسلمانانِ ہند کی قومی و اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور اس کے اہم مباحث۔

لیکن، یہ کچھ بھی نہ ہو سکا۔ اس کا اصل سبب مولانا نے اسی پرچے میں ایک جگہ خود ہی ظاہر کر دیا ہے حکایت 'برق و خرمن' کے عنوان سے اپنی ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک کی سرگزشت لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"علم کی زندگی سیاست کی زندگی سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں کا ایک ہی وقت اور محل پر جمع ہونا بہت مشکل ہے۔ میری زندگی کی مشکلات میں پہلی مشکل یہ واقع ہوئی کہ میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت اور بیک محل جمع کر دوں"!

خود یہ مولانا کی ٹریجڈی بھی تھی، الہلال دورِ دوم کی بھی!

اس الہلال میں دوسری معاصر اہم چیزوں کے علاوہ مصر، شام، حجاز اور ترکی کے بارے میں الہلال کے نمائندوں کے قلم سے دستاویزی اہمیت رکھنے والی معاصر تحریریں، خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ دوسرے اہم مشمولات یہ ہیں:
ذرۂ آب کی سرگزشت؛ اندلس میں اسلامی تمدن کا آخری نقشِ قدم؛ اسلام اور نیشنلزم؛ بصائر و حکم: مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا؛ مومن و منکر کا مکالمہ؛ تفریح و ترویج فکر: بعض مشاہیر کے لطیفے (شمارہ ۱)۔ سفر نامۂ دنیائے اسلام

از محمد شفیق مصری (مسلسل)۔ ترجمہ؛ برقی مچھلیاں ؛ عالم شرق و اسلام: علیؓ ؛ حکایتِ برق و خرمن (مسلسل)؛ "شاعر اور بلبل" : موجودہ ترکی شاعری کا ایک نمونہ (۲) ؛ کتاب "رنگیلا رسول"؛ دیش بندھو چترنجن داس ؛ "ٹکسیلا" از سید ولی اللہ ایبٹ آبادی (۳-۴)۔ ایک مصری سیاح کے تاثرات : ٹیونس اور البانیا ؛ عربی اور انگریزی کے ہم معنی و ہم آواز الفاظ کی طویل فہرست ؛ انسانیت موت کے دروازے پر حسینؓ بن علیؓ (۶)

افسانہ: "محبت اور قربانی یا انتقام اور سزا۔ وکٹر ہیوگو کا بشپ اور تاریخ اسلام کا بغدادی" [یہ افسانہ ہیوگو کے مشہور افسانے کے انداز پر جنید بغدادی کی سیرت کے اسی پہلو پر معاصر تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، چور کا نام ابن ساباط ہے۔ پلاٹ میں ہیوگو سے حیرت انگیز تطابق ہے۔ بغدادی کا کردار بشپ سے کہیں زیادہ اونچا ہو گیا ہے، عبارت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ مولانا نے ہی لکھا ہے، اسلوب اور مواد دونوں کے لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے] (۷)۔ والیٹر: انقلاب فرانس کے ارکانِ ثلاثہ میں سے ایک (۷) "نظریۂ ارتقا کا گمشدہ حلقہ کیا حلقۂ مفقودہ مل گیا ہے" ؛ مکتوب شام: دروزی جہاد کا خاتمہ ؛ عمرو بن العاص (۸) "نئے اصول حکمرانی: مسولینی کی عجیب و غریب تقریر" (۸، ۹) ؛ انقلاب فرانس کے ارکانِ ثلاثہ: روسو (۸، ۹) ؛ مکتوب قسطنطنیہ: غازی کی تقریر (۸)۔ ٹیونس ۱۹۰۴ء میں؛ فرانس کی حکمتِ عملی پر آنکھوں دیکھا تبصرہ (۸) اٹلی اور یمن؛ زیر طبع اہم کتابیں (۸)۔ تفسیر سورۂ فاتحہ (۸-۱۲) نوجوان لڑکی پر ایک نظر؛ حکومتِ ترکیہ شروع سے اب تک (۹، ۱۸، ۱۹) "انسانیت..." حجاج بن یوسف (۹) ؛ زمین پر کائنات و حیات کا آغاز (۹) افسانہ: "حقیقت کہاں ہے"؛ یونانی علم الاصنام کا ایک افسانہ: حکمت؛ علم الآثار ؛ لکھنؤ سے ایک انگریزی روزنامے کے اجرا کے سلسلہ میں مراسلہ از آل نبی، تصدق احمد خاں، محمد یعقوب۔ مراسلے میں یہ بھی کہا گیا کہ علی گڑھ سے بھی مسلمانوں کے مسائل پر بحث و رائے کے سلسلہ میں ایک انگریزی اخبار نکالا گیا تھا مگر اس میں شخصی عنصر اس درجہ غالب تھا کہ ترقی نہ کر سکا (۹) ؛ ہفتہ میں دو بار چھپنے والے 'الجمیعۃ' کا اشتہار (۹)۔ 'لیلیٰ مجنوں' از طٰہٰ حسین۔ ترجمہ؛ سید جمال الدین اسد آبادی ؛ اردو ٹائپ کی تجویز پر پنڈت کیفی کا خط (۱۰)۔ ہندوستان اور البیرونی (۱۱)۔ سات عجائبات عالم (مسلسل)۔ لاسلکی کا راز؛ مقرر یا سیاسی؛ دنیا کا جدید ترین شہر، آسٹریلیا کا نیا دارالحکومت (۱۲) مرحوم سعد زغلول اور ان کے اقوال (۱۲، ۱۴، ۱۵)۔ تصویر کا دوسرا رخ "، ہند میں انگریزوں کے مظالم پر ایک امریکی مصنف کی کتاب سے ترجمہ از محمد علی ایبٹ آبادی؛ گورکی کا افسانہ: "ماں کی محبت"، ترجمہ از اختر شیرانی، آخر میں اشعار کا منظوم ترجمہ بھی، جن میں اختر کی فنکاری کا اظہار ہوتا ہے (۱۲)۔ "عہد انقلاب اور شخصی استبداد" (کمال، مسولینی، لینن اور ریوا کے فوٹو)؛ "علم اور دین" کی

آویزش پر؛ کیا قانون کی نکتہ چینی قانون کی توہین ہے: ہوگو کی ایک تقریر اپنے لڑکے کی حمایت میں؛ امریکا اور راس الامید کے اکتشافات: ہندستان کی تجارت پر مشرق و مغرب کا تصادم؛ اخبار نویسی کی اہمیت پر کچھ اقوال؛ ایک جواب طلب مراسلہ؛ "دلآزار مذہبی تحریریں اور مسلمانوں کا پچھلا مظاہرہ" [رنگیلا رسول کے سلسلے میں؛ ایک ہندو دوست کی تحریر؛ مولانا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ہے] ؛ "مکتوب امریکا" میں؛ متعہ نما شادی کی تحریک، عورتوں کی طرف سے (۱۳) - عہدِ امیہ کا خاتمہ اور عباسیہ کی تاسیس (۱۳، ۱۴، ۱۵) - شام و فلسطین کے فرقے (۱۵)۔ ایک افسانہ؛ علم الاجتماع: حسبِ ذات مرد میں زیادہ ہے یا عورت میں؛ واقعۂ ولادتِ نبوی (۱۵)؛ "انسانیت موت کے ....."؛ امام شافعی؛ اسپر نٹو؛ علم اور کلیسا کا معرکہ؛ ایک افسانہ: ہولناک رات (۱۸)۔ مدحت پاشا (۱۸، ۱۹) - اٹلی میں ایک عورت کے مرد ہونے کے بعد خیالات؛ علوم مادیہ کی ترقی اور علما کے حوصلے؛ مراکش کے امیر محمد بن عبدالکریم کی تصویر: ایک فراموش شدہ عظمت؛ احیاءِ اسلام؛ افسانہ: نپولین پر دوسرا حملہ؛ روح پر سائنٹفک اطبا عصر کے مباحث (۱۹) - "کیمونزم اور اس کے مقاصد"؛ جرمنی سے شائع شدہ مارکس کے مجموعۂ مضامین میں سے ایک کا ترجمہ (۲۰)؛ ابن بطوطہ کی سیاحت؛ مدحت پاشا کے خطوط؛ ہندستان انگریزی حکومت سے پہلے اور بعد؛ احیاءِ اسلام؛ نظریۂ نشو و نما کی موجودہ منزل [شمارہ ۲۰، ۱۴، نومبر ۱۹۲۷ء]

اس سال کا آخری شمارہ نمبر ۲۵ ہے ——— اس کے بعد غالباً الہلال کا کوئی پرچہ کبھی نہ نکلا۔

۲۵، ۲۶ برس کے نوجوان سے سالخوردہ علما کی سی دقتِ نظر کی توقع مناسب نہیں۔ اس نوجوان نے اس نوعمری میں جو جو نکات پیدا کیے، صحافت کے اصولوں کو جس سلیقے اور حسن کے ساتھ برتا، قومی، ملی اور دینی مسئلوں پر جس بے لاگ اور حقیقت پسندانہ انداز میں غور و فکر کی دعوت دی، مختلف فیہ مسائل میں جیسی حریتِ فکر اور جرأت مندی کا ثبوت دیا ——— اور سب سے بڑھ کر، اردو نثر میں جیسی جان پیدا کر دی، اپنی جگہ پر یہی سب کچھ اس کا کریڈٹ ہے۔

الہلال میں علمی، تاریخی اور واقعاتی غلطیاں ہیں[۳۲]، استدلالی بے ربطیاں ہیں، کسی تحریک کے پیچھے

---

[۳۲] میں یہاں مثالاً ایک ہی موضوع پر صرف ابتدائی چند شماروں سے بعض غلطیوں کی نشاندہی کر کے اپنی بات واضح کر دوں؛ ۱۹۱۴ء کی پہلی جلد کے چوتھے شمارہ میں ندوۃ کے سلسلہ میں اصلاحی تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نپولین نے ۱۸۰۵ء میں مصر پر حملہ کیا، حالانکہ نپولین کے حملہ کی صحیح تاریخ جولائی ۱۷۹۸ء ہے۔ پھر اسی مضمون میں آگے چل کر ابراہیم کو دوم خدیو مصر لکھا ہے؛ خدیو کا لفظ استعمال کرنے کا مجاز ابراہیم کی موت کے ۱۹ برس بعد اس کا بھتیجا اسماعیل ہوا؛ اس سے پہلے اس عہدے کا وجود نہ تھا جو اس لفظ سے وابستہ ہے ——— اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے چھٹے شمارہ میں لکھا ہے کہ اعرابی پاشا کی تحریک سے پہلے محمد عبدہٗ توفیق کو قتل کرنے کے لئے

کوئی اعلیٰ فکر اور گہرا سماجی شعور نہیں۔ اس کے عوامی تاثر کا اندازہ تو خود اس کے اپنے دعوے سے بھی ہو سکتا ہے[ش] اور اس عہد کے دیکھنے والے بھی اس کی تکذیب نہیں کرتے۔ لیکن پڑھے لکھے اونچی سطح کے ذہین لوگوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو الہلال کے ایڈیٹر کی علمیت یا غیر معمولی ذہانت و قابلیت قسم کی کسی چیز کا قائل نہ تھا۔ اس طبقے کی ترجمانی عبدالماجد دریابادی کے اس مکتوب سے بخوبی ہوتی ہے جو 'خطاو کرب' کی بحث کے سلسلے میں انھوں نے مولانا کو لکھا تھا[۳۲] ——— اور پھر بھی یہ سب کچھ اس عظیم صحافی کی عظمت کو کم نہ کر سکے گا جس نے بہت سے میدانوں میں آغاز کیا اور ہر جگہ اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

زمیندار، ہمدرد اور الہلال اس دور صحافت کے اہم ترین نمائندے تھے اور شاید صحیح معنی میں اردو ادب میں باقاعدہ اور سائنٹیفک صحافت کے بانی بھی۔ الہلال اس تثلیث کا سب سے ممتاز رکن تھا کیونکہ اس نے صحافت کے فن کو فنی حیثیت سے سب سے زیادہ سلیقے سے برتا، اور ایڈیٹر اور اخبار دونوں کی کم عمری کے باوجود سب سے زیادہ دیرپا اثر چھوڑا۔

مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: "چوبیس برس کی عمر میں جبکہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع

بقیہ حاشیہ ص ———

آمادہ تھے، جس ماخذ سے یہ بات کہی گئی ہے یعنی بلنٹ، خود اس نے کہیں توفیق کا نام نہیں لیا۔ عبدہٗ نے بلنٹ کے نام ایک خط میں اس بات کا ذکر ضرور کیا ہے کہ افغانی کے کہنے پر ۱۸۷۶ء میں وہ اسماعیل کو قتل کر دینے کی بابت سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے اگر کسی 'بہادر' کی تلاش میں تھے، خود تو محض مولوی تھے ——— پھر اسی ذیل میں مولانا نے لکھا ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعرابی کا واقعہ پیش آ گیا۔ احمد اعرابی نے ۸۲-۱۸۸۱ء میں مصر کی آزادی کے لئے فوجی بغاوت کی تھی، ۱۸۷۷ء میں تو مصری اس کے نام سے بھی واقف نہ تھے ——— آگے چل کر افغانی کے "العروۃ" کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے ۹ا نمبر نکلے جبکہ العروۃ" کا آخری نمبر ۱۸واں نمبر تھا ——— پہلے شمارے میں لکھا ہے، شیخ محمد عبدہٗ جب سید جمال الدین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے تو ..... توفیق پاشا ..... کے استبداد و مظالم سے تمام ملک برباد و ہلاک ہو رہا تھا": یہاں ۸ برس کی تقدیم و تاخیر ہے۔ ——— دوسرے شمارہ میں مصر کے قومی شاعر ابراہیم کو شامی شاعر لکھا ہے۔

ش یہ دعوے الہلال کے کسی بھی شمارے میں مل سکتے ہیں: مزید دیکھئے "قول فیصل" ص ۶۷-۶۵ اور ہمایوں کبیر والی خود نوشت میں مولانا کا ارشاد کہ چھبیس ہزار ہفتہ وار سرکلیشن تھا اور ۳ ماہ بعد اولین پرچوں کو دوبارہ چھاپنا پڑا ص ۶

۳۲ "ہاں یہ جرم مجھ سے بلاشبہ سرزد ہوا ہے ...... کہ میں نے اس شخص سے دستگیری کی التجا نہیں کی جس نے گو اپنی خطیبانہ سحر بیانی سے ایک بہت بڑی جماعت کو مرعوب و مسحور کر رکھا ہے مگر جس کے خالص 'کمالات علمی' کا ثبوت مجھے اب تک باوجود سعی و تلاش کے نہیں مل سکا ہے ...... لیکن الہلال کو اپنے دعوے پر اصرار ہے اور چونکہ یہ دعویٰ الہلال نے کیا ہے اس لئے کسی دلیل کی بھی حاجت نہیں۔ محض اس کا اعادہ و تکرار کافی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ یہ خطیبانہ حربے، عوام فریب تقریروں اور تحریروں میں خواہ کتنے ہی کارگر ہوتے ہوں، لیکن علمی مباحث میں ان کا استعمال قطعاً بے محل و غیر موثر ہونے کے ساتھ، بے حد شرمناک ہے۔ سیاست اور مذہب مدت سے آپ کی تیغ خطابیات کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں، اب مہربانی کر کے علمی مسائل کی جان پر تو رحم فرمائیے۔"

(الہلال ۲۲ اکتوبر ۱۳ء)

رہتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کرکے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا..... گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال
انے سے اُلٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا:

کام تھے عشق میں بہت پر میر   ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے[۳۴]

لانا کے اس دعوے میں بہت کم مبالغہ ہے۔ سچ یہ ہے وہ الہلال میں سب کچھ کہہ چکے تھے اور باقی زندگی، اگر انھیں
س کی کچھ مہلت ملی تو، وہ اکثر الہلال ہی کی عبارتیں یا مطالب دہراتے رہے۔ "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر"
ی حد تک الہلال ہی کا آموختہ ہیں۔

اردو ادب پر اور ہندستان کی قومی اور ملی تحریکوں پر الہلال کے اثرات کا ابھی تک باقاعدہ اعتراف نہیں
ا گیا ہے۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اردو نثر کو ایک سنجیدہ اور صاف ستھرا لب ولہجہ دیا تھا، الہلال نے
سے کس بل دیا، اندرونی جان بخشی، بے پناہ وسعت اور مردانہ لب ولہجہ دیا۔ اسے تاریخ ادب کا معجزہ ہی کہئے
ہ اردو شاعری نے انیسویں صدی میں ایک ۲۵ سالہ نوجوان کے ہاتھوں جو برگزیدگی حاصل کرلی تھی اردو نثر
نے ویسی ہی عظمت بیسویں صدی میں ایک اور ۲۵ سالہ نوجوان کی بدولت حاصل کی۔ نسخۂ حمیدیہ کا غالب اور الہلال کا
اد، ان دو اہم شخصیتوں نے شعر اور نثر کو نیا جنم دیا اور انھیں پروان بھی چڑھایا، نئی توانائیوں کے ساتھ![۳۵]
الہلال کے ابوالکلام نے جس طریقے سے بات کہنا سکھایا تھا وہ ایک روایت بن گئی اور عام طور سے
پنائی جانے لگی۔ اسی بھیڑ میں دو صاحب طرز ادیبوں نے اپنا چراغ اسی چراغ سے روشن کیا، ذاکر صاحب اور
ا زصاحب براہ راست مولانا سے متاثر ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں میں بھی اسی کا پرتو ملتا ہے۔
ا زصاحب نے اس اثر پذیری کا اظہار ایک اور ذریعہ سے بھی کیا ہے۔ انھوں نے جب الہلال کے (یا زیادہ
یح، البلاغ کے) ۲ برس بعد نگارش شروع کیا تو اس کے بعض موضوعات اور ان کی ترتیب کے ساتھ ساتھ ان
حافتی اصولوں کو بھی کامیابی کے ساتھ برتا جو ایک بار الہلال میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ذاکر صاحب کی تحریروں
ر تقریروں میں جو پرجوش خطیبانہ رنگ ہے وہ براہ راست ابوالکلام کی دین ہے۔

---

۳۴ غبار خاطر ص۱   ۳۵ اصلاً دونوں نواح دہلی کے باشندے تھے (پانی پت اور آگرہ)! دونوں دہلوی نسبت کو پسند کرتے تھے!
ونوں میں انانیت، خود پرستی، خود آگاہی، اور بڑا بننے کا جذبہ یکساں طور پر کارفرما تھا، دونوں نے اپنی آخری آرامگاہ کے لئے
ن کو چنا، نظام الدین اور جامع مسجد! دونوں کو شکایت تھی کہ وہ زمانے سے پہلے پیدا ہو گئے! ...نے اردو کے کسی شاعر کے ساتھ عقیدتمندی کا
ہائی تو وہ غالب ہی تھے! آواگون میں یقین رکھنے والا کوئی دوسرے جنم کا قائل ہو تو نہ جانے کیا کیا کڑیاں ملا بیٹھے!

مودودی صاحب نے صرف تحریر کی حد تک ہی اُن سے استفادہ نہیں کیا، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ "جماعتِ اسلامی" کا سارا رنگ و آہنگ مولانا کی حزب اللہ اور دوسری تعلیمات سے مستعار ہے۔ مولانا نے جس جس طرح 'مسلمان' کی تعریف اور اس کے مقصد اور منہاج کی وضاحت کی ہے، جماعتِ اسلامی میں اس کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا کے نزدیک ان کی حزب اللہ محض دینی جماعت تھی جبکہ جماعت اسلامی (پاکستان) ایک سیاسی جماعت ہے۔ لیکن مولانا ہی کی تحریروں میں اس قسم کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ مسلمان کے نزدیک سیاست بھی دین ہی کا ایک حصہ ہے اور مسلمان کی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم دینی اکائی ہے۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ دین سیاست بن جائے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مودودی صاحب کا 'ترجمان القرآن' مولانا کی اسی نام کی تفسیر کی اشاعت کے بعد جاری ہوا۔

مولانا الیاس کی تبلیغی جماعت کی تحریک تو ہوبہو حزب اللہ کی ایک شاخ 'السائحون' کا چربہ ہے۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے، جنگِ عظیم کے بعد کی مسلم لیگ کی تشکیل نو میں جہاں دوسرے عوامل کام کر رہے تھے وہاں خود کانگریس کے اس مہا پرش کی الہلالی تعلیمات کا کتنا بڑا ہاتھ ہے! لوگوں نے آسانی سے اس کے ایک پہلو کو اپنا لیا![۳۶]

یہ سب تو زندہ تحریکیں ہیں۔ ان کے علاوہ جنگِ عظیم کے فوراً بعد کی مختلف تحریکیں، جمعیۃ العلماءِ ہند کی تنظیم، خلافت تحریک، احرار، خاکسار، مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریک —— ان سب کا سرچشمہ محض الہلال تو نہیں، لیکن ان کے عناصرِ ترکیبی میں الہلال کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد عدمِ تعاون کی تحریک تھی لیکن علی گڑھ کے باغی نوجوانوں میں علی گڑھ سے ایسی سرکش بغاوت کو جنم دینے میں الہلال کا بنیادی دخل شاید مبالغہ نہ ہو!

بالکل دوسری طرف ان کا فارسی اشعار کا بے محابا، باسلیقہ، مسلسل اور خوبصورت استعمال، 'فلسفۂ عجم' کے مصنف کے لئے ایک مہمیز کا کام دے گیا ہو تو عجب نہیں۔ آخر 'فاطمہ بنتِ عبداللہ' بھی تو الہلال کی اسی موضوع کی تحریر کے بعد ہی لکھی گئی تھی!

---

[۳۶] مولانا کا 'الہلالی عہد میں' قوم، ملت، وطن اور وطنی تحریک کے تصورات کا تجزیہ تفصیل طلب کام ہے، لیکن ایمانداری سے یہ کام کیا گیا تو نتیجہ اس سے زیادہ مختلف نہ ہوگا جس پر میں ان کے مطالعہ کے بعد پہنچا ہوں۔

ضمیمہ (۱)

الہلال : پیش گفتار

چگونہ مے بمیاں آورم دریں مجلس　　کہ بادہ حوصلہ سوزست و جملہ بدستند

سنہ ۱۹۰۶ء کے موسم سرما کی آخری راتیں تھیں، جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا. انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن و تخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے۔ کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا، یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے ....

اگرچہ ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت اردو پریس کی موجودہ حالت کے لحاظ سے اس قدر ارزاں اور سہل کام ہے جس کے لئے چھ ہفتہ کا انتظار بھی شاید ضرورت سے زائد فرصت ہو: ایک زود نویس کاتب کا ارزاں وقت، چار پتھر اور ایک کاٹھ کا دستی پریس، یہ تین ضروری اجزاء ہیں جس کے جمع کر لینے کے بعد اردو اخبار کا دفتر بالکل مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن ابتدائے خیال سے جو اعلیٰ پیمانہ پیش نظر تھا، طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ مشکلات سے شکست کھا کر اُسے بھلا دیا جائے ....

یہ پورے چھ سال کا زمانہ جن واقعات و حوادث کے ساتھ گزرا، اس کی تفصیل ایک داستان طویل ہے، جس کا دُہرانا شاید بے نتیجہ ہو لیکن بے لطف تو ضرور ہے۔ اس الم کدۂ حیات میں ہر لمحہ جو گزرتا ہے، نہیں معلوم کتنی زندگیوں کے آلام و مصائب کی داستانیں اس میں ختم ہو جاتی ہیں اور کتنی شروع ہوتی ہیں ...

ہمارے وہ احباب جن کو اس ارادے کا علم تھا مگر ہمارے حالات کا علم نہ تھا، ان گزشتہ سالوں کے اندر طرح طرح کے خیالات و ظنون سے طعنہ زن رہے ..... بعض نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ فکر و تصور سے زیادہ اس ارادے کی قسمت میں اور کچھ نہیں ہے لیکن: وما لھم بہ من علم، ان یتبعون الا الظن، وان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً۔ ۵۳ : ۳۔ ولو انھم صبروا حتی تخرج الیھم لکان خیراً لھم۔ ۴۹ : ۶۔ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ ۴۸ : ۵۸

گر دیر برآئیم ز گرداب بیندیشیں　　کاندر طلب گوہر نایاب نشستیم

الہلال کی اشاعت ہمارے قدیمی ارادوں کے سفر کا آغاز ہے اور فضلِ الٰہی سے امید ہے کہ اب بہت جلد اپنے ارادے کے اعمالِ تمتہ میں مصروف ہوسکیں گے۔ ایک اردو ہفتہ وار رسالے کی اشاعت کے لئے برقی طاقت سے چلنے والی مشینوں کی ضرورت نہ تھی اور نہ کسی وسیع پریس کے متعلقات و آلات کی؛ اور نہ ایک اردو ہفتہ وار اخبار ملک کی موجودہ حالت کے لحاظ سے اتنی حیثیت پیدا کرسکتا ہے کہ کسی بڑے پریس کو اپنے اعتماد پر قائم رکھ سکے۔ پھر وہ خواہ کتنے ہی وسیع پیمانے پر جاری کیا جاوے لیکن کوئی ایسا مقصد زندگی نہیں ہوسکتا جس کا انتظار شب ہائے امید کی بے چینیوں اور روز ہائے تلاش کے اضطراب کا حقدار ہو۔ خدا کے بخشے ہوئے دل و دماغ کی یہ ناقدری و تحقیر ہے اگر اس کے مقاصد کا سدرۃ المنتہیٰ اس سے زیادہ بلند نہ ہوسکے۔ پس یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، درحقیقت چند عزائم عظیمہ ہیں جن کی طرف بتدریج متوجہ ہونا ہے؛ اور میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؛ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیماً حکیماً۔

اس وقت بھی جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، وہ عالم السرائر اور دانندۂ خفایائے قلوب دیکھ رہا ہے کہ طرح طرح کی جاں فرسا پریشانیوں کا محاصرہ میرے گرد و پیش ہے اور آلام و مصائب کے ہجوم سے کاروبارِ حواس بالکل درہم برہم؛ اور ایک لمحہ کے لئے جمعیۃ خاطر میسر نہیں لیکن جو شئے شاید ملنے والی نہیں اس کے انتظار میں کب تک زندگی کو معطل رکھا جائے۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ خود بخود ایک بے وجہ توقع قائم کرکے پھر ناکامی کی شکایت میں عمر بسر کردیتا ہے؛ حالانکہ یہ کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ زندگی کو سکون و طمانیت کے ساتھ کٹنا چاہیے، اور اس کے لئے کیا امر مانع ہے کہ آلام و مصائب ہی ہمیشہ پیش نہ آئیں؟ تیرنے والے دریا میں رہ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں، مگر دریا سے ڈرنے والوں کو کشتی کے اندر بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ مصائبِ حیات، زندگی کے ساتھ ہیں اور ساتھ ہی ختم ہوں گے؛ پس کام کرنے والوں کو ان پر ماتم کرنے کی جگہ کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی دائمی رفاقت کو گوارا بنالیں، اور دریا سے نکلنے کی سعیٔ بے سود کی جگہ تیرنے کی کوشش کریں، ورنہ ساری عمر ہاتھ پاؤں مارنے میں ختم ہوجائے گی اور کنارے تک رسائی نہ ہوگی،

ہزار رخنہ بدام و مرا ز سادہ دلی　　تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

البتہ اس خدائے قیوم سے جس کے کان فریادوں کے سننے کے لئے ہر وقت تیار .... ہیں، یہ آخری التجا ہے کہ اگر وہ مجھ میں سچائی اور خلوص کی کوئی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اس کی ملتِ مرحومہ اور اس کے کلمۂ حق کی کوئی بھی تپش میرے دل میں موجود ہے، اور اگر واقعی اس کی راہ میں فدویت اور خود فروشی کی ایک آگ ہے جس میں برسوں سے

بغیر و مومنین کے جل رہا ہوں، تو اپنے فضل و لطف سے مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں؛ لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور ایک دکاندارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں، تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے اور میرے تمام کاموں کو ایک لمحہ کے لئے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے۔ باغوں کے سرسبز و ثمردار درختوں کی حفاظت کی جاتی ہے مگر جنگل کے خشک درختوں کو جلانا ہی چاہیے جس دل میں خلوص اور صداقت کو جگہ نہیں ملی اس کو کامیابی کے لئے کیوں باقی رکھا جائے۔ ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون (۴۵: ۲۶)"

(الہلال پہلی جلد پہلا شمارہ۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء)

ضمیمہ (۲)

الہلال کا پہلا پرچہ

سرورق :

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

— القرآن الحکیم

الہلال — ایک ہفتہ وار مصور رسالہ ، کلکتہ (تاریخ)

فہرس

مضامین تصاویر

قیمت فی پرچہ ۴ آنہ ششماہی ۴ روپے بارہ آنے ، سالانہ ۸ روپیہ

احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی

آخری صفحہ پر ، " الہلال الیکٹریکل پرنٹنگ ورکس نمبر ، ۱ ۔ مکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ سے مظہر الحق نے چھاپ کر شائع کیا ۔

پہلے شمارہ میں : اداریہ ' اور ' اعتذار ' کے علاوہ مندرجہ ذیل مشمولات ہیں :

" المعلم العظیم والمرشد العظیم : السید محمد رشید رضا الحسینی الطرابلسی نمبر ا "

" ناموران غزوۂ طرابلس : امیر علی بن عبدالقادر الجزائری " اس میں زیادہ تر جگہ امیر عبدالقادر کے ذکر نے لی ہے

" عثمانی مجاہد طرابلس : یوزباشی جاوید بک "

" کارزار طرابلس : مصر کی ڈاک ، طرابلس کا پیغام "

" میدان جنگ سے موسیو کولیرا کی چٹھی "

" الشیخ الشریف احمد السنوسی "

" ہدیۂ سلطانی کے جواب میں ، خط ، انور بک کے نام "

" میدان جنگ سے تار : ۱) الموید ، قاہرہ کے نام ۲) ' النیل ' قاہرہ کے نام "

"قسطنطنیہ کی ڈاک، 'صباح' کے تار۔ شیخ سنوسی کا استقبال"

"عالم اسلامی: مصر کی الحزب الوطنی کے مصائب۔ شوکت پاشا کا استعفیٰ۔ ٹرکی اور اٹلی کی صلح"

اور تصاویر:

سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، رشید رضا، جاوید بک، شیخ سلیمان بارونی، جماعت مجاہدین اور عزیزیہ میں عثمانی کیمپ۔

اندرون سرورق:

۱) آئندہ نمبروں کی تصاویر کی فہرست

۲) آئندہ نمبر کے مضامین

اور آخری اندرون سرورق میں آئندہ کے لئے مستقل عنوانات کا اعلان:

"مذاکرہ علمیہ (علمی مضامین، علمی خبریں، جدید اکتشافات، متفرق ابحاث و افکار علمیہ اور علما سارا ساع)

"احرارِ اسلام (تاریخ اسلام کے مشہور نامور جنھوں نے مذہبی، علمی اور سیاسی آزادی کے لئے کوئی جانفروشی اور قربانی کی ہے۔ اور زمانۂ حال کے نامور احرار بھی مع تصاویر)

"افسانۂ عجم (ایران متعلق مضامین اور خبریں)

"مغرب اقصیٰ مراکش کے بارے میں)

"مدارس اسلامیہ۔ عالم اسلامی۔ انتقاد۔ مراسلات۔ ایڈیٹوریل۔ اور بریف نوٹس"

بسم اللہ

مکتوبِ گرامی عبدالماجد دریابادی بنام عابد رضا بیدار

صدقِ جدید

مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۸ء   دریاباد، ضلع بارہ بنکی

مکرم گستر، وعلیکم السلام

آپ کے سوالات کے جوابات محض حافظہ کی مدد سے دینا آسان نہیں، اور فائلیں کسی قسم کی اب موجود نہیں۔ الہلال (دورِ قدیم) کی مکمل فائل کئی جلدوں میں محفوظ تھی، ایک ملازم صاحب نے چرا کر ردّی میں بیچ ڈالی۔ بہرحال آپ کے سوالات نمبر ۱، ۳ میرے حدودِ حافظہ سے اور سوال نمبر ۲ حدودِ علم سے باہر ہیں۔ تاریخیں وغیرہ اب کہاں یاد رہ سکتی ہیں[1]

سوال نمبر ۴، الف ——— الہلال دورِ اول میں حسبِ ذیل اصحاب تو ضرور شریکِ ادارت تھے؛ سب ایک ساتھ نہیں، مختلف اوقات میں۔

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی؛ ۲۔ مولانا عبداللہ عمادی؛ ۳۔ مولوی حامد علی صدیقی؛ ۴۔ مولانا عبدالماجد کانپوری؛ ۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی[2]

نمبر ۲ اپنے زمانے کے مشہور ماہرِ اسلامیات تھے اور نمبر ۳ مشہور صحافی۔ نمبر ۴ بعد کو کانپور کے کسی کالج میں عربی کے استاد مقرر ہو گئے تھے۔

---

[1] مجھے اب یاد نہیں آتا یہ نمبر میرے کن سوالوں کے ہیں، ماجد صاحب سے میں نے جو کچھ معلوم کیا تھا جس کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے، صرف ایک گتھی رہ گئی (ممکن ہے یہ نمبر اسی سے متعلق ہوں) کہ حزب اللہ کبھی عالمِ تصور سے عالمِ اجسام میں بھی آئی کہ نہیں

[2] سید سلیمان، مئی۔ جون ۱۹۱۳ء میں الہلال میں شامل ہوئے اور نومبر کے پہلے ہفتے یا اس سے کچھ قبل الگ ہو گئے تھے۔ اور عبدالسلام ندوی، جون۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں اشاعت میں آئے اور الہلال دورِ اول کے اخیر اس کے ساتھ وابستہ رہے۔ (مکاتیبِ شبلی ۲، ملاحظہ ۱۰۰، ۱۰۹، ۱۵۴-۱۵۵)۔ عبداللہ عمادی (م ۱۹۴۷ء) شبلی کے 'الندوہ' میں مولانا کے جانشین رہے اور پھر مولانا کی طرح الندوۃ چھوڑ کر 'وکیل' (امرتسر) میں چلے آئے یہاں بھی انھیں مولانا کی جانشینی ہی ملی (یادِ رفتگاں۔ از سید سلیمان ندوی؛ نقوش شخصیات نمبر) عبدالواحد ندوی کا ذکر عربی کے ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے مکاتیبِ شبلی میں کئی جگہ آیا ہے۔ اور اس وقت میں حوالہ دینے سے قاصر ہوں لیکن یاد پڑتا ہے الندوہ میں ان کی بعض تحریریں بھی دیکھی ہیں۔

یہ لوگ تو باقاعدہ اسٹاف میں تھے۔ باہر کے ایک صاحب بھی انگریزی معلومات کی حد تک مدد دیتے رہتے تھے، یہ مرزا محمد عسکری بی۔اے لکھنوی تھے جو اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا میں مترجم تھے اور پھر تاریخ ادب اردو وغیرہ کے مصنف و مترجم رہے ہیں[1]

دورِ ثانی کے متعلق معلومات آپ کو مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی دے سکتے ہیں۔

دیسنہ (ضلع پٹنہ) کی اردو لائبریری میں یقین ہے کہ الہلال و البلاغ کی مکمل جلدیں موجود ہوں[2]

البصائر کا نکلنا مجھے یاد نہیں پڑتا[3]

حزب اللہ کی تنظیم میں (برخلاف تبلیغی جماعت کے) سیاسی رنگ پوری طرح غالب تھا، مولوی عبید اللہ سندھی کی جمعیۃ نظارۃ القرآن کی طرح۔

والسلام

عبدالماجد

---

[1] عسکری، رام بابو سکسینہ کے مشہور مترجم اور ادبی خطوط غالب وغیرہ کے مرتب ہیں۔ ان کا تذکرہ "نقش آزاد" میں مولانا مہر کے نام بعض مکاتیب میں بھی آیا ہے۔

[2] الہلال اور البلاغ کی مکمل جلدیں، صولت پبلک لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔

[3] "البصائر" سے مراد وہی ماہنامہ ہے جس کا الہلال کے دفتر سے نکلنا طے پایا تھا۔ میں بھی تلاش کے باوجود اس کا کوئی نشان نہیں پا سکا۔

آزاد ببلیوگرافی

پہلا حصّہ

از

عابد رضا بیدار

آزاد ببلیوگرافی

پہلا حصّہ

[آزاد کی تصانیف اور متفرق تحریروں کی توضیحی فہرست پیش کی جا رہی ہے اور غالباً یہ فہرست مکمل ہے ۔ آزاد ببلیوگرافی کا دوسرا حصہ آزاد پر کئے گئے کام پر مشتمل ہوگا جسے آئندہ ترتیب دیا جائے گا ۔
فہرست کی ترتیب میں تاریخ وار سلسلہ کے بجائے موضوع وار ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے]

اخبار و رسائل

لسان الصدق ، کلکتہ ۱۹۰۴ء

ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کی ادارت میں شریک اکتوبر ۱۹۰۵ - مارچ ۱۹۰۶ء

روزنامہ وکیل امرتسر کے ادارہ میں - مارچ ۱۹۰۶ء سے

ہفتہ وار الہلال ، جولائی ۱۹۱۲ء --- نومبر ۱۹۱۴ء

ہفتہ وار البلاغ ، نومبر ۱۹۱۵ء --- مارچ ۱۹۱۶ء

ہفتہ وار پیغام ، زیر ادارت ملیح آبادی ، زیر نگرانی آزاد ستمبر --- دسمبر ۱۹۲۱ء

ہفتہ وار الہلال ، جون --- دسمبر ۱۹۲۷ء

[مندرجہ ذیل کا ذکر آزاد کی کہانی میں ملتا ہے ؛ ویسے کسی کتابخانہ یا ذاتی کلیکشن میں انکا کوئی نشان نہیں ملتا:

المصباح : پہلا اخبار ؛ --- ایک گلدستہ بعنوان " نیرنگ عالم"

احسن الاخبار کی ترتیب میں شریک ؛

خدنگ نظر کی ترتیب میں شریک ؛

تحفۂ محمدیہ کی ترتیب میں شریک ؛

اور --- --- دار السلطنت کلکتہ کے مالک و مدیر]

متفرق کتابیں

۱۔ مسلمان عورت:

ادبستان لاہور؛ بارِ سوم ۱۹۴۶ء؛ قیمت ۶/

مصنف فرید وجدی — مترجم مولانا ابوالکلام آزاد

۳۰×۲۰/۱۶ سائز — ۲۸۸ ص

ترتیب:

دیباچہ از محمد حنیف ندوی، ۵---۸

مقدمہ از مترجم ۹---۱۶

متن ۱۷---۲۸۸

[دیباچہ نگار نے لکھا ہے، "پیش نظر کتاب فرید وجدی کی عربی تصنیف "المرأۃ المسلمہ" کا اردو ترجمہ ہے جو اولین ثمرہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی مساعی کا اور تصنیفی صلاحیتوں کا۔ اس کو ترجمہ ہم واقفیت کے اعتبار سے کہتے ہیں ورنہ اس کو فرید وجدی کی کتاب کا اردو ایڈیشن کہنا چاہیئے]

—— اس صدی کی ابتدا میں مصر میں قاسم امین نے "تحریر المرأۃ" اور "المرأۃ الجدیدۃ" لکھ کر تحریکِ حریتِ نسواں کی بنیاد ڈالی۔ قدامت پسندوں نے اس تحریک کی مخالفت میں جو کچھ لکھا اس میں فرید وجدی کی کتاب "المرأۃ المسلمہ" کو نمایاں مقام ملا۔ فرید وجدی کا خیال ہے کہ عورت جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اس قابل نہیں کہ مرد کے دوش بدوش عملی دنیا میں کام کرسکے اور یہ کہ اس کے لئے پردہ بھی ضروری ہے۔

مولانا اکتوبر ۱۹۰۵ء میں "الندوہ" کے ادارہ میں شامل ہوئے اور وہیں اس کتاب کا یہ ترجمہ یا ترجمانی مکمل ہوئی۔ الندوہ میں المرأۃ المسلمہ پر جو ریویو لکھے انھیں کو بڑھا کر کتابی شکل دے دی ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ خود قاسم امین کی کتاب "تحریر المرأۃ" دو سال قبل، ۱۹۰۳ء میں، اردو میں آچکی تھی اور یقین ہے مولانا کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ یہ کتاب محسن الملک کے ایما پر رشید احمد انصاری نے ترجمہ کی تھی اور علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ انھیں رشید احمد انصاری نے ۱۹۰۴ء میں فرید وجدی کی

ایک کتاب المدنیۃ الاسلام" کا ترجمہ بھی کر ڈالا تھا اور محسن الملک کے دیباچہ کے ساتھ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی تھی۔۔

۲۔ تازہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد:

سرورق:

سلسلۂ مضامین حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

نمبر ۱۴

تازہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد

امام الاحرار حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد مدظلہ العالی کے تازہ مضامین ۱۹۲۱ء

منشی مشتاق احمد ناظم قومی دارالاشاعت محلّہ کوٹلہ میرٹھ

نے

ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

$\frac{22 \times 18}{8}$ سائز؛ ۶۴ ص؛ ۱۰/ آنے قیمت (سال اشاعت غالباً ۱۹۲۳ء)

مشمولات:۔

ہفتہ وار پیغام کا افتتاحیہ
علی برادر کی گرفتاری
مسئلہ خلافت و جریدۃ العرب
فیصلہ کا انتظار
کیا آخری منزل آ گئی
کراچی رزو لوشن
ماہ ربیع الاوّل اور تذکار ولادت نبویؐ
ان الحکم الا للہ
ایڈیٹر پیغام کی گرفتاری

——— "پیغام" عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت" اور مولانا کی نگرانی میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ ہمارے پیش نظر مجموعہ کی تمام تحریریں اسی "پیغام" سے لی گئی ہیں۔ پیغام ۱۹۲۱ء کے آخری چار مہینوں میں جاری رہا۔ اس میں مولانا کے قلم سے جو تحریریں نکلیں ان میں کی اکثر اس مجموعہ میں آگئی ہیں۔ مجھے اس مجموعہ کو بھی ضرب تقسیم سے بنائی ہوئی کتابوں میں شامل کر دینا چاہئے تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد اخبار "پیغام" ہے لیکن ایک تو یہ امر کہ اخبار "پیغام" بلا واسطہ مولانا کا اخبار نہ تھا، اس کتاب کو رد کرنے میں مانع رہا۔ دوسرے، یہ مضامین، ضرب تقسیم والی دوسری تحریروں کے برخلاف صرف ایک اسی نام سے شائع ہوئے، متعدد ناموں سے نہیں۔

۳۔ جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد

[۲۲×۱۸/۸ سائز - دارالمصنفین - اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء]

——— پہلی بار اس مسئلہ پر کہ غیر مسلموں کا داخلہ مساجد میں جائز ہے یا نہیں، مولانا نے معارف میں مئی-جون ۱۹۱۹ء میں ایک طویل مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں ۲۳ - ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ میرے پیش نظر جو نسخہ رہا ہے اُسے دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔

۴۔ مسئلہ خلافت :

یہ کتاب ۲۱ - ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ ہفتہ وار "پیغام" میں اپنے ایک مضمون میں، مولانا نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے یہ کتاب ملی نہیں۔

۵۔ بائیکاٹ :

یہ سلسلہ مضامین ابوالکلام آزاد ہی کی ایک کڑی ہے سلسلہ نمبر ا ہے ۱۹۲۱ء کی تصنیف ہے۔

۹ ۔ قولِ فیصل

سرورق : انہ لقول فصل وما ھو بالھزل

رسالہ

قولِ فیصل

یعنی

حضرت مولانا مدظلہٗ کا بیان جو انھوں نے گورنمنٹ کے استغاثہ کے جواب میں تحریر کیا ؛ اور جو تحریکِ خلافت و سوراج کے اسباب و مقاصد اور ملک کے قومی و مذہبی فرائض پر سب سے بہتر اور مستند بیان ہے مع روداد گرفتاری و مقدمہ

البلاغ پریس ، کلکتہ ؛ $\frac{26 \times 20}{8}$ سائز ؛ ۱۰۰ ص ۔ ٹائپ میں

[مرکزی خلافت کمیٹی نے بمبئی سے شائع کیا]

ترتیب :

دیباچۂ مرتب (مرتب نامعلوم) ، ا ۔ ق : ۱۹ ص

ینگ انڈیا میں آزاد کے بیان پر گاندھی جی کا تبصرہ ، ق ۔ ر : ۲ ص

پیغام ، جو گرفتاری سے دو دن پہلے مولانا نے لکھ کر اپنے کاغذات میں رکھ دیا تھا ، ۱ ۔ ۷

[یہ ہفتہ وار " پیغام " سے نقل کیا گیا ہے]

گرفتاری ، ۸ ــــ ۱۴

سات پیشیاں ، ۱۵ ــــ ۳۱

مولانا ابوالکلام کا تحریری بیان ، ۳۲ ــــ ۸۰

[مورخہ ۱۱ ۔ جنوری ۱۹۲۲ء]

آخری پیشی ، ۸۱ ــــ ۸۴

نقل و ترجمہ فیصلۂ عدالت ، ۸۵ ــــ ۸۷

ضمیمہ - ۱

آخری منزل کے آثار پھر شروع ہوگئے از پیغام ۹ - دسمبر ۱۹۲۱ء

۸۸ ——— ۹۹

ضمیمہ ۲ بیگم صاحبہ مولانا آزاد کا تار مہاتما گاندھی کے نام ۱۰۰

— — — قول فیصل میں شامل تحریری بیان الگ کتابچہ کی صورت میں بھی 'سلسلۂ مضامین ابوالکلام آزاد' میں چھپ چکا ہے اس بیان کی مجموعی حیثیت سے تو اب صرف تاریخی اہمیت ہی رہ گئی ہے لیکن بعض ٹکڑے مولانا کے مخصوص طرزِ انشاء کے بہترین نمونوں میں شمار ہو سکتے ہیں -

---

۷ - خطباتِ آزاد

ادبستان لاہور ۳۰۸ ص - ۲۲×۱۸/۸ سائز - ۸ روپے

ترتیب :

مقدمہ از نصراللہ خاں عزیز ۴ ——— ۸

خطبات :

اتحادِ اسلامی اجلاسِ عام کلکتہ ، ۲۷ - اکتوبر ۱۴ء

۹ ——— ۱۵

صوبائی مجلسِ خلافت آگرہ ۲۵ اکتوبر ۲۱ء

۳۵ ——— ۶۸

خطبۂ تحریری جمعیۃ العلمائے ہند ، لاہور ، ۱۸ - نومبر ۲۱ء

خطبۂ تقریری " " " "

۶۹ ——— ۱۴۹

اجلاس عام کلکتہ ، شہادتِ حسین ۲۱۱ ——— ۲۴۵

اجلاس خصوصی انڈین نیشنل کانگرس دہلی ، ۱۵ - دسمبر ۱۹۲۳ء

۲۴۵ ——— ۳۰۷

صوبائی مجلس خلافت کانفرنس بنگال ، ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء

۱۸۹ ــــــــ ۲۱۱

آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور ، ۲۹ دسمبر ۲۵ء

۳۰۷ ــــــــ ۳۲۵

خطبۂ رام گڑھ کانگرس ، مارچ ۱۹۴۰ء

۳۲۵ ــــــــ ۳۶۸

ــــــــ اس کتاب میں ۱۹۴۰ء تک کے مولانا کے سارے اہم خطبے یکجا مل جاتے ہیں ۔

---

۸ ۔ **تقاریر مولانا آزاد** ۱۹۴۷ء ــــــ ۱۹۵۵ء (انگریزی میں)

حکومت ہند ، جنوری ۱۹۵۶ء

۱۸×۲۲/۸ سائز ، ۳۳۱ ص قیمت چھ روپے آٹھ آنے

ــــــــ تقریروں کی مجموعی تعداد ۵۵ ہے ۔ اصل تقریریں اردو میں تھیں یہ ان کا سرکاری ترجمہ ہے ۔ تقاریر ہیں جو مولانا نے وزیر معارف ہند کی حیثیت سے ۹ سال کے اندر مختلف موقعوں پر کیں ۔ ان کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں مولانا نے اردو دنیا کو براہ راست کچھ نہیں دیا اس دور کے ان کے ذہن کو انھیں تقریروں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے ۔

تفسیر

۹ - ترجمان القرآن

سرورق :

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ اخرین (مسلم عن نافع)

ترجمان القرآن

یعنی

قرآن حکیم کے مطالب اردو زبان میں بضروری تشریحات کے ساتھ

مع

تفسیر سورۂ فاتحہ

از

ابوالکلام احمد

جلد اوّل

دفتر ترجمان القرآن دہلی سے شائع ہوئی : ۱۳۵ء

بڑا سائز ۔

۴۵۵ ص ۔ عیسوی تاریخ اشاعت انتساب کی تاریخ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء سے تعین کی جاسکتی ہے

ترتیب :

جلد دوم

۵۴۴ ص (قیمت سات روپے چار آنے (نقشِ آزاد نمبر ۳۵)

ترتیب:

الاعراف تا المؤمنون

[یہ جلد دسمبر ۳۵ء یا ۳۶ء کے آغاز میں شائع ہوئی اس کا اندازہ نقشِ آزاد، خطوط نمبر ۲۱، ۲۲ سے ہوتا ہے]

—— ترجمان القرآن اردو میں تفسیری لٹریچر میں ایک مستقل اضافہ ہے جس کی بنیاد سرسید کی تفسیر کو سمجھنا چاہیے، لیکن سرسید کا ذہن ممکن ہے مولانا سے وسیع تر ہو، ان کے قلم میں یہ جان یقیناً نہ تھی اور یہی چیز ترجمان القرآن کو تفسیر کے ساتھ ادب کا بھی جزو بنا دیتی ہے۔

دو جلدیں شائع ہو گئیں۔ تیسری جلد کے لئے سورۂ نور کی کتابت ۱۹۳۵ء میں شروع ہو گئی تھی (نقشِ آزاد، خط نمبر ۲۲، ۳۱) اور بظاہر مولانا نے اس کی تکمیل بھی کر دی تھی۔ ابھی مولانا کی وفات سے ایک سال پہلے یہ خبر گرم تھی کہ قیمہ پریس بمبئی نے اس کے حقوق خرید لئے ہیں اور متن ان کے پاس پہنچ گیا ہے۔ معلوم نہیں اس تیسری جلد کا کیا حشر ہوا۔

ترجمان القرآن کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب سے مولانا ۱۹۴۵ء میں قلعۂ احمد نگر میں فارغ ہو چکے تھے۔ یہ دیباچہ کی تاریخ ہے۔

خودگزشت:

۱۰۔ تذکرہ

سرورق

مہر:۔ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

البلاغ

ھذہ تذکرہ

تذکرہ

یعنی مولانا ابوالکلام اور ان کے خاندان کے بعض اکابر وشیوخ کے سوانح و حالات جس کا پہلا حصہ

تمامتر اُنہی کی تصنیف ہے

مرتبہ

فضل الدین احمد مرزا بی، اس سی

ای، ایم۔ ایف، جی، ایس۔ (یوکو)

البلاغ پریس، کلکتہ

[۲۰×۲۶ سائز، ۳۱۷ ص؛ قیمت درج نہیں۔ نقش آزاد۔ خط نمبر ۲۸ میں دو روپے بتائی گئی ہے۔ تاریخ بھی غائب ہے۔ مرتب کے دیباچہ کی تاریخ ۱۶۔ اگست ۱۹۱۹ء ہے۔ اور مصنف کے دیباچہ کی تاریخ یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء ہے]

ترتیب:

توضیحی فہرست: ا ـــــ ۴

اعتذار (یہ غلط نامہ بھی ہے اور مصنف کا دیباچہ بھی! دیباچہ کے خاتمہ پر مصنف نے اپنا نام احمد لکھا ہے)؛   ا ـــــ ۷

مولانا ابوالکلام کے زمانہ نظربندی کی ایک یادگار: مدرسۂ اسلامیہ رانچی کا ایک منظر: عمارت کی تصویر؛ ۸

مقدمہ از مرتب ، ا ---- ن ۱۴ ص
مولانا ابوالکلام : تازہ فوٹو ، مقدمہ کی تاریخ ۱۶ اگست ۱۹۱۹ء سے پہلے کا۔
اصل متن :

حصہ اول ، ۱ ---- ۲۸۵

[مرتب کا نوٹ ، ۲۸۶]

خاتمۂ کتاب کی ایک فصل ، ۲۸۷ ---- ۳۱۷

[مرتب نے مقدمہ اور کتاب کے درمیان اپنے نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اصل مسودہ سات آٹھ سو صفحوں سے زیادہ ہی ہوگا جس میں مولانا کے خاندانی حالات نے تقریباً ۱۰۰ صفحات لئے ہیں ، خود اپنے حالات بلیس ایک صفحوں میں لکھے ہیں (بقیہ ، خود مرتب نے کچھ سوال قائم کرکے ان کے جواب مولانا سے لکھوائے ہیں اس طرح کہ ایک خود نوشت تیار ہوگئی ہے ۔ لیکن اس ضخامت کو ایک جلد میں شائع کرنا مرتب نے بہتر نہیں سمجھا ، اصل مسودہ کا پہلا باب ۱ بقیہ ۲ ابواب پہلے کی طرح خاندانی حالات ہی پر مشتمل بتائے گئے ہیں) اور " خاتمہ کتاب کی ایک فصل ، جس میں مولانا نے اپنے اندازِ خاص میں خود اپنے حالات کی طرف چند اشارات کئے ہیں " ، کو ملا کر تذکرہ ترتیب دیا گیا ہے۔]

---- جو چیز طبع نہیں ہوسکی اس کا ذکر ہی کیا : موجودہ ہیئت میں تذکرہ کے ۲۸۵ صفحے خاندانی حالات کے لئے وقف ہیں جن کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے ، آخر کے ۳۱ صفحے اپنے بارے میں ہیں ، آدھے حصہ میں اپنی ناکام محبت کی داستان اشاروں میں بیان کی ہے ، یہ پہلی فصل ہے ، دوسری فصل (ص ۳۰۲-۳۱۰) میں اسی سلسلہ کو دراز کرتے ہوئے انشائیہ نگاری کی ہے اور اپنی شخصیت کی جھلک بھی دکھائی ہے ۔ تیسری فصل (ص ۳۱۰-۳۱۴) میں رانچی کا بیان ہے اور آخری فصل (ص ۳۱۴-۳۱۷) میں ایک عزیز کی گرفتاری پر تاثر ہے ۔ اور پھر ان صفحات کے لکھنے کی تقریب ؛ اور اسی پر کتاب کا خاتمہ ہے ۔

مندرجہ بالا تجزیہ کی روشنی میں کام کا حصہ صرف ۲۴ صفحے ٹھہرتے ہیں جو انھوں نے اپنے بارے میں

لکھے ہیں (۲۹۷ — ۳۱۰) جس میں ایک نوجوان سرتا پا دل بنا نظر آتا ہے جو حسن کی ہر ادا پر جاں سپاری کے لئے آمادہ ہے جس نے عشق کیا ہے اس میں ناکام ہوا ہے لیکن عشق کی آگ سینہ میں ہنوز دہک رہی ہے جس نے اُس سے دنیا کے بڑے بڑے کام کرائے ہیں اور بہت کچھ کرنے کا حوصلہ بخش دیا ہے۔ تذکرہ ایک ایسے نوجوان کی خود نوشت ہے جو ۲۵، ۳۰ سال کی عمر میں قوم کا رہنما بن گیا تھا اور اسی پاداش میں رانچی میں نظر بند تھا۔ تذکرہ مرتب کے دیباچہ میں دی ہوئی اطلاع کے مطابق جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کے عرصہ میں لکھا گیا ہے۔

۱۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی

بہ روایت : ملیح آبادی

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی - اپریل ۱۹۵۸ء

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ : ۴۴۴ ص : قیمت چھ روپے

ترتیب :

"آغاز" از مرتب - مولانا کی وفات پر اظہارِ غم اور کتاب کی شانِ نزول، ۷ — ۲۴

مولانا آزاد کا خاندانی سلسلہ، ۲۵ — ۱۰۷

مولانا ابو نصر آہ مرحوم، ۱۰۸ — ۱۸۵

مولانا آزاد کے حالات، ۱۸۶ — ۴۴۴

(جوانی کے زمانے کا ایک نیا فوٹو ۱۰۰ کے سامنے)

"۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن چکے تھے ...... میں نے مولانا کو اُکسانا شروع کیا کہ 'تذکرہ' کی دوسری جلد لکھوا دیں ..... آخر راضی ہوگئے اور یہ کتاب لکھانا شروع کر دی۔ بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا تھا۔ رات کو مسودہ صاف کر لیتا تھا ......"

یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اپنے [illegible] کے حالات بھی

لکھوادئے ہیں اور خود اپنے حالات بھی چار سال کی عمر سے! .... اس کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ مولانا کی روز مرہ کی بات چیت قلمبند ہوگئی ہے ....

... مولانا اپنی پوری زندگی میں شاید کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بھولے نہیں، مگر لکھوا دینے کے بعد اس کتاب کو بالکل ہی بھول گئے .... یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ موجودہ زمانے میں مولانا اگر یہی کتاب اپنے قلم سے لکھتے یا اس پر نظر ثانی کر لیتے تو اس کی شکل ضرور مختلف ہوتی: یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی تھی"

دیباچہ مرتب ۳۰-۱۰-۱۹۵۸

———— ادھر دو ایک بزرگوں نے "آزادی کی کہانی" پر بڑی سخت تنقید لکھ ڈالی ہے اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ کتاب میں بعض بڑی سخت واقعاتی غلطیاں موجود ہیں جو مولانا سے سرزد ہونا بعید ہیں اس لئے یہ کتاب ملیح آبادی کے دماغ کی تخلیق ہے مولانا اس کے لئے قطعاً ذمہ دار نہیں۔ اچھا ہو یہ لوگ مولانا کی دوسری تصانیف اور خاص کر "تذکرہ" پڑھ ڈالیں اور پھر انھیں یقین آجائے گا کہ کتاب سو فیصدی مولانا ہی کی تصنیف ہے، اور بڑی اہم خود گزشت -

---

۱۲- آزادی کی جیت: ایک خود نوشت (انڈیا ونس فریڈم- انگریزی)

اورینٹ لانگ مینس، کلکتہ

$\frac{22\times18}{8}$ سائز: ۲۵۲ ص، ۲/۱ ۲ روپے، جنوری ۱۹۵۹ء

ترتیب:

انتساب: "جواہر لال دوست اور ساتھی کے نام"

پیش لفظ: از ہمایوں کبیر، مرتب- ۴ صفحے

فہرست -   (دیباچہ کی تاریخ ۱۵- مارچ ۱۹۵۸ء)

تصاویر   ۱۳ اہم تصاویر

پہلی جلد کا خاکہ،   ۱ ——— ۱۲

[۱۹۵۶ء میں ہمایوں کبیر نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ فرصت کے اوقات میں ہمایوں کبیر کو اپنی خودگزشت بتاتے رہیں۔ ہمایوں کبیر مولانا کے بیانات کو انگریزی میں لکھتے رہتے تھے اور جب کام مکمل ہوگیا تو پوری کتاب پر مولانا نے نظر ثانی کی۔ اور بعد ستمبر ۱۹۵۷ء اس کتاب کا نظر ثانی کے بعد ترتیب دیا ہوا مکمل نسخہ مرتب نے مولانا کو پیش کر دیا جس میں سے تیس صفحے نکال کر نیشنل آرکائیوز اور نیشنل لائبریری میں اصل کتاب کے ساتھ محفوظ کرا دیے گئے کہ ان کی اشاعت مولانا کے نزدیک ابھی مناسب نہ تھی۔ بقیہ کی اشاعت کی اجازت دیدی۔ مولانا کی خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کی سالگرہ نومبر ۱۹۵۸ء کے موقع پر آجائے مگر فروری ۱۹۵۸ء میں اُن کی وفات نے اس کتاب کو بھی "آزاد کی کہانی" کی طرح ان کے بعد ہی شائع ہونے کی نوبت آنے دی۔

دیباچۂ مرتب]

—— کتاب کے الفاظ ہمایوں کبیر کے ہیں، مطالب مولانا آزاد کے ہیں۔ اس کا مسودہ کئی بار ان کی نظر سے گزر چکا ہے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ وہ اپنی نوشت تین جلدوں میں لکھیں۔ ایک یہی "آزادی کی جیت" دوسری اپنی ابتدائی زندگی پر ۱۹۲۰ء تک اور ۱۹۲۰ء کے بعد کا عرصہ آزادی کی جیت کا موضوع ہے اور تیسری ۱۹۴۸ء کے بعد کے عرصہ پر کہ "آزادی کی جیت" ۱۹۴۸ء پر لا کر چھوڑ دیتی ہے لیکن اب تو جو کچھ ہے یہی ہے۔ ابتدائی عہد والے حصہ کا خاکہ البتہ آزادی کی جیت میں شامل ہے۔

یہ کتاب "آزادی ہند کی اندرونی تاریخ" کے طور پر ایک لازوال کارنامہ کی حیثیت سے ہمیشہ ایک دستاویز کے طور پر استعمال کی جائے گی۔ اسے خالص خود نوشت کی حیثیت سے پڑھنے والوں کو مایوسی ہوگی لیکن "تذکرہ" اور "آزاد کی کہانی" کا ضمیمہ بنانے کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

خطوط

۱۳۔ غبارِ خاطر

سرورق

مپرس تا چہ نوشتہ ست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست ایں غبارِ خاطرِ ما

غبارِ خاطر

یعنی

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض مکاتیب جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں بعض احباب کے نام لکھے تھے، اور جو مکتوب الیہ کو ان کی رہائی کے بعد ملے۔ مولانا ۹راگست ۱۹۴۲ء کو مبئی میں گرفتار کرکے احمد نگر پہنچائے گئے، اور ۱۵-جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

[اندرونِ سرورق: جملہ حقوق ترجمہ و اشاعت بحق مصنف محفوظ ہیں۔
ریاست حیدرآباد دکن میں بھی رجسٹری کرالی گئی ہے۔]

اندرونی سرورق:

غبارِ خاطر

قلعۂ احمد نگر کی اسیری (از ۹-اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵-جون ۱۹۴۵ء کے زمانے کی بعض تحریرات

از ابوالکلام آزاد

مقدمہ از محمد اجمل خاں ، ۵ ——— ۲۴

دیباچہ از مصنف ، ۲۵ ——— ۲۶

اصل کتاب :

(i) رہائی کے بعد بعض مکاتیب نواب صدر یار جنگ کے نام ؛ تعداد ۳

(اور نواب صدر یار جنگ کے ۲ مکاتیب) ، ۲۶ ——— ۳۰

(ii) ۳- اگست ۴۲ء کا مکتوب بسفر جو ۹ اگست کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جا سکا ۳۰ ——— ۴۰

(iii) قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانے کے مکاتیب : ۱ ——— ۲۹۲

[یہی اصل مکاتیب ہیں جن کے بارے میں سرورق کی عبارت ہے ، صفحات کی ترتیب بھی نئی ہے - ان مکاتیب کی تعداد ۱۹ ہے ؛ ان میں سے ۴ کو " داستان بے ستون و کوہکن " ، " حکایت بادہ و تریاک " ، " حکایت زاغ و بلبل " اور "چڑیا چڑے کی کہانی " کے عنوانات بھی دیے گئے ہیں] ، ۱ ——— ۲۹۲

[صفحات کی مجموعی تعداد ، ۳۴۰]

آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام

مولوی محمد احمد خاں پرنٹر پبلشر شائع ہوئی

$\frac{20\times30}{16}$ سائز ہے ؛ قیمت درج نہیں (مولانا کے ایک خط میں اس کی قیمت چار روپے لکھی ہے ۔ نقش آزاد ۲۰۳) ۔ تاریخ بھی درج نہیں لیکن تیسری اشاعت کے پیش لفظ (از محمد اجمل خاں) سے پتا چلتا ہے کہ یہ مئی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی -

[اگست ۱۹۴۶ء میں دوسری بار طبع ہوئی] دوسرا ایڈیشن (جسے اجمل خاں نے طبع ثالث کا نام دیا ہے) موسیقی پر ایک طویل خط کے اضافے کے ساتھ $\frac{22\times18}{8}$ سائز پر شائع ہوا ۔ یہ ایڈیشن ۳۳۰ صفحات پر مشتمل ہے - صفحات کی گنتی میں یکسانیت ہے -

---

مکتبۂ احرار نے آزاد ہند پبلیکیشنز لمیٹڈ ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور کے لئے شائع کیا

اس پر بھی نہ قیمت درج ہے نہ تاریخ اشاعت - تاریخ اشاعت کا قرینہ مولانا مہر کے نام

ایک خط سے ملتا ہے (نقشِ آزاد ص۲۱) ۔خط ۹ ۔ فروری ۱۹۴۷ء کا ہے ؛ کتاب کی اشاعت ۴۷ء کی پہلی سہ ماہی میں سمجھنا چاہیئے ۔غبارِ خاطر کا دوسرا ایڈیشن آخری ایڈیشن ہے ؛ بعد کی طباعتوں میں اسی کو نمونہ بنایا گیا ہے ۔

——— غبارِ خاطر کے لئے آپ کو اردو ادب میں ایک نئی تقسیم، خود کلامی ادب کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ اردو میں انشائیے تقریباً ناپید ہیں؛ اگر آپ کسی نئی تقسیم سے گھبراتے ہیں تو اردو ادب کے انشائیوں کی فہرست تیار کرتے وقت غبارِ خاطر کو اس فہرست کا جلی عنوان بنا دیجئے ۔

۱۴۔ کاروانِ خیال :

سرِ ورق :

کاروانِ خیال

مجموعۂ خطوط

۴۔ ستمبر ۱۹۴۰ء ——— ۱۲۔ نومبر ۱۹۴۶ء

از

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

و

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

طابع و ناشر

مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور۔ یوپی

مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

[۱۵۱ صفحات ؛ ۲۰×۳۰/۱۶ سائز]

دیباچہ از عبدالشاہد خاں شروانی (مرتب) ، ۱ ——— ۵۷

مورخہ ۱۲ ۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء

خطوط :

حبیب الرحمٰن خاں شروانی　(۱۰)

مولانا آزاد　(۱۸) / ۵۹ ــــ ۱۵۱

(زیچ میں ایک صفحہ مرتب نے بطور اپنے تصرف میں لے لیا ہے)

(مولانا کا ایک خط مرتب کے نام بھی ہے جسے دیباچہ میں نقل کیا گیا ہے۔ اس طرح مجموعی تعداد ۱۸ ہو جاتی ہے۔ لیکن حبیب الرحمٰن خاں کے نام، خطوط میں سے ۳ غبار خاطر میں پہلے ہی آچکے ہیں۔ اس طرح کاروانِ خیال کے اچھوتے خطوں کی کل تعداد ۱۵ رہ جاتی ہے، جو شمار میں کتاب کے ۱۵۱ صفحوں میں سے صرف ۸۹ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن یہ بات قابلِ ذکر بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ 'غبار' اور 'کارواں' کے مشترک خطوط کے متن میں بڑے اہم اور بیّن اختلافات موجود ہیں یہاں تک کہ تاریخوں تک میں جزئی فرق ہو گیا ہے۔ 'کارواں' کے مرتب نے یا کاتب نے متن میں کوئی دخل اندازی نہیں کی ہے: میں نے خود اصل خطوط اور مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ کر لیا ہے۔ ترمیم و اضافہ کا یہ عمل دراصل 'غبار' ہی میں ہوا ہے، سطروں کی سطریں تبدیل کر دی گئی ہیں اور ایک جگہ تو دو خطوں کو ملا کر ایک خط کر دیا ہے۔)

کتاب پر تاریخ اشاعت درج نہیں لیکن یکم نومبر ۴۶ء تک ۱۵۱ صفحوں میں سے ۱۴۲ کا پروف تیار ہو چکا تھا، بقیہ کی کتابت و طباعت نومبر کے آخر تک ہو چکی ہو گی اور کتاب نومبر کے آخر یا دسمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہو گئی ہو گی۔

ــــــ کاروانِ خیال بذاتہ الگ کتاب بننے کی سکت نہیں رکھتی۔ اس میں زیادہ تر تو رسیدی رقعے ہیں۔ تین چار خط اہم ہیں لیکن ان میں بھی نہ غبار خاطر کی آزاد اُڑان ملتی ہے نہ نجی خطوط کی بے ساختگی۔ شروع کے دو ایک خطوں میں کچھ تاریخوں کا مبہم سا تعین ہو جاتا ہے جن سے مولانا کا سوانح نگار فائدہ اٹھا سکتا ہے؛ ایک خط میں سفرِ بغداد کا تفصیلی ذکر مل جاتا ہے اور ایک خط میں موسیقی سے لگاؤ اور شبلی کے شعر و ادب کے بارے میں مولانا کی تفصیلی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ مولانا کی مشہور انشاء کے نمونوں کے اعتبار سے یہ تیسرے درجہ کی چیزیں ہیں اور اگر "کاروانِ خیال" کو غبارِ خاطر کے پس منظر کے ساتھ پڑھا گیا

اس کی عافیت معلوم۔ پھر بھی یہ ۱۴، ۱۵ خط غبار خاطر ہی کے مکتوب الیہ کے نام ہونے کے لحاظ سے غبار خاطر کے کسی نئے ایڈیشن میں تتمہ کے طور پر شامل کر لینے چاہئیں۔ اپنی موجودہ ہیئت میں کاروانِ خیال نہ تو نام کے اعتبار سے مولانا کی تصنیف ہے اور نہ مواد کے اعتبار سے تنہا مولانا اس کے مصنف ہیں۔

۱۵۔ نقشِ آزاد:

"یعنی ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے دو مکاتیب جو میرے نام آئے۔ نیز بعض دوسری تحریرات و مکاتیب۔

غلام رسول مہر"

کتاب منزل لاہور؛ ۲۲×۱۸/۸ سائز: ۳۶۰ ص؛ قیمت ۶ روپے

[تاریخِ اشاعت درج نہیں۔ دیباچہ کی تاریخ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء ہے]

ترتیب —

حصہ اول: مکاتیب بنام مہر، ۱ —— ۲۵۶

حصہ دوم: "غالب" پر مولانا کی تحریرات، ۲۵۹ —— ۳۳۸

حصہ سوم: متفرق مکاتیب، ۳۴۳ —— ۳۶۰

["میں بی۔ اے کے آخری سال میں تھا جب علم و ادب کے یہ نادر جواہر پارے میرے دامنِ عقیدت میں فراہم ہونے لگے تھے۔ اور لطف و نوازش کا ابرِ گوہر بار اس وقت تک برابر موتی برساتا رہا جب تک اس میں اور مجھ میں موت کی دیوار حائل نہ ہو گئی۔ چوالیس سال کی مدت ایک عمر ہے"]

"میں نے ... کتاب (غالب از مہر) کا ایک نسخہ بیچ میں سادہ اوراق لگوا کر بھیج دیا جو کم و بیش تین سال ان کے پاس رہا جب کبھی فرصت ملتی، وہ سادہ اوراق پر کچھ تحریر فرما دیتے۔ اس طرح تین سال میں بہت کچھ لکھا گیا جو سب کا سب غالب سے متعلق نہ تھا ..... میں نے ان تحریرات کو مناسب ترتیب کے ساتھ پیشِ نظر مجموعہ کا حصہ دوم بنا دیا ہے۔"

"حصہ سوم ان تحریرات پر مشتمل ہے جو یہ ہے نام نہ تھیں تاہم کسی نہ کسی وجہ سے میرے پاس
پہنچ گئیں اور محفوظ رہیں۔ انھیں میں وہ چند مکاتیب بھی شامل کر دیے گئے ہیں خواجہ حسن نظامی مرحوم
نے ۱۹۱۶ء میں ایک مجموعے کے ساتھ چھاپے تھے" ـــــــــ دیباچہ از غلام رسول مہر]

ـــــــ مہر صاحب نے اپنے نام جو ۱۸۰ خطوط دئے ہیں ان میں سے ۴۵ اجمل خاں کے ہیں ۳ پرائیویٹ سکریٹری ایم ابن مسعود کے اور ۱۲۴ مولانا کے۔ خطوط زیادہ تر کاروبار نوعیت کے ہیں او ترجمان القرآن اور غبار خاطر کی طباعت اور معاوضہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ لیکن ان خطوں کی بھی اس لحاظ سے اہمیت ہے کہ مولانا کی تصانیف کے بارے میں کچھ مزید اطلاعات مل جاتی ہیں۔ اس قسم کے خطوط کے علاوہ جو خط ہیں ان میں سے بعض بڑے اہم ہیں۔ ان خطوں میں مولانا کی انشائیہ نگاری نہیں ملے گی لیکن نجی خطوں کی شان ضرور مل جائے گی۔ ان خطوں میں اجمل خاں وغیرہ کے خط شامل نہ کئے جاتے تو بہتر ہوتا۔

دوسرا حصہ جو مہر صاحب کی کتاب "غالب" پر مولانا کی 'تعلیقات' سے ترتیب دیا گیا ہے غالب، معاصرین غالب اور قواعد کے بعض مسائل کے بارے میں ہے، اور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

تیسرے حصہ میں ۴ خط نیاز فتحپوری کے نام ہیں، ایک 'زمیندار' کے منیجر مولانا شفاعت اللہ خاں کے نام ہے۔ دو متفرق تحریریں "مولانا ابوالکلام کا پیام تمام عزیزان پنجاب کے نام" اور "اخبار زمیندار کے لئے اپیل" کے عنوان سے ہیں اور ۱۱ خط حسن نظامی کے نام ہیں جو حسن نظامی کی مرتبہ تالیف خطوط نویسی (اشاعت ۱۹۱۶ء) سے لئے گئے ہیں۔ آخرالذکر خطوط کے نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اصل اور نقل میں بعض لفظی اختلافات راہ پا گئے ہیں۔ ۱۹۱۴ء سے قبل، ۱۹۱۴ء میں، ۱۹۱۹ء میں، مولانا کی یہ چار اہم تصویریں بھی شامل ہیں۔

مجموعی حیثیت سے یہ خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

میرا عقیدہ

مکتبۂ جامعہ دہلی، فروری ۱۹۵۹ء

قیمت ایک روپیہ۔ پچاس نئے پیسے ؛ ۲۰ × ۳۰/۱۶ سائز؛ ۴۰ ص

ترتیب :

خطوط :

—— یہ سب خطوط جنھیں قاضی سید احمد حسین ، ممبر پارلیمنٹ ، ناظم امارتِ شرعیہ ، صوبۂ بہار و اڑیسہ ، نے اس غرض سے شائع کیا ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مولانا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو نجات کے لئے کافی "نہیں" سمجھتے تھے ۔ سب خط اسی عنوان پر ہیں ۔ مولانا مہر کے نام خط پہلے نقشِ آزاد میں شائع ہو چکا ہے لیکن ان کی تفصیلی توضیح نئی ہے ۔ باقی خط "مکاتیب ابوالکلام" میں آچکے ہیں ۔ کتاب کے شروع میں ایک تصویر بھی شامل ہے جس میں بڑا خوبصورت انداز ہے ۔ اس کتاب کو مولانا کی تصانیف کی گنتی میں شمار نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ اس میں ایک خط بھی نیا نہیں یہاں اس کا تذکرہ اسلئے کر دینا مناسب معلوم ہوا کہ اس میں حکیم سعد اللہ کے نام ۱۴ / مئی کا جو خط ہے اُسے 'مکاتیبِ ابوالکلام' میں مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے ؛ اور دوسرے اس لئے کہ دو طویل خطوں کے عکس شائع کئے گئے ہیں]

۱۶۔ مکاتیب ابوالکلام،

ادبستان لاہور۔ ۳۰×۲۰/۱۶ سائز، ۲۰۰ ص، عِہ

ترتیب:

حالی کے نام، ایک خط

شبلی کے نام، دو خط

سلیمان ندوی کے نام، ۳۸ خط

محی الدین احمد قصوری کے نام، ۲ خط

(غلام رسول مہر کے ... ۵ خطوں کے اقتباسات، مکمل خط نقش آزاد میں)

متفرق خطوط:

گیا کے کسی شخص کے سوال "نجات کی راہ" پر، ۱

——— (یہ خط حکیم سعداللہ کے نام ہے: دیکھئے 'میرا عقیدہ')

[لکھنؤ سے ایک گمنام مراسلہ کے جواب میں:

یہ خط الہلال سے لیا گیا ہے اور اصولاً خط ہے بھی نہیں]

ریاست مالیرکوٹلہ میں احناف اور اہل حدیث میں تنازع پر مولانا کا تحریری فیصلہ ——، ۱۹۴۷ء

قادیانی عقیدۂ بروز مسیح پر، کسی صاحب کے سوال پر ۳ خط

——— (ان میں سے دو خط حکیم سعیداللہ کے نام ہیں۔ دیکھئے 'میرا عقیدہ')

عقیدۂ بروز مسیح ہی کے سلسلہ میں ثناءاللہ امرتسری کے نام ایک خط

کسی کے نام بروز مسیح ہی کے سلسلہ میں ایک خط

——— ان خطوں میں حالی اور شبلی کے نام کے خط تو بہرحال اہم ہیں ہی، سب سے اہم خط سلیمان ندوی کے نام ہیں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۵ء تک کے عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں یہ خط معارف ۵۴-۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

متفرق خطوط

آجکل آزاد نمبر میں :-

محمد اجمل خاں کے مضمون "مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور ان کے جواب" میں :-

بنام مولانا محمد میاں فاروقی (۱۹۴۵ء)

بنام شورش کاشمیری (۱۹۵۵ء)

بنام سوامی برہم دت ہنس (۱۹۵۲ء)

بنام سری کرشن داس یاس خراب آبادی (۱۹۵۴ء)

بنام شری دیا نند شرما (۱۹۵۱ء)

بنام ڈاکٹر نظام الدین (۱۹۵۶ء)

بنام ڈاکٹر نور حسین (۱۹۵۴ء)

بنام محمد نعیم ......

بنام کرم الٰہی بدر ......

(یہ سارے خطوط صرف اقتباسات ہیں)

آجکل آزاد نمبر میں :

بنام ابو عمر محمد ابراہیم زکریا بھاگلپوری (۱۹۲۰ء)

شاعر نومبر ۱۹۵۸ء میں سات خطوں کے اقتباسات :

بنام ابو عمر محمد ابراہیم زکریا بھاگلپوری (۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء)

گلدستۂ مکاتیب (بنچ آف لیٹرز)

از جواہر لال نہرو ، ۱۹۵۸ء

۸ خط بنام جواہر لال

(۱۹۳۹ء، ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۲ء)

آجکل آزاد نمبر ۱۹۵۸ء چار خط ، بنام یحییٰ اعظمی (۱۹۴۷ - ۱۹۴۵ء)

- الجمعیۃ آزاد نمبر ص ۹۶ ، ۱۹۵۸ء بنام مولانا عبدالرحمٰن کشمیری (۱۹۲۲ء)
- الجمعیۃ آزاد نمبر ص ۵۰ ، ۱۹۵۸ء بنام محمد اکبر باقوی مدراسی (۱۹۴۲ء)
- علی گڑھ میگزین ۴۹ - ۱۹۴۸ء بنام رشید احمد صدیقی (؟) (۱۹۴۸ء)
- نقوش مکاتیب نمبر ، ۲ بنام بیگم حسرت موہانی (۱۹۲۰ء کے لگ بھگ)
- اردو جبلی نمبر ۱۹۵۳ء بنام مولوی عبدالحق (۱۹۴۸ء)
- تعمیر (کشمیر) ۱۹۵۸ء بنام محمد رضا انصاری (۱۹۴۰ء)
- چٹان (لاہور) ۱۹۵۶ء کا کوئی شمارہ، بنام شورش (۱۹۵۶ء)
- روح مکاتیب : جون ۴۱ ء - (مرتبہ ساغر نظامی) بنام ساغر (۱۹۳۶ء)
- مرقع ادب (حصہ اول) مرتبہ صفدر مرزا پوری ۱۹۲۰ء بنام عبدالرزاق کانپوری (۱۹۰۰ء)
- تاریخ نثر اردو مرتبہ احسن مارہروی ۱۹۳۰ء بنام افتخار عالم مارہروی (۱۹۱۵ء)
- [تالیف خطوط نویسی مرتبہ حسن نظامی ۱۹۱۶ء (۱۱ خط جو نقش آزاد میں شامل کر لئے گئے ہیں)]
- "کاروان خیال" کے دیباچہ میں : ۱۹۴۶ء ، بنام عبدالشاہد خاں شروانی (۱۹۴۶ء)
- التورۃ الہندیۃ مرتبہ عبدالشاہد خاں شروانی ، (۱۹۴۹ء) " (۱۹۴۵ء)
- یادگار اقبال ، ۱۹۴۰ء مرتبہ طفیل احمد بدر امروہوی ، تعزیت نامہ
- "صبح امید" مرتبہ عزیز الرحمٰن ۱۹۵۸ء ، بنام مولانا محمد زکریا (۱۹۴۵ء)
- "صبا" ابوالکلام نمبر ۱۹۵۹ء : ۴ خط بنام قاضی عبدالغفار

مقدمے اور دیباچے

○ رباعیاتِ سرمد (احسن کو قربان علی بسمل نے سید نواب علی صولت لکھنوی سے نظم کرنیا)
۱۹۲۸ء ——— سوانح سرمد شہید مولانا کے قلم سے۔

○ یادگارِ حالی (صالحہ عابد حسین)

(i) دیباچہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۹ء

(ii) کچھ حالی کے سلسلہ میں، ۱۵ - ۱۹

○ مثنویاتِ میر
○ مرقعِ شعرا
(مرتبہ رام بابو سکسینہ) ۱۹۵۶ء

○ گلستانِ ہزار رنگ (سید بہاؤالدین احمد) ۱۹۵۷ء

○ نوائے حیات (یحییٰ اعظمی) ۱۰ جون ۱۹۵۰ء

○ مشرق و مغرب کے فلسفہ کی داستان (رادھا کرشنن - انگریزی) ۱۹۵۲ء
رادھا کرشنن کی کتاب کے مقدمہ کا ترجمہ محمد وارث کامل نے "فلسفہ: اصول و مبادی کی روشنی میں" کے عنوان سے کیا ہے۔ ۱۱۲ صفحات، ۲؍ قیمت کی یہ کتاب مکتبہ چٹان لاہور نے شائع کی ہے ترجمہ اس سے بہتر ممکن ہے۔

○ اٹھارہ سو ستاون (سریندر ناتھ سین - انگریزی) ۱۹۵۷ء

سرودِ زندگی (اصغر گونڈوی) ۲۸ جون ۱۹۳۴ء

شہیدِ اعظم (ملیح آبادی) ———

متفرق خطبات و مقالات

- اخبار نویسی مخزن (لاہور) ۱۹۰۱ء
- خاقانی شروانی مخزن ״
- مسلمانوں کا ذخیرۂ علم اور یورپ، الندوہ۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء
- یورپ میں لوگوں کی تعلیم } الندوہ، مارچ ۱۹۰۶ء
- علمی خبریں }
- ندوۃ العلماء، دہلی کا اجلاس اور قوم کی راہِ مقصود، الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء
- دنیا کے پیچیدہ مسائل کا حل قرآن حکیم کے اندر موجود ہے، تقریر جمعیۃ تبلیغ اہل حدیث کلکتہ کے
- سالانہ اجلاس میں: "صوفی" نومبر ۱۹۳۴ء
- تعلیمی امور کے متعلق پریس کانفرنس ("صبحِ امید" میں شامل) - ۱۹۴۹ء
- قرآن اور سوشلزم: اسلام کا نظامِ اجتماعی اور زکوٰۃ کی شرعی حیثیت: "اردوئے معلّٰی" اگست تا دسمبر ۱۹۳۵ء
- المرأۃ المسلمہ پر ریویو الندوۃ ــــــ ۱۹۰۶ء - ۱۹۰۵ء
- خطبۂ جامع مسجد ۱۹۴۷ء (نئی زندگی دسمبر ۱۹۴۷ء)
- خطبۂ دیوبند (الحرم، میرٹھ۔ اپریل ۱۹۵۸ء)
- خطبۂ ندوۃ العلماء، ۱۹۴۷ء (خطبات امام الہند مرتبہ اخلاق حسین قاسمی ۱۹۴۹ء)

اردو کانفرنس انجمن ترقی اردو ہند میں تقریر، ۱۶ فروری: ہماری زبان مارچ ۱۹۵۸ء

پارلیمنٹ میں ٹنڈن جی کے جواب میں تقریر، ۲۷ مارچ: مدینہ مارچ ۱۹۵۴ء

گاندھی جی کی یادگار قائم کرنے پر، ایک تقریر، فروری ۱۹۴۸ء الجمعیۃ آزاد نمبر ص۱۴۳

اور "آزاد کی کہانی" میں بتائے ہوئے ابتدائی زمانہ کے متعدد مضامین۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْد !

○ خونِ شہادت کے دو قطرے

یہ کتاب منصورا اورسرمد پر ہے اور میں نے دس بارہ سال پہلے دیکھی تھی اب اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں مجھے ملی نہیں، اس لئے 'اصل' یا 'نقل' کسی قسم کی تصانیف میں صراحت کے ساتھ جگہ نہیں دے سکتا۔

○ "آزاد کی کہانی" میں مولانا نے اپنی مندرجہ ذیل تصانیف (ترجموں) کا ذکر کیا ہے جن کے شائع ہونے کی نوبت کبھی نہیں آئی، سوائے ایک کے اور وہ مولانا کے بیان کے مطابق :

(i) نور اللمعہ فی فضائل الجمعہ مصنفۂ امام سیوطی کا ترجمہ (ملیح آبادی ص۲۰)

(ii) خصائص محمدیہ امام سیوطی کی "انیس اللبیب فی خصائص الحبیب" کا ترجمہ (یہ کتاب شائع بھی ہوئی تھی، ص۲۷)

(۳) منہاج العابدین مصنفۂ امام غزالی کا ترجمہ (ص۲۰)

(۴) نفحات الانس مصنفۂ عبدالرحمٰن جامی کے چند اجزا کا ترجمہ (ص۲۷)

(۵) مضنون صغیر و کبیر مصنفۂ امام غزالی کا ترجمہ (ص۲۰)

(۶) تہافۃ الفلاسفۂ امام غزالی کا نامکمل ترجمہ (ص۲۴)

(۷) ہیئت جدیدہ تصنیف کیمول فلاماریاں ترجمۂ فارسی از عبدالرحیم تبریزی کا ترجمہ (ص۲۸)

ضربِ تقسیم سے بنائی ہوئی کتابیں :-

انسانیت موت کے دروازے پر؛ افکارِ آزاد (مرتبہ فارقلیط)؛ اسرارِ اسلام؛ مسلمان اور کانگرس؛ اصحاب کہف؛ سلسلۂ مضامین ابوالکلام آزاد، مضامین ابوالکلام آزاد؛ (متعدد حصے) سلسلۂ مضامین ابوالکلام آزاد، دعوتِ عمل؛ بیان مولانا ابوالکلام آزاد۔ دعوتِ حق؛ خطبۂ جمعیۃ العلما

تحریری؛ خطبۂ تقریری؛ خطباتِ سیاسیہ اور مساجدِ اسلامیہ،
(یہ سلسلۂ مضامین جسے منشی مشتاق احمد ناظم قومی دارالاشاعت میرٹھ مرتب کرکے تقریباً سو سو صفحے کے کتابچہ کی صورت میں شائع کرتے تھے اور جو شمار میں ۲۰، ۲۱ کے قریب ہیں، الہلال اور البلاغ کے انتخابات ہوتے تھے)؛ مضامین الہلال؛ مقالات الہلال؛ انتخاب الہلال؛ تحریکِ آزادی؛ عیدین؛ ام الکتاب (یہ ترجمان القرآن کے سورۂ فاتحہ کا حصہ الگ کرکے شائع کیا گیا تھا)؛

امر بالمعروف؛ ولادت نبوی؛ ذکریٰ؛ میرا عقیدہ؛ افسانۂ ہجر و وصال؛ اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان؛ مقامِ دعوت؛ حقیقۃ الصلوٰۃ، حقیقت الصیام؛ حقیقت الحج؛ حقیقت الزکوٰۃ؛ الحریت فی الاسلام؛ الحرب فی الاسلام؛ صدائے حق؛ جہاد اور اسلام؛ حزب اللہ؛ ہندستان پر حملہ؛ تعلیمی ترکِ موالات کا مقصد؛ اتحادِ اسلامی؛ مشہور تقریر؛ مضامین آزاد؛ —— خلافت؛ الحرب فی القرآن اور صبحِ امید —— اور ترجمان القرآن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔

یہ سب کی سب کتابیں، جن میں سے کوئی فرضی نہیں اس لئے کہ بیشتر خود میرے پاس موجود ہیں، اصل میں الہلال کی تحریروں کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے بنائی گئی ہیں۔ الہلال میں شائع شدہ تحریروں کا اچھا خاصہ حصہ سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبداللہ عمادی، مرزا محمد عسکری، عبدالواحد ندوی، حامد علی صدیقی اور بعض دوسرے بزرگوں کے قلم سے نکلا ہے اس لئے ان ضرب تقسیم والی کتابوں کو الہلال کی موجودگی میں مولانا کی تصانیف ماننا بے فائدہ بھی ہے اور بے احتیاطی بھی۔ جو چیزیں الہلال میں نہیں انھیں میں نے ان کی بعض دوسری مستقل تصانیف میں شامل کرلیا ہے اور جو ایک آدھ بھولی بھٹکی تحریر کسی بھی مجموعہ میں نہیں اس کا الگ سے اندراج کر دیا گیا ہے۔

ان ضرب تقسیم اور جمع تفریق کے مجموعوں سے تو آسانی سے نبٹا جا سکتا ہے لیکن خیام اور حافظ کی طرح ابوالکلام کے نام سے بھی فائدہ اٹھا کر کسی خوش فکر نے "رسولِ عربی" کے نام سے ایک ڈراما شائع کیا ہے یہ کتاب مکتبۂ عظمت لاہور نے شائع کی ہے، اشرف پریس میں چھپی ہے $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز اور ۲۷۵ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۵ روپے ہے۔ دیباچہ میں جو ابوالکلام آزاد کی طرف سے ہے کہا گیا ہے کہ سیرت پر عرصہ سے کتاب لکھنے کی اسکیم ہے لیکن فی الحال یہ کتاب پسند آگئی جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

نہ یہ معلوم کہ کس کتاب کا ترجمہ ہے نہ یہ معلوم کہ کس زبان سے ترجمہ ہوا ہے۔ یہ کتاب ادھر کے دس پندرہ سال کے اندر کی چھپی ہوئی لگتی ہے۔ اگر سچ مچ ترجمہ ہے تو مزے کا ہے۔

قصہ بھی دلچسپ ہے لیکن نہ عبارت میں ابوالکلام کا انداز ہے نہ ڈراما سے ان کی دلچسپی کا کہیں کوئی حوالہ ملتا ہے۔ میں بالکل رد تو نہیں کر سکتا لیکن اس کتاب کو مولانا کی کتاب ماننے کے لئے میرے پاس کوئی توجیہ نہیں ہے۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ انجمن کے نائب معتمد اور میرے محترم کرم فرما حفیظ الدین صاحب نے اطلاع دی کہ "رسولِ عرب" ان کی یادداشت کے مطابق عبدالرزاق ملیح آبادی کا لیا ہوا ترجمہ ہے یا شاید زین العابدین سجاد میرٹھی کا۔"

ابوالکلام کی صحافت

خواجہ مقبول احمد الہ آباد یونیورسٹی

ہندوستانی صحافت نگاری کو اپنی تقریباً دو سو سال کی زندگی میں بڑے پر پیچ مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ اس کا ارتقاء خط مستقیم کی شکل میں نہیں بلکہ خط منحنی کی شکل میں ہوا۔ بلا شبہ ہندوستانی صحافت نگاری کا آغاز ایک انگریز کے ہاتھوں انگریزی زبان میں ۱۷۸۰ء میں ہوا لیکن جن حالات نے اسے جنم دیا ان کے ماتحت ہم انگریزوں کے ممنون احسان نہیں۔ اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری اپنے شباب پر تھی۔ ہندوستان کا سیاسی اور سماجی نظام پسماندہ تھا۔ انگلستان میں بقول جواہر لال نہرو "سیاسی انقلاب آچکا تھا۔ بادشاہ کے مقابلہ میں پارلیمنٹ کی برتری تسلیم کی جا چکی تھی اور اس نئی قوت کے احساس نے نئے متوسط طبقے میں وسعت و گیرائی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی"۔ انگریزوں نے اپنے استحکام اور حفاظت کے لئے ریل۔ تار۔ ڈاک وغیرہ کی سہولتیں تو فراہم کر دیں لیکن اخبار نویسی کی طرف سے ہمیشہ بے اعتنائی کی کیوں کہ یہ بغاوت کا آلہ بننے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ لیکن حالات اجتماع ضدین کے حامل ہوتے ہیں جن ذرائع پر انھوں نے سب سے زیادہ پابندی لگائی وہی انکی مخالفت کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ہندوستان میں جدید اخبار نویسی کی داغ بیل حکمراں قوم کے ان افراد کے ہاتھوں پڑی جن کے ذاتی مفاد کی تمام راہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری نے روک رکھی تھیں۔ اس طرح آپس میں چشمک کے طفیل شروع ہی سے باغیانہ عنصر اس کی خمیر میں داخل ہو گیا۔ کمپنی کی حکومت نے اپنے ہم قوموں پر سختی کرنے میں بھی تامل نہ کیا۔ لارڈ ہیسٹنگز کے مستعفی ہونے پر جب ایڈم کو چارج ملا تو اس نے اخبار نویسی پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیں، کمپنی کے بے جا استبداد اور لوٹ کھسوٹ پر نکتہ چینی کرنے والے اخبار "کلکتہ جرنل" کے ایڈیٹر بکنگھم کو ہندوستان سے نکلوا دیا۔ دوسرے ایڈیٹر کا بھی تھوڑے دنوں بعد یہی حشر ہوا۔ اپریل ۱۸۲۳ء

ایک ایکٹ کے ذریعہ اخباری آزادی کا گلا گھونٹ دیا۔ اس سے پہلے بھی صحافتی دنیا میں خوف وہراس کا عالم تھا۔ ۱۸۱۸ء میں جب سری رام پور کی مشنری نو آبادی سے بنگالی کا ایک رسالہ دِگ درشن نکالا گیا تو عیسائی مشنری ڈرے سہمے سے تھے حالاں کہ ان کے مشن سے گورنمنٹ کے اختلاف کا سوال ہی نہ تھا۔ دِگ درشن کے ایڈیٹر جان کلاک مارش مین نے رسالہ نکالتے وقت لکھا تھا کہ یہ رسالہ "حکومت کی نبضیں ٹٹولنے کے لئے جاری کیا گیا تھا" اور جب حکومت نے اس کے خلاف کارروائی نہ کی تو بڑی خوشی منائی گئی۔ اس مشن کی صحافتی کوششوں میں انگریزی کا ماہوار رسالہ فرنڈز آف انڈیا بھی قابل ذکر ہے۔

لیکن صحیح معنوں میں ہندوستانی نقطۂ نظر کی اخبارنویسی کے کارواں سالار راجہ رام موہن رائے تھے جنھوں نے اپنے بنگلہ اخبار "سمبدکومدی" اور فارسی "مراۃ الاخبار" کے ذریعہ بے لاگ صداقت کا علم بلند کیا۔ "سمبدکومدی" کی اشاعت انگریز ایڈیٹروں کی نگاہ میں ابتدا ہی سے کھٹکنے لگی تھی چناں چہ کلکتہ جرنل میں اس کا اشتہار دیکھ کر ایک انگریزی اخبار نے لکھا:

> "ہم ان لوگوں کے ہم آواز نہیں ہوسکتے جو اس اخبار کو چراغ ہدایت سمجھ کر مرحبا کہہ رہے ہیں..."

پھر آئرلینڈ کا حوالہ دے کر بتایا:

> "اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بنگالی اخبار بھی وہیں کے اخباروں کی طرح فتنہ انگیزی پر نہ اتر آئے گا......"

رام موہن رائے نے آزادی تحریر کے لئے آواز اٹھائی اور ایڈم کی سخت گیریوں کے خلاف سپریم کورٹ اور ملکہ کنڈر تک صدائے احتجاج بلند کی۔ جب نتیجہ خلاف امید نکلا تو احتجاج کے طور پر انھوں نے اپنا اخبار بند کردیا۔ آگے چل کر ولیم بنٹنک اور اجہرسٹ کے زمانہ میں اخباروں کی طرف دھیان دیا گیا۔ ۶ر فروری ۱۸۳۵ء کو ہندوستانی اور انگریز ایڈیٹروں نے ... ۹ دستخطوں سے جو درخواست پیش کی تھی وہ قبول ہوگئی۔ ۳ر اگست ۱۸۳۵ء سے اخباری آزادی کی سہولتیں پھر ملیں لیکن کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کو یہ بات اچھی نہ لگی اور لارڈ اجہرسٹ اسی سلسلہ میں معتوب ہوگیا۔

کمپنی نے اپنے اقتدار کا پورا پورا مظاہرہ کرنے کے لئے یہ لازمی سمجھا کہ مغلوں کی دفتری زبان سے بھی ناتا توڑلیا جائے۔ چناں چہ اس نے فارسی سے قطع تعلق کرکے عوام کی سب سے زیادہ رائج زبان اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ دفتروں اور کچہریوں میں اردو کی مانگ نے اردو خوانی میں تیزی سے اضافہ کیا اور اردو اخبارنویسی بھی چل نکلی۔ اس زمانہ کا سب سے اہم اخبار "دہلی اخبار" کہا جاسکتا ہے جسے مولوی محمد باقر نے نکالا تھا۔ اس اخبار نے

آگے چل کر جنگ آزادی کے لئے راہ ہموار کی۔ اس کے مزاج کی کیفیت اس سے عیاں ہوتی ہے کہ یہ "دہلی اخبار" سے "اردو اخبار" ہوا اور پھر غدر کے زمانہ میں "اخبار الظفر" بن گیا۔ انقلابی جذبات کی ترجمانی کرنے والا دوسرا اخبار "صادق الاخبار" دہلی تھا۔ یہ اخبارات کھل کر سب کچھ نہ لکھ سکتے تھے لیکن اشاروں ہی اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس زمانہ کے لحاظ سے اتنی ترقی پسندی بھی کافی تھی۔ غدر کے بعد تاج برطانیہ کی تخت گیریاں شروع ہوئیں تو اخباروں کی آزادی کا پھر خاتمہ کر دیا گیا۔

اردو صحافت نگاری اپنی کم عمری اور بے بضاعتی کے باوجود بجا طور پر فخر کر سکتی ہے کہ اس کا سابقہ ملک کے ان نامور فرزندوں سے رہا ہے جو قومی و ملی ترقیوں اور رہنمائیوں میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ ماسٹر رام چندر، محمد حسین آزاد، حالی، سرسید، سر عبدالقادر[1]، مولانا محمد علی، لالہ لاجپت رائے وغیرہ کے نام اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" نے تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر تنقید و اصلاح کے لئے زبردست اور کامیاب کوشش کی لیکن اس کا اجرا اس زمانہ میں ہوا جب سرسید مغرب سے بری طرح مرعوب ہو چکے تھے وہ "اسباب بغاوت ہند" والے سرسید نہ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی ترقی اور جنگ آزادی کے سلسلے میں تہذیب الاخلاق کا کارنامہ قابل ذکر نہیں۔ ہمارا یہ کہنا غالباً ان کے جملہ احسانوں سے بے اعتنائی پر محمول نہ کیا جائے گا۔ ان کی مصلحت پسندی اور دور اندیشی نے ہمیں بہت سے فائدے بھی پہنچائے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید کی کانگریس دشمن پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ذہن کا سیاسی پہلو جمود و تعطل کا شکار ہو گیا اور کم و بیش ۱۹۱۲ء تک وہی عالم نظر آتا ہے جب ابوالکلام کی صدائے رعد آسا نے غفلت شکن سے سوتے ہوؤں کو چونک اٹھنے پر مجبور کیا۔

ابوالکلام آزاد ایک بہت ہی اور حقیقی اور خود ساختہ شخص تھے جن کی طبع سلیم نے انھیں خانقاہ کے جھمیلوں اور مریدوں کے جھگڑوں کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ نہ ان کے والد نے انھیں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی تلقین کی تھی جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے اور نہ انھیں اخبار نویسی کا شوق دلایا تھا جیسا کہ محمد اکرام نے "موج کوثر" میں لکھا ہے۔ وہ تو اردو کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ دہلوی ہو کر بھی ان کی اردو تعلیم کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا کی ادھوری سوانح حیات

---

[1] انھوں نے لاہور سے اردو میں اخبار "بندے ماترم" جاری کیا تھا۔
Sir Abdul Qadir Under Language & Literature
B Belukes ali Chap. IV P.96
Azad

"آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" شائع کر دی ہے جسے وہ ۱۹۲۱ء میں قید فرنگ کے زمانہ میں لکھوا رہے تھے۔ یہ کتاب اور مولانا کے متعلق بہت سے دیگر معلومات محمد اکرام کے پاس نہ تھے چناں چہ آزاد کو سمجھنے میں ان سے پے در پے لغزشیں ہوئی ہیں۔ کبھی وہ انھیں مولانا شبلی کا شاگرد بنا دیتے ہیں جنھوں نے ان کے تبحر علمی کا اس کبرسنی میں بھی لوہا مان لیا تھا اور سیرۃ النبیؐ میں قرآن کریم سے رسول پاکؐ کی سیرت کی تلاش میں ان کی قیادت قبول کی تھی جنھوں نے الندوہ کی ادارت کے لئے ان سے التجا کی تھی اور جن کے سیاسی افکار میں گرمی اور اظہار کی بلاغت آزاد کے طفیل میں پیدا ہوئی۔ اس موضوع پر یہاں تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں اس لئے مزید وضاحت سے اجتناب لازمی ہے۔

"آزاد کی کہانی" سے پتہ چلتا ہے کہ شعر گوئی نے ابوالکلام کو ایک بڑے دلچسپ طریقہ سے صحافت کے قریب کر دیا جو آئندہ زندگی میں ان کے لئے کارآمد ثابت ہوئی۔ اس زمانہ میں بعض ایسے رسالے نکلتے تھے جن میں مصرع طرح پر لکھی ہوئی غزلوں کے مجموعے چھاپے جاتے تھے۔ وہ "گلدستہ" کے نام سے مشہور تھے۔ "پیام یار" اور "خدنگ نظر" اس زمانہ کے مشہور گلدستوں میں تھے ان پرچوں میں ابتدائی کلام چھپوانے کے سلسلہ میں مولانا کو خود گلدستہ نکالنے کا شوق ہوا اور انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے بچپن ہی میں ایک رسالہ نکالا جو چند مہینوں تک چلتا رہا۔ مولانا کی تعلیم قدیم ترین انداز پر ہوئی تھی جہاں حفظ درس سے قطع نظر مضمون نویسی سے کسی کو واقفیت نہ تھی۔ لیکن فطری استعداد نے انھیں اکسانا شروع کیا۔ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان وہ خود سے مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے میں مشغول رہے اور حالی کی طرح خود ہی اپنی اصلاح و تنقید بھی کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ شبلی سلیم نے رنگ نکھار دیا۔ اسی زمانہ میں کلکتہ سے محمد موسیٰ نامی ایک شخص نے بغرض تجارت اخبار نکالنا چاہا۔ مولانا اب تک جو کچھ کرتے والد سے چھپ کر ہی کرتے اس لئے بڑے پیمانے پر اخبار یا رسالہ نکالنے کا سوال ہی نہ تھا۔ محمد موسیٰ کو انھوں نے "المصباح" نکالنے پر آمادہ کر لیا اور سنہ ۱۹۰۱ء کے آخر میں اس کے ایڈیٹ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ پہلے نمبر میں "عید" کے عنوان سے ان کا لیڈنگ آرٹیکل نکلا اور مقبول عوام "پیسہ اخبار" نے اسے نقل کرنا مناسب سمجھا۔ تین چار مہینہ کے بعد "المصباح" بند ہو گیا اب مولانا "مخزن" میں مضامین بھیجنے لگے۔ مئی سنہ ۱۹۰۲ء کے مخزن میں "فن اخبار نویسی" پر ان کا ایک مضمون چھپا جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اخبار نویسی سے باقاعدہ دلچسپی پیدا کر لی تھی اور اس کے رموز سے واقف ہو چکے تھے۔ اگست کے پرچے میں "حکیم خاقانی شروانی" پر ان کا ایک مضمون ملتا ہے در اصل وہ

ایک " تذکرۃ الشعرا " لکھنا چاہتے تھے مگر اسکیم کبھی مکمل نہ ہوسکی کیوں کہ اک سرو ہزار سودا کا معاملہ تھا۔"

انھیں اخبار بینی کا پہلا اتفاق والد کے ایک مرید کی دوکان پر ہوا جہاں " اخبار عام " لاہور آتا تھا۔ دہیں اودھ اخبار لکھنؤ اور دارالسلطنت کلکتہ بھی انھوں نے دیکھے لیکن جب کلکتہ سے محمد احسن فتحپوری نے " احسن الاخبار " نکالا اور اس کے مبادلے میں مصر و شام و طرابلس کے اخبارات آنے لگے تو وہ المنار و الہلال بھی سے آشنا ہو گئے اور غالباً یہیں سے انھوں نے اپنے اخبار الہلال کے لئے نام مستعار لیا۔ ان اخبارات کے ذریعہ دنیائے اسلام سے ان کی دلچسپیاں اور بڑھ گئیں۔ نوبت رائے نظر کے گلدستہ " خدنگ نظر " میں جب نثر کا حصہ اور بڑھایا گیا تو اس کی ادارت مولانا کے سپرد ہوگئی۔ اسی رسالہ کے ایک شمارہ میں اکس ریز کی تاریخ (EX-RAYS) کے متعلق مولانا کا ایک مضمون دیکھ کر شبلی ان سے متاثر ہوئے تھے۔ ان دنوں آزاد نے ایک " دارالاخبار " قائم کرلیا تھا جہاں کچھ رسالے اور جرائد خریدے جاتے لیکن زیادہ تر " احسن الاخبار " کے مبادلہ میں آجاتے تھے۔ جب " احسن الاخبار " بند ہوا تو مبادلہ کی کوئی صورت نہ رہی اب وسعت مطالعہ کی سہولتوں اور دارالاخبار کے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ایک جریدہ نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے دارالاخبار کے ایک سرگرم رکن مولوی محمد یوسف جعفری کی مدد سے فل اسکیپ سائز پر ایک پندرہ روزہ رسالہ " لسان الصدق " نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ بھی جو مولانا کے دریائے بیتابی میں ایک موج خوں کی حیثیت رکھتا تھا اتنا اہم سمجھا گیا کہ مخزن اور وکیل جیسے سربرآوردہ رسالوں نے اسے سراہا، معاصرین نے اس پر تعریفی ریویو لکھے۔ اس وقت مولانا کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی۔ چھ مہینے کے بعد مولانا نے اسے ماہوار بنا کر ضخیم کردیا اور کتاب کی شکل میں کم از کم تین جزو پر مشتمل ہوکر شائع ہونے لگا۔ ابوالکلام اس زمانہ میں والد سے چھپ کر سرسید، محمد حسین آزاد، اور حالی کا لٹریچر پڑھا کرتے تھے اور سرسید کے زبردست عقیدت مندوں میں تھے۔ " حیات جاوید " پر ایڈیٹر مخزن نے نکتہ چینی کی تو مولانا نے اس کے جواب میں بڑے جوش و خروش سے مضمون لکھا۔ یہ رسالہ حالی کے پاس بھی جاتا تھا اسی سلسلہ میں حالی سے رسم و راہ ہوگئی۔ اسی لسان الصدق کی بدولت وہ " انجمن حمایت اسلام " کے جلسوں میں تقریر کرنے کے لئے مدعو کئے گئے جہاں والد کی لاعلمی میں پہنچ گئے اور آناً فاناً شہرت کے مالک بن بیٹھے۔ ان دنوں انجمن حمایت اسلام کو بہترین مسلم رہنماؤں کا تعاون حاصل تھا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں مولانا عراق چلے گئے چناں چہ پھر لسان الصدق کا کوئی نمبر نہ نکل سکا۔ واپسی پر بمبئی میں

مولانا شبلی سے ان کی ملاقات ہوئی جنھوں نے "الندوہ" کی ادارت منظور کرنے پر اصرار کیا۔ اس درمیان میں مولانا آزاد کے علمی و مذہبی افکار میں کافی انقلاب آچکا تھا۔ والد سے ان کے اختلافات شروع ہو چکے تھے اور انھوں نے دبے دبے لہجے میں یہ کہہ دیا تھا کہ انھیں پیری مریدی سے نفرت ہے، ان کا مسلک کچھ اور ہے۔ چناں چہ خاندان کے افراد اور آزاد کے درمیان خلیج حائل ہوگئی صرف ایک بہن تھیں جو ان کی پشت پناہی کیا کرتی تھیں۔ مولانا کو "الندوہ" کی ادارت کے ذریعہ گھر سے علاحدہ ہو جانے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ جب شبلی نے حیدرآباد سے استعفیٰ دے کر لکھنؤ میں بود و باش اختیار کرلی تو وہ ان کے پاس چلے گئے اور الندوہ کا کام سنبھالنے لگے۔ پھر تھوڑے دنوں بعد انھیں ایک سخت ضرورت سے بمبئی جانا پڑا جہاں شیخ غلام محمد مالک "وکیل" سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں وکیل کے ایڈیٹر اپنی اصلی ملازمت پر واپس چلے گئے تھے۔ شیخ صاحب نے مولانا سے ادارت قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اردو اخباروں میں وکیل کا حلقہ مطالعہ بہت وسیع اور بلند تھا۔ مولانا نے نئے اخبار کے لئے جد و جہد کرنے کی بہ نسبت اس کی ادارت کرنا بہتر خیال کیا اور کام شروع کر دیا۔ انھیں علامہ شبلی سے علاحدہ ہونا بھی پسند نہ تھا اس لئے ذہن میں کچھ دنوں کش مکش رہی لیکن فیصلہ "وکیل" کے حق میں کرنا پڑا کیوں کہ مالک وکیل اور آزاد ان دنوں سرسید کے پرستاروں میں سے تھے۔ آزاد نے وکیل کی اشاعت میں چند خوشگوار تبدیلیاں کیں۔ جوش تحریر میں دو کالم کی جگہ چار کالم کا ایڈیٹوریل لکھنے لگے۔ مراسلات و اقتباسات کا معیار بلند کر دیا اور ایڈیٹوریل کے علاوہ علمی و تاریخی مقالات کے لئے صفحے بڑھا دیے۔ ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو طبیعت دل برداشتہ ہوگئی اور والد کا بھی اصرار بڑھ گیا چنانچہ وہ کلکتہ واپس چلے آئے جہاں نواب سلیم اللہ خاں کی خواہش سے اخبار "دارالسلطنت" کلکتہ کی ادارت قبول کرنی پڑی۔ آگے چل کر مالک اخبار سے اختلاف ہوگئے اور آٹھ نو مہینے بعد مولانا نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ چند دنوں بعد دوبارہ امرتسر جانے کا اتفاق ہوا اور مولوی غلام محمد کے اصرار پر پھر وکیل سے وابستہ ہوگئے اب کی بار انھوں نے ہفتے میں تین بار نکلنے والے "وکیل" کو بائی ویکلی کر دیا اور ضخامت بڑھا دی۔ اب مولانا کے ذہن میں تحریک سرسید کے متعلق ردعمل ہو چکا تھا اور اس کا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑنے لگا تھا۔ اس بار ان کے پولیٹکل خیالات میں مسائل ہند کے متعلق وہ تبدیلی آچلی تھی جو آگے چل کر مسلک الہلال کی شکل میں رونما ہوئی۔ شیخ غلام محمد کے معتقدات اپنی جگہ پر تھے۔ چناں چہ ان سے اتفاق نہ ہوسکا۔ آزاد نے یہی مناسب سمجھا کہ ذاتی اخبار نکال کر اپنے خیالات کی تبلیغ

کی جانے اس لئے وکیل سے دوبارہ وابستگی کی مدت نو دس ماہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مولانا دل برداشتہ ہو کر اپنی ہمشیر کے یہاں بھوپال چلے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور مولانا کو کھل کر اپنی تحریک چلانے کا موقع ہاتھ آگیا۔ چناں چہ وہ باقاعدہ کلکتہ میں رہنے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے سبب صوبہ میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ کلکتہ کے قیام (جو اس زمانہ میں دارالسلطنت تھا) اور خصوصاً ان اسباب کی وجہ سے انھیں سیاست میں دلچسپی لینے کا موقع مل گیا۔

فروری ۱۹۲۰ء میں صوبائی بنگال خلافت کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں مولانا نے فرمایا تھا:

"۱۹۱۱ء میں جب میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا مجھے موقع ملا کر اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک مذہب عمل قرار دے لوں۔ خدمت ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھائے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے . . . . میں نے جو اپنے لئے راہ عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی موجودہ زمانے کی صحافتی لیڈرشپ کی راہ نہ تھی"۔

مولانا نے اسی پالیسی کے مطابق ۱۹۱۲ء سے الہلال نکالنا شروع کیا۔ انھوں نے اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت سے کافی سبق اور تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ ہندوستان کے سرگرم مرکز سے وہ علاقہ رکھتے تھے اور مختصر سی عمر میں علمی فتوحات اور صحافتی تجربوں نے انھیں بڑی توانائی بخش دی تھی۔ الہلال بڑی آب و تاب سے طلوع ہوا، اس کی ضیاباری نے نوجوانوں کی رگ رگ میں . . . رت کا ایک طوفان پیدا کر دیا، مسلمانوں کو جمود و تعطل سے نکال کر ہوش و خرد کی منزل کی طرف آنے پر آمادہ کر دیا۔ آزاد نے نوجوان ترکوں کی آئینی اصلاحوں کا خیر مقدم کیا، ہندو مسلم اتحاد اور جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شرکت پر زور دیا۔ ہفتہ وار الہلال متنوع عنوانات کا حامل ہوتا، اس میں سیاسیات، تبلیغ دین، شذرات، حکمت، احوال شرق و غرب، علمی و سائنسی معلومات، شعر و ادب سب ہی کے لئے گوشے مقرر تھے۔ مولانا اپنے تبحر علمی کی بدولت ان تمام موضوعات پر یکساں روانی اور کامیابی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے۔ الہلال کے صفحوں سے ہی انھوں نے تبلیغ اسلام اور تفسیر قرآن کا کام بھی شروع کیا اور علی گڑھ تحریک کی کامیاب مخالفت بھی کی۔ انھوں نے انگریزوں کے

ظلم و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی اور عقل و بصیرت کا سبق بھی دیا ۔ ان کی آواز ہندوستان کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں بھی تیزی سے پھیلنے لگی اور لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے ۔ ان دنوں ابوالکلام آزاد پان اسلامزم کے حامی تھے اور خلافت کی گرتی ہوئی دیواروں کو تھامنے کے لئے سعیٔ مسلسل کر رہے تھے۔ اسلامیات پر انھیں اتنا عبور تھا کہ وہ زندگی کے ہر پہلو، فرد اور سماج کے ہر رشتے کے متعلق قرآن وحدیث سے اقتباسات پیش کرتے اور دکھاتے کہ دنیا و دین میں کامیابی کے لئے بہترین نقطۂ نظر یہی ہے۔ جنگ عظیم نے ترکی کی خلافت کو خطرہ میں ڈال دیا ۔ خلیفہ نے جرمنی کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے ان کے خلاف صف آرائی کی ۔ ایسے زمانے میں خلافت اور ترکی کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا آواز اٹھانا حکومت کو ناگوار گزرا۔ لطف یہ کہ حکومت کی ناراضگی سے پہلے ہندوستان کے انگریز ایڈیٹروں کی تیوری پر بل آنے لگے ۔ پانیر الٰہ آباد نے "الہلال اور پرو جرمنزم" کے نام سے ایک آرٹیکل لکھ کر ٹھیک اسی طرح الہلال کی خطرناک پالیسی کی طرف گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرائی جس طرح " فرنڈز آف انڈیا" نے راجہ رام موہن رائے کے سمبد کمودی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی ۔ مولانا نے الزام کا دنداں شکن جواب دیا لیکن حکومت تو پھر حکومت ہے آخر ۱۹۱۴ء میں الہلال کی ضمانت ضبط کر لی گئی ۔ اب مولانا نے "البلاغ" نکالنا شروع کیا ۔

البلاغ کے ابتدائی شماروں میں انھوں نے " فاتحۃ البلاغ " کے عنوان سے عربی اور اردو میں اپنے اخبار کی پالیسی کے متعلق طویل اداریے لکھے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ دین اور آزادیٔ افکار کے لئے انھوں نے کتنی بڑی قربانی کی، آبائی دولت جس سے سالہا سال عیش سے بسر کر سکتے تھے تبلیغ و اشاعت کی نذر کر دی اور اپنے اخبار کو تجارتی مقاصد اور زمانہ سازی کا محکوم نہ بنایا ۔ ایک اداریہ میں مرقوم ہے :-

"ہر اُس شخص کو جس کی نظروں سے میرے مطبوعہ کاموں کی ایک سطر بھی گذری ہے اور نیز ہر اُس شخص کو جس تک میری آواز پہنچی ہے یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں تاجر نہیں ہوں اس خدا کے لئے جس کی زمین لاکھوں کروڑوں تجارت گاہوں و تجارت کے قافلوں سے رکی ہوئی ہے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے ہر بندے کو تاجر ہی بنائے ....

میں تاجر نہیں ہوں اور تجارت نہیں کرتا خلاق فطرت نے مجھ کو تجارت کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی استعداد بھی نہیں دی اور ابتدائے عمر سے جن حالات و موثرات کے ماتحت رکھا ان کی دنیا تجارت گاہ سود و زیاں سے اس قدر دور ہے کہ اگر میں خود چل کر وہاں جانا بھی چاہوں تو

نہیں پہنچ سکتا۔

باشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا لیکن یہ صرف اس لئے کیا کہ اظہار خیال اور تبلیغ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا........ میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیوں کہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے۔

تجارتی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز پریس کا نفع و نقصان تھا لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس چیز سے زیادہ میں نے کسی چیز سے بے پروائی نہیں کی اور مال و صحت کے نقصان کے سوا اس سے کوئی تجارتی معاوضہ مجھے حاصل نہ ہوا۔[1]

حکومت کی گرم نگاہی نے ۱۹۱۶ء میں "البلاغ" کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن ان اخباروں کے ذریعہ مولانا نے سیاسی میدان میں جو کامیابی اختیار کی اور مسلمانوں کے ذہن کو جس طرح بیدار کیا وہ حقیقتیں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ اس زمانے میں حب الوطنی کی لہر دوڑ چلی تھی اکثر اخبار و رسائل میں واضح یا پوشیدہ طور سے یہ انداز آ چلا تھا لیکن الہلال و البلاغ کا رنگ ہی اور تھا اس نے مولانا محمد علی کے "ہمدرد" کو بھی معتدل پالیسی اور آئینی جد و جہد سے خالص جد و جہد کی طرف آنے پر مجبور کیا۔ "حدیث الغاشیہ" کے نام سے مولانا محمد علی کی تعلیمی پالیسی پر انھوں نے جس انداز سے نکتہ چینی کی تھی اس کے بارے میں مولانا محمد علی کے عقیدت مند قاضی عبدالغفار کا بیان ہے کہ وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہے۔[1] مولانا روزمرہ کے واقعات کو بھی اس ادبی اور فنی انداز سے بیان کرتے کہ لوگ اس پر سر دھننے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔ ان کی آواز میں تلخ نوائی کے باوجود ادائے محبوبی کی بھی کمی نہ تھی۔ الہلالی اردو پر بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس رنگین، شاندار اور باوقار اسلوب کے سبب مولانا کی آواز میں ہمہ گیری کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

محمد اکرام اور رام بابو سکسینہ نے الہلالی اردو پر بڑی سخت تنقید کی ہے اور اسے اردو دشمنی اور سرسید کی مخالفت سے تعبیر کیا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آزادی کے بعد علی گڑھ میں کانوکیشن ایڈریس دیتے ہوئے مولانا نے جو تقریر کی تھی اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ ابتدائی زمانہ کے بعد مسلک سرسید کے مخالف ہو گئے تھے لیکن سرسید کی سیاست سے قطع نظر ان کے دوسرے کارناموں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ بحیثیت وزیر تعلیم انھوں نے جو سلوک کیا اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے۔

---

[1] آثار ابوالکلام ص ۳۵، ۳۶

انھیں یونیورسٹی سے پرخاش تھی نہ سرسید سے بلکہ سرسید کی سیاسی پالیسی کی جس طرح اندھی تقلید کی جارہی تھی اور ان کی تعلیمی تحریک کو جس طرح زندگی کے ہر شعبہ پر جا و بے جا طور سے مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی تھی وہ اسے مُضر سمجھتے تھے اس لئے سخت سے سخت تنقید پر مجبور تھے۔ الہلالی اردو کے نکتہ چینوں میں محی الدین زور بھی ہیں یہ لوگ آزاد پر اردو دشمنی کی تہمت رکھتے ہیں اور ثقیل الفاظ کا انبار لگانے کا الزام لیکن غور کرنے سے حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ آزاد اس مذہبی اور علمی ماحول سے آرہے تھے جہاں حدیث کا ذکر بھی جزو تھا۔ ان کی ماں اور بہنیں عموماً عربی سے سروکار رکھتی تھیں۔ باپ نے بھی عربی و فارسی اور مذہبی تعلیم پر اتنا زور دیا کہ آزاد کو اردو سنوارنے کا موقع نہ ملا۔ جب انھوں نے الہلال نکالنا شروع کیا تو انھیں اردو میں کامل مہارت حاصل نہ ہوئی تھی اگرچہ تبحر علمی ہاتھ آگیا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ جس قسم کی تبلیغ ان کے مدِ نظر تھی وہ ایسی ہی رنگین، باوقار، پرزور اور گراں بار لب و لہجہ کی متقاضی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں سلیس اور رواں دواں اردو کی کمی تھی۔ آزاد کی نثر نگاری کے ارتقاء کے متعلق کچھ عرض کرنا اپنے موضوع سے گریز کا موجب قرار پائے گا ورنہ یہ دکھایا جا سکتا تھا کہ آگے چل کر ان کی نثر رنگینی سے سادگی اور مشکل پسندی سے سلاست و روانی کی سرحد میں کن کن مرحلوں سے ہوتی ہوئی داخل ہوئی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ "غبارِ خاطر" کے اکثر حصّوں کی اردو دیکھنے کے بعد آزاد پر مشکل پسندی سے دلچسپی اور عربیت کے احیاء کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے الہلال اور البلاغ میں ایسے عنوانات رکھے تھے جو کانوں کے لئے نامانوس تھے مثلاً شیؤنِ اسلامیہ، آثارِ عتیقہ، اسئلہ و اجوبتہا، مذاکرۂ علمیہ وغیرہ یہ بھی بجا ہے کہ انھوں نے انگریزی الفاظ کی جگہ بعض مرتبہ عربی اور فارسی اصطلاحیں استعمال کیں مثلاً وائرلیس کی لاسلکی، لیڈر کی جگہ زعیم لیکن محض ان الفاظ و اصطلاحات کی وجہ سے انھیں ماضی پرستی، رجعت پسندی اور عربیت کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ آزاد کی یہ روش اس زمانہ میں تھی جب اردو میں اصطلاحیں ایجاد کرنے کا مسئلہ پیشِ نظر تھا چنانچہ انھوں نے تقلیدِ فرنگ سے گریز کرتے ہوئے اپنی معلومات کے مطابق الفاظ اور اصطلاحوں کی ایجاد میں حصہ لیا۔ جس شخص نے ٹھیٹھ خانقاہی انداز سے پرورش پا کر بھی باتصویر اخبار نکالا، تجدید دین کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیقات اور یورپی فلسفہ کے تراجم پیش کئے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دی اسے ہم تنگ نظری کا الزام ہرگز نہیں دے سکتے۔ الہلالی اردو پر کتنی ہی تنقید کی جائے یہ حقیقت ناقابلِ فراموش ہے کہ حسرت اس زلف کے شیدائی تھے۔ سجاد انصاری اور قاضی عبد الغفار نے

اس چراغ سے اپنی شمع فکر و فن روشن کی تھی ۔ مولانا محمد علی کے شیدائی اور ابوالکلام کے خاص نکتہ چیں قاضی عبدالغفار کا بیان ہے کہ مولانا محمد علی بھی اس کے زور اور ادبیت کے معترف تھے ۔ ہمدرد کا الہلال سے موازنہ کرتے ہوئے "آثار ابوالکلام" میں لکھتے ہیں :

"اس کے دائرہ اثر میں وسعت تو بہت تھی لیکن گہرائی اتنی نہ تھی"

مختصر یہ کہ اس زمانے کے دوسرے معیاری جرائد کا آزاد کے جریدوں سے مقابلہ کیجئے تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

ع ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

جنگ آزادی کی چشم فسوں ساز نے اردو زبان سے اس کا ایک زبردست صحافی ہمیشہ کے لئے چھین لیا لیکن مختصر عرصہ میں اس نے جو کچھ لکھا ارباب ذوق کے لئے آج بھی سرمۂ نظر ہے ۔ گوناگوں مصروفیات اور جہد مسلسل سے وقت نکال کر آزاد نے ۱۹۲۷ء میں ایک بار پھر الہلال نکالنا شروع کیا اس مرتبہ دینی و علمی، تاریخی و فلسفیانہ اور شعری و تنقیدی عنوانات کے علاوہ افسانوی عنوان کا بھی اضافہ ہو گیا ۔ اب انھوں نے ابتدائی صفحوں میں اردو طباعت کی خامیوں اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلانے کی کوشش شروع کی ۔ چناں چہ پہلے صفحے پر جو اشتہار ہوتا اس سلسلہ میں لوگوں کی رائیں طلب کی جائیں ۔ لیکن کچھ تو مصروفیتوں کے سبب اور کچھ اس بدبختی کے سبب جس سے مسلمانوں نے اپنے صحیح رہنما کو فراموش کر دیا تھا، انھیں جلد ہی رسالہ بند کرنا پڑا کیونکہ اب الہلال کی وہ مقبولیت باقی نہ تھی ۔ جب سیاسی کوتاہ بیں ان کے ترجمان القرآن کو تختۂ مشق بنانے سے باز نہ رہ سکے تو الہلال کی عدم مقبولیت عجیب بات نہیں ۔ ۱۹۲۷ء کے جدید الہلال کا قدیم الہلال اور البلاغ سے مقابلہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ خطابت کی طرح ان کی تحریر میں بھی اب رنگینی اور جذباتیت کی جگہ سادگی اور متانت نے لے لی تھی اور الہلال اردو کے دامن سے وہ دھبہ دور ہو چکا تھا جس پر انگشت نمائی کی جا و بے جا کوشش کی جاتی تھی ۔

الہلال و البلاغ کی مدت حیات بہت مختصر تھی لیکن ان کے ذریعہ مولانا نے فکر و نظر کی راہیں جس طرح کھولیں ۔ حق گوئی و حق پرستی کا عملی نمونہ جس طرح پیش کیا اس کی نظیر ملنی ناممکن ہے ۔ انھیں اخباروں کے ذریعہ انھوں نے زعمائے علی گڑھ کو ہندوستانی اسلامیت کے محدود دائرے سے نکال کر عالم اسلام کی طرف متوجہ کیا، تحریک تعلیم کے بت کے سجدہ کی جگہ اللہ کو سجدہ کرنا سکھایا ۔ ان کے زور بیان، سحرکارانہ فن کاری اور طنز کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۰۶ء کی مسلم لیگ کے دلدل میں پھنسے ہوئے اشخاص اپنی غفلت سے

واقف ہوگئے ، ان کا ذہنی جمود دور ہوگیا اور رفتہ رفتہ انھوں نے قومی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا ۔ نہ صرف یہ بلکہ آغا خانی مسلم لیگ کی زندہ لاش میں بھی جان آگئی اور ۱۹۱۶ء میں وہ قومی تحریک کی سربلندیوں کی طرف دوڑنے لگی ۔ مختصر یہ کہ الہلال اور البلاغ کی شاندار فتوحات تاریخ صحافت کا وہ زریں باب ہیں جنھیں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور شاعری

از عبدالغفار شکیل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا ابوالکلام شاعر بھی تھے!

گذر چکی ہے یہ فصلِ بہار اُن پر بھی

آپ کو حیرت ضرور ہوگی مگر یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے گلستانِ شعر و سخن میں بھی کچھ گل کھلائے تھے جو وقت کی رعایت سے موسمی ہوکر رہ گئے۔

مولانا کی عمر صرف بارہ یا تیرہ برس کی تھی جبکہ وہ فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گذر چکے تھے اور شرح ملّا اور قطبی کے دور سے گزر رہے تھے آپ کے ہم جماعتوں میں آپ کے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین بھی تھے جو عمر میں آپ سے صرف دو برس بڑے تھے اور آہ تخلص کرتے تھے[1] مولانا کی خداداد ذہانت اور فارسی علم و ادب سے واقفیت نے اور اپنے بڑے بھائی کی شاعری نے مولانا کی طبیعت میں شعر گوئی کے جذبے کو اُبھارا چنانچہ مولانا کی طبیعت کی افتاد نے مولانا کو ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنا تخلص آزاد رکھنے کی صلاح دی، اور مولانا آزاد بن گئے اس لفظ میں یقیناً مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اُن کی نفسیات، کیفیات اور جذبات کو لیے ہوئے پنہاں تھی جو بعد کو اپنی

[1] بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے اور جناب آہ مرحوم کے کلام سے بھی بہت کم لوگ آشنا ہیں اس لئے تبرکاً ایک قطعہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

عدو کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھنچوائیں
نئے طریق سے اظہار سلم و راہ کریں
ہمارے پاس بھی بھیجیں اسے شرارت سے
کہ حال رشک سے رو رو کے ہم تباہ کریں
غضب ہے اس پہ زبانی پیام بھی آئے
ہمارے سر کی قسم ہے انھیں جو آہ کریں

پوری تابندگی و تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی جس کا ایک عالم قائل ہوا اور آیندہ ہوتا رہے گا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مولانا شاعر بھی تھے اِس کے ثبوت میں ذیل کے چند ایک اقتباسات بھی نامناسب نہ ہوں گے:۔

"مولانا ابوالکلام آزاد نے لسان الصدق کے اجرا سے پہلے شاعری کے بے پناہ شوق میں نیرنگ خیال جاری کیا جس میں اُس زمانے کے مشہور شاعروں کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی تھیں"

قومی زبان -- کراچی - بابت ۱۱ مارچ ۵۸ء

ایک اور اقتباس جناب چراغ حسن حسرت کے مضمون مطبوعہ ۱۹۴۳ء کا ہے:۔

"مولانا ابوالکلام کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے چنانچہ میں نے بعض لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں وہ ہمیشہ طرح پر غزل کہہ کر لاتے تھے اور خود پڑھ کر سناتے تھے لیکن ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اور جوانی بھی کہاں یہ اُن کے لڑکپن کا ذکر معلوم ہوتا ہے کیونکہ جوانی میں تو وہ بڑے بوڑھوں سے آگے تھے"۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد کی غیر معمولی صلاحیتیں" مطبوعہ شاہراہ دہلی بابت مارچ ۵۸ء میں لکھا ہے کہ

"مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے "ارمغان فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ نکلا تھا جس کی ماہانہ طرحوں پر کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلدستے میں شائع ہوتی تھیں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی نام پوری کلکتہ میں مقیم تھے اُنھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ اُنہی کی ہوتی ہیں ایک روز مولانا مسجد سے نکل رہے تھے نادر شاہ خاں نے روک لیا اور کہا ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے میں بیمار ہوں ورنہ غزل کے لئے

متقاضی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ اُنھوں نے زمین بتائی " یاد نہ ہو" مولانا نے ایک کتب فروش کی دوکان پر بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے نادر شاہ خاں صاحب بولے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ مولانا نے بے توقف کہا ہے

وعدہ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

نادر شاہ خاں نے کہا صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی "

اگر آپ ان اقتباسات کو: دروغ برگردن راوی بھی سمجھیں تو مولانا ابوالکلام آزاد ہی کی ایک تحریر پڑھنے کی زحمت بھی گوارا فرمالیجئے :۔

" ہمارے قافلے میں ایک صاحب بنگال کے ہیں، جن کی سائنٹیفک معلومات ہر وقت بہ ضرورت ہو یا نہ ہو اپنی جلوہ طرازیوں کا نیا نیا اسراف کرتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ دقیق نکتہ سنایا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی خون سے سینچا جائے، تو ان میں نباتاتی درجہ بلند ہو کر حیوانی درجہ میں قدم رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائے گا اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرنے لگیں گے لیکن آج کل جبکہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آگئی ہے اور اس کے بینک کھل رہے ہیں بھلا درختوں کے لئے کون اپنا خون دینے کے لئے تیار ہوگا ؟ ایک دوسرے صاحب نے کہا یہاں قلعہ کے فوجی میس (Mess) میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں ان کا خون جڑوں میں کیوں نہ ڈالا جائے ؟ اس پر مجھے ارتجالاً ایک شعر سوجھ گیا، حالانکہ شعر کہنے کی عادت مدتیں ہوئیں بھلا چکا ہوں ۔

کلیوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کی
سینچا تھا اس نے باغ کو مرغی کے خون سے

اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیجئے تو خیال بندی کی طرز کا اچھا خاصہ شعر ہو جائے گا

غنچوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کا
سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے

> شعر سن کر آصف علی صاحب کے شاعرانہ ولولے جاگ اُٹھے، اُنھوں نے اس زمین میں
> غزل بھی شروع کر دی لیکن پھر شکایت کرنے لگے کہ قافیہ تنگ ہے میں نے کہا دیسے
> بھی یہاں قافیہ تنگ ہو رہا ہے
>
> (غبار خاطر ص۲۴۹)

اب تو یہ طے ہے کہ مولانا ابوالکلام شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کو اُنھوں نے "شعر کہنے کی عادت بُھلا دی" جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے لیکن میرے خیال میں مولانا نے شعر کہنا بالکل نہیں چھوڑا موقع بموقع کوئی فی البدیہہ شعر ہی کہہ لیتے یا نہیں تو ایک آدھ مصرعہ ہی کہہ کر چپ ہو جایا کرتے۔

ہاں تو مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ کلام "عہدِ پارینہ" کہاں ہے؟ خود مولانا نے اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی چنانچہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اس پر پردے پڑتے گئے اور وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا یہی وجہ ہے کہ آج لوگوں کو مولانا کے شاعر ہونے کا یقین نہیں آتا۔

مولانا ابوالکلام کے کلام پر زمانے نے جو پردے ڈال رکھے ہیں اُن کو ہٹانے کی میں نے کوشش شروع کی اور کسی حد تک اُن پردوں کو ہٹانے میں کامیاب بھی ہوا۔ ان پردوں کو ہٹانے کے بعد جو چیز مولانا کی سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہے ایک فارسی مثنوی جو حضور ملک معظم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر بطور تہنیت کہی گئی۔[1]

---

[1] مجھے پہلے پہل اس مثنوی کو دیکھ کر ایک ذرا سا تامل ہوا کہ مولانا کی شخصیت، خیالات اور جذبات کو دیکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مولانا جیسا آزاد منش کسی ارضی شاہنشاہ کی شان میں مدح سرائی کرے لیکن مولانا کے مشہور و معروف پرچے الہلال کی ایک اشاعت میں مجھے اس کا جواز مل گیا اور ایک گونا اطمینان بھی

مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۲ کے الہلال جلد ۱ نمبر ۱۱ میں مولانا نے ملک معظم کی تصویر شائع کرتے ہوئے شذرات کے کالم میں لکھا ہے کہ:-

> "ہم نے ملک معظم کی تصویر کو لوحۂ اُمید کہا ہے۔ ہم کو ہندوستان کی گورنمنٹ اور اسی کے ماتحت حکام سے خواہ کتنی ہی شکایتیں ہوں مگر دنیا کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس پیغام بر اُمید کی محبت اور وفاداری سے کوئی دل خالی نہیں۔"

ملک معظم کے حسنِ اخلاق اور جذبۂ محبت نے مولانا کو گرویدہ کیا جس کے نتیجے میں مولانا نے اس مثنوی کی تخلیق کی

(شکیل)

مثنوی متضمن بہ تہنیت تاجپوشی حضور ملک معظم از اثر خامۂ جناب مولوی ابوالکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی مقیم کلکتہ مؤلف رسالہ الہیئت وعلوم الجدیدة والاسلام وغیرہ

تمہید عاشقانہ وطلب مے از ساقی

اے ساقی مست عشق مستم مے دہ مے دہ کہ مے پرستم
اے بادہ فروش ملک ہستی دے ہستی جان و جان ہستی
مستیم بذوق بادۂ تو اے منزل امن جادۂ تو
کایام بہار شادمانی ست ایں وقت نشاط کامرانیست
از کسب ضیاء نمود موجود ہر گل بچمن چراغ بے دود
شادیم کہ ابر ہم رسیدہ بردوش ہوائے خوش پریدہ
امروز چراغ گل بہ گلشن کردست نسیم صبح روشن
خنداں چو گل اند گل فروشاں سرشار رحیق بادہ نوشاں
وقتے ست کہ دور ساغرے مطرب بدر آید از دف و نے
چوں نغمہ شود بہ شور قلقل کاں سرمہ بود بصوت بلبل
زاہد بحدیث مستیٔ ما شاکی ز طریق ہستیٔ ما
اما ز کلام او میندیش کاں را ز فراق مے غم خویش
از محتسباں مترس گاہے بر ابر محیط کن نگاہے
قاضی چو زما شود نہ راضی در شیشہ کنیم ریش قاضی
اے ساقیٔ جام ارغوانی تا چند ز درد قصہ خوانی
مائیم نگار ما در آغوش آواز سرود عشق در گوش
ہم پیش نظر شراب رنگیں لیکن ز غمت دلست غمگیں
اے پیر مغاں تساہلی چیست با بادہ کشاں تغافلی چیست
ایں پستی ز ہمت زمستاں بالا خوانی زمے پرستاں

تجاہل عارفانہ و کیفیت وجدانی

ساقی در دست تو چیز است	ساقی ساقی بگو چہ چیز است
ایں چیست شراب ارغوانیست	با گویم آب ارغوانیست
ہاں ہاں بوئے کسے شنیدم	یعنی گلہائے حسن دمیدم
نے نے ایں نکہت یار است	نے نے ایں بوئے گلعذار است
ایں پیر مغاں نیک فرجام	کایں بادہ ز شیشہ ریخت در جام
ہاں ہاں یعنی اشارہ کرد	حیراں یعنی اشارہ کرد
مے دہ مے دہ دگر صدائے	یعنی عنقا صفت نوائے
چشمے دارم بگو نہ بینم	گل مے بینم چرا نہ چینم
مفتوں شدم و دگر چہ گویم	مجنوں شدم و دگر چہ گویم

تشبیہ عاشقانہ از شراب ناب

زچہ رحمے علیل ہستم	یعنی بے قال و قیل ہستم
ایں بادۂ ناب بحال آزاد	یعنی خانہ خراب و آباد
آں درد چو بود ایں دوا شد	آں ساز چو بود ایں دوا شد
بلقیس چو اوست ایں سلیماں	قبلہ است گر اوست ایں سلیماں
آں ناز بود نیاز ایں است	واں پردہ بود کہ راز ایں است

غایت طلب شراب

پُر کن مے بے خودی بساغر	تا ایں لب خشک خود کنم تر
جز بادہ دگر سرے ندارم	جز مے ہوسے بدل نہ آرم

تمہید دگر بہ گریز طرف مقصود

ہاں ساقی مہ جمال برخیز	در جام بلور بادہ را ریز
بیروں ز سرائے خود قدم نہ	ساغر ز مئے کہن بہم بہ
ہر سوز طرب صدا بلند است	ہر شخص بعیش پائے بند است

ہر سمت صدائے عشرت انگیز　مینائے جہاں ز بادہ لبریز
ہر ذرہ ز جوشش صفائی　میکردہ آئینہ نمائی
آئینہ یک و تمام دیدہ　یک جلوہ جا بجا رسیدہ
ہر غنچہ چو جام بادۂ ناب　در شوق کشادہ دہن پر از آب
ہر دل بہ طرب سرور دارد　ہر سر بہ سرش غرور دارد
بلبل بہ چمن ز نغمہ خوانی　مست است بناز خوش بیانی
پُر کن بہ مے بہار مخمور　خون ست بہ خوشہ ہائے انگور

جشن تاجپوشی

ایوان فلک چہ نو نگار است　در بزم فلک چہ ایں بہار است
زد نعرۂ مست بادہ نوشاں　شوریست بکوئے مے فروشاں
عیش است بپا و سر نہادہ　آغوش طلب بہ شوق کشادہ
ہر شاہد حسن جلوہ آرا　ہر شوق طرب بدست آرا
درگوش دلم عجب صدائے　مستم چو ز بس زہے نوائے
جشنیست کہ جشن شادمانی　خوش راحت و عیش زندگانی
شد تخت نشیں بہ تخت انگلینڈ　خوش بخت شد است بخت انگلینڈ
یعنی اڈورڈ شاہ جمجاہ　شد تخت نشیں بعزت و جاہ
شاہیست چہ شاہ مہربانی　در کشور علم حکمرانی
اقبال ز پائے او مقیم است　از رشک دل شہاں دو نیم است
محسود کہ شغل او شب و روز　فریاد و فغاں و آہ پُرسوز
دولت چو غلام خانہ زادش　صولت ز صدائے او بپایش
آہوئے کرم بہ او رمیدہ　شہباز ہمم باو پریدہ
اطراف زمیں تہ نگینش　شوکت بہ جہاں شدہ مکینش
صد گنج مراد زیر پایش　صد راہ نشاط سوے جایش

افراختہ رایت سیاست — ممتاز بہ حشمت و فراست

اے غازۂ حسن خاک راہش — خورشید ستارۂ کلاہش

فرخندہ بچشم دل نگاہش — ار از جہاں سزد پناہش

گریز بدعا

سرخوش ز شراب مئی بودم — غوطہ زن آب مدح بودم

کامد ناگہ سروش دلبر — بخش دار مقام خویش بنگر

تو لائق مدح نیست آزاد — بس کن بس کن دعائے دلشاد

وستم بدعا کنوں بر آرام — کائے رب قدیر کردگارم

باشد بہ ارب قیام شاہی — با صولت و رعب عزوجاہی

قطعۂ تاریخ

ہوئی لندن میں از فضل الٰہی — نہایت شان سے جب تاجپوشی

کہا آزاد نے بڑھ کر ادب سے — مبارک شاہ کو اب تاجپوشی

”حضرت آزاد دہلوی“ — ۱۳۲۰ھ

منقول از ”اہلِ پنج“ بابت ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء

اس کے بعد مولانا آزاد کی شاعری کے سلسلے میں جو یادگار ہمارے سامنے آتی ہے وہ پندرہ رباعیاں ہیں جن کو مدیر رسالہ مہرِ نیمروز کراچی نے اپنے رسالہ جلد ۲ شمارہ ۵، ۶ ــ بابت مئی تا اگست ۱۹۵۸ء میں مندرجہ ذیل عبارت کے ساتھ نقل کی ہیں:-

” میرے پاس دو ورق ایک پرانی کاپی کے پڑے تھے یہ کاپی تقریر سیرت پر مشتمل تھی اور ان اوراق میں تقریر سیرت کی تمہیدی سطریں درج ہیں ٹائیٹل پر ۲۹ محرم الحرام ۱۳۲۰ھ روز جمعہ مبارک درج ہے ٹائیٹل اُلٹیے تو مولانا آزاد کے قلم سے یہ رباعیاں لکھی ہیں اور سرنامہ پر یہ عبارت ہے:-

رباعی از خاکسار خادم الطلبا ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

مقیم کلکتہ

(۱)

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
صحبت دن رات ہے مداراتیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو
عاشق سے تو وہ منہ لگانے یہ باتیں ہیں

(۲)

نقاش چو نقش ساز انداز تو بود
دل دادۂ صورت گری ناز تو بود
یک شب ہمہ صرف زلف مشکیں تو کرد
یک روز تمام چہرہ پرداز تو کرد

(۳)

ساقی! ساقی! بادہ بدہ جام بجام
عمر تو دراز باد و وقت تو بکام
ایں تشنہ لبی من و ایں شور عطش
بر کن بر کن کہ کار من تمام است تمام

(۴)

گر عیش طلب کنی ز مستاں آموز
ور غم خود ہی ز تنگ دستاں آموز
مردن خوش حق تست لیکن زاہد!
خوش زیستن از بادہ پرستاں آموز

(۵)

ساقی تو نگاہ کن بریں ابر و بہار
یک ساغر مے دیدہ و بیں لطف خمار
وقتیست کہ ماہ روئے با ناز و ادا
یک زیر نظر باشد و یک زیر کنار

(۶)

آفت ہے قصۂ جوانی میرا

ظاہر ہے حال نوحہ خوانی میرا

اک جان بچاؤں کس طرح میں آزاد

دل کا دشمن ہے یاد جانی میرا

اس آخری رباعی میں مولانا آزاد نے ایک ہلکا سا اشارہ " قصۂ جوانی " کی طرف کیا ہے اس ہلکے سے اشارے میں مولانا کی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر دھندلی سی روشنی پڑتی ہے جس کے بارے میں خود مولانا نے اپنی تحریروں میں کہیں بھی کھل کے نہیں کہا اور اگر کہیں کچھ کہا بھی ہے تو بہت ہی لطیف پیرائے اور شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ کہا ہے مولانا کی زندگی کا وہ پہلو کیا تھا ؟

اُن کا عشق مجازی —— یعنی مولانا جب جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہو کر واپس آئے تو اُن کا شباب پہلی اور آخری مرتبہ عشق مجازی کے ایک طوفان سے آشنا ہوا جس کا ذکر مولانا نے اپنے " تذکرہ " کے آخری باب اور غبار خاطر کے صفحات پر بہت ہی مبہم اور ہلکے اشاروں میں کیا ہے یہ " واردات " کب اور کیسے ہوئی اُسے مولانا نے خود یوں تحریر فرمایا ہے کہ : -

" غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے جنون شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس کے تقاضوں نے جو راہ دکھائی دل کی خود فروشیوں نے اُسی کو منزل مقصود سمجھا ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اُس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا

ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہا است

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آباد اُلفت و پرستش نظر آیا جس میں مندروں اور مورتیوں کے کے سوا کچھ نہ تھا ہر مندر جبین نیاز کا طالب ہر مورتی دلفروشی و جان سپاری کے لئے وبال ہوش ہر جلوہ برق تمکین و اختیار ، ہر نگاہ بلائے صبر و قرار

الفراق اے صبر و تمکیں الوداع لے عقل و دیں

جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا جس گوشے میں پناہ لی وہی

زندانِ ہوش و آگہی نکلا . . . . . بجلیاں کوندتی رہیں بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ
نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی
. . . . بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے

ہاں! بانگِ بلند است ایں پوشیدہ می گویم

گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد ۔ فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی
نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو . . . .
غرض کہ اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا لیکن اُدھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ
دوسرا ہی ہو چکا تھا . . . . . . ناگہاں جذب توفیق الٰہی پردہ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا اور
ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔

یہ دور جذباتی اور طوفانی تھا اور وقت کے اعتبار سے بہت مختصر تھا طوفان کی طرح آیا اور تھم گیا لیکن اس شورشِ مجاز نے مولانا کی زندگی کو لازوال حقیقتوں کی راہ پر گامزن کیا اُن پر حقائق کے دروازے وا کئے اور زندگی مولانا کے آگے ایک حقیقت بن کر اپنی تابناکی کا جلوہ دکھانے لگی مولانا نے کہیں بھی اپنی تحریروں میں اس واقعہ کی تصویرکشی نہیں کی اور تفصیلات نے امکان کی حد تک پیچھے جا کر نتائج کے لئے آگے کی راہ چھوڑ دی۔

مولانا کی زندگی کی نفسیات کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے یہ چیز اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے آثار ابوالکلام میں لکھا ہے کہ :۔

"کسی بھی بڑے آدمی کی صحیح نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کی زندگی کے اس رخ
سے آشنا ہونا ضروری ہے اس قسم کے جذباتی ہیجان میں اخلاق و کردار کی خصوصیات
بے اختیار و بے محابا ظاہر ہو جایا کرتی ہیں اور ٹھیک اسی حالت میں ہم کسی شخصیت کا اندر سے
مطالعہ کر سکتے ہیں ہماری تھکی ہوئی سماج نے عورت کے وجود کو مرد کی زندگی کا ایک ایسا
راز بنا دیا ہے کہ نفسیاتی اور جذباتی نقطۂ نظر سے ہم جب کسی مرد کی زندگی اور کردار کا مطالعہ
کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تصویر کا صرف ایک ہی رخ نظر آتا ہے سوانح حیات اور زندگی کے
حقیقی وجدان و جذبات کی یہ آدھی آدھی تصویریں سوانح نگاری کے صحیح ذوق کو تشنہ چھوڑ دیتی ہیں"

سماجی زندگی میں عورت کا مقام کیا ہے اس بارے میں مولانا آزاد نے الہلال کی ایک اشاعت میں بتایا ہے کہ:

"عورت مثل مرد کے ایک انسان ہے جو ماں باپ کے گھر میں مثل مرد کے پرورش
پاتی ہے .... پھر وہ ایک مستقل وجود ہے اور مثل مرد کے انسانیت کا نصف ثانی ہے
وہ مرد کے ساتھ رفاقت بدنی اور اقرار کرتی ہے اور اس کے دل کے معاوضہ میں اپنا دل
دیتی ہے پس اُس کے گھر میں آکر اُس کے وجود کی شریک تو ضرور ہو جاتی ہے پر اپنے وجود
سے محروم نہیں ہو جاتی"

اسی استدلال کو مولانا نے آخر میں قرآن کی اس آیت پر ختم کیا ہے جس کا ترجمہ ہے" اور جس طرح مردوں کا حق عورتوں
پر ہے اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔"

مولانا آزاد کی نظروں میں عورت کی قدر تھی اور اُس کا ایک بلند اور مساویانہ مقام بھی تھا اس حقیقت کا
انکشاف بھی مولانا کو اُس عارضی طوفان ہی سے ہوا جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے اس طوفان کی مولانا
کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے اِسی سے اُنھیں عرفانِ حقیقی حاصل ہوا۔ یہیں سے زندگی نے اپنا دھارا بدل کر
اپنے لئے ایک الگ اور منفرد راہ نکال لی اور یہیں سے ایک انقلاب شروع ہوا۔

اب مولانا آزاد کی ایک غزل بھی ملاحظہ فرمائیے جو مولانا کے دورِ اوّلیں کی یادگار ہے:

غزل

کیوں اسیر گیسوئے خمدار قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا
کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
اُس کے اُٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا
انتظار اُس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہو گیا
اُس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دستِ قاتل ہو گیا
قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولہ دشت کا لیلیٰ کا محمل ہو گیا

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمند زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا

(منقول از مخزن، بابت اپریل ۱۹۰۲ء)

چند اور شعر ملاحظہ فرمائیے :۔

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گردِ باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی[1]

بھاگتی پھرتی تھی دنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب کہ جب نفرت ہوئی خود بیقرار آنے کو ہے

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

مولانا کی اس رباعی کو پڑھ کر مجھے امید ہے آپ داد پر داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے :۔

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دل کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے نے روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی[2]

مولانا آزاد کی اس رباعی میں جہاں رنگ یاس ہے وہاں ہمیں ایک حقیقت کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے

---

[1] منقول از قومی زبان کراچی بابت ۱۶ مارچ ۶۵۰ء [2] منقول از چٹان لاہور بابت ۱۷ مارچ ۶۵۰ء

وہ یہ کہ زندگی نے اپنا روپ بدل دیا اب مولانا آزاد کے قلب و ذہن کی وہ پہلی سی کیفیت نہ رہی بلکہ اس میں ایک انقلاب آ گیا تھا جس کے لئے مولانا ایک عرصہ سے بیتابانہ منتظر تھے اس انقلاب نے مولانا کو جہان شاعری سے آہستہ آہستہ دور کر دیا لیکن

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کے مصداق مولانا نثر کی دنیا میں اپنے اسپ ہائے تخیلات کو دوڑاتے ہوئے بھی کبھی کبھی بلکہ اکثر اوقات کسی نکسی بہانے دنیائے شاعری کی سرحدوں میں آ کر نکل جاتے۔ الہلال کے اجرا کے بعد مولانا کی زندگی میں نئے موڑ پیدا ہونے لگے تھے لیکن اس کے باوجود مولانا کے اندر ذوق شعری دب دب کر رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی اُبھر جایا کرتا تھا ایک واقعہ اس سلسلے میں سنئے:۔

مولانا رانچی میں نظر بند تھے پانچ سال قید کے بعد جب اُن کی رہائی کے احکام صادر ہوئے تو مولانا نے جیل کے داروغہ سے کہا کہ

"جیل سے رہائی اور اتنی جلد! نہیں بھائی یہ بات ٹھیک نہیں مجھے ایک دن کی مہلت اور دو جیل کے بام و در سے میری نگاہیں آشنا ہو چکی ہیں ان سے آخری بار رخصت تو ہولوں جیل کی فصیلوں جیل کی سلاخوں اور جیل کے ساتھیوں کو بھی الوداع کہنا ہے؟"

اس موقع پر مولانا نے یہ شعر کہا :۔

قصد کرتا ہوں جو اس جا سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو جا میں نہیں جانے کا

شعر کہنے کی عادت مولانا کی مذہبی اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے کم ہو گئی لیکن موقعوں پر عادت کے اس جمود میں ایک جنبش بھی پیدا ہو جایا کرتی تھی کچھ نہیں تو ایک مصرعہ ہی سہی

ایک تقریب میں کئی لوگ جمع تھے مولانا نے آواز دی گلاس میں پانی لانا اس آواز پر بجائے ملازم کے ایک سفید ریش بزرگ نے لبیک کہی اور پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر مولانا کے سامنے آئے مولانا نے ارتجالاً یہ مصرعہ کہا

لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا

اس تقریب میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی شریک تھے اُنھوں نے یہ مصرعہ سنتے ہی گرہ لگائی

ے کشو سشرم کہ اس پر بھی نہ پنپا آیا

مولانا آزاد کو موسیقی سے بھی حد درجہ دلچسپی تھی اُن کی نظر میں موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو جلوے تھے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقے پر ظہور پزیر ہوتے ہیں موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزاء کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دیتا ہے اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معنی کے اجزاء کو حسن ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے

توحنا بستی و من معنی رنگیں بستم

جو حقائق شعر میں الفاظ و معنی کا جامہ پہن لیتے ہیں وہی موسیقی میں الحان و ایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں نغمہ بھی ایک شعر ہے لیکن اسے حروف و لفظ کا بھیس نہیں ملا اس نے اپنی روح معنی کے لئے نواؤں کا بھیس اختیار کر لیا۔

یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان درد و الم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں بعض کے سننے سے مسرت و انبساط کے جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مولانا آزاد کا ذوقِ شعری حد درجہ بلند اور اعلیٰ و ارفع تھا اُن کی شعر گوئی سے قطع نظر شعر فہمی میں یہ بات بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات، مولانا کے مذہبی خیالات، اور قوم کے جمود و تعطل نے اگر مولانا کے ورطۂ احساس میں ہلچل نہ مچائی ہوتی اور مولانا کی تحریر و تقریر کا دھارا میدانِ نثر کا رخ نہ کرتا تو مولانا ایک بلند پایہ شاعر ہوتے اور دنیائے اردو مولانا آزاد جیسا شاعر پاکر اتنا ہی فخر کرتی جتنا آج غالب اور اقبال پر کر رہی ہے

ایک اعتبار سے یہ اچھا ہی ہوا کہ مولانا نے بہت جلد وادیٔ شعر کی حسین و جمیل فضاؤں سے اپنے آپ کو کسی حد تک الگ کر لیا۔ اگر مولانا دنیائے شعر میں محو ہو جاتے تو ہم آج مولانا کی اُس منفرد نثر سے محروم ہو جاتے جو مولانا کی خاص "ایجاد بندہ" ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبلتے نظر آتے ہیں جس میں علم و فضل کا دریا جاری ہے جو ایک نامعلوم معیار و مدت تک قاری کے دل کی بنجر زمین کو سیراب کرتا رہتا ہے مولانا کی تحریروں کے صوتی و معنوی آہنگ لب و لہجہ میں قند مکرر کی سی حلاوت اور رعنائی خیال نے ہر اہلِ نظر سے بے انتہا داد پائی ہے شاعروں تک نے آوازِ تحسین بلند کی ہے۔ جن میں جدید اردو غزل کے بانی اور استاد شاعر مولانا حسرت موہانی کی آواز آج تک بھی گونج رہی ہے

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

مولانا کی شعر فہمی کی بھی جتنی داد دی جائے کم ہے مولانا کبھی ایسا کوئی شعر نہ پسند کرتے تھے جس میں تفکر و وجدان اور جذبات و جمالیات کا ایک خوشگوار امتزاج نہ ہو غبارِ خاطر میں مولانا نے اشعار کے انتخاب و استعمال میں جس سلیقے اور جمالیاتی ذوق کا ثبوت دیا ہے اُس کی مثال اُردو میں خال خال ہی نظر آتی ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ نثر کی تحریروں میں شعر کھپانے کا آرٹ مولانا آزاد کا اپنا آرٹ تھا جس کی تقلید جب کسی نے بھی کی وہ مولانا کی ٹکر کو نہ پہنچ سکا۔ نیاز فتح پوری نے "مکتوباتِ نیاز" میں غبارِ خاطر کی اس جھلک کو اپنانے کی کوشش کی ہے مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو مولانا آزاد کے ہاں ہمیں ملتی ہے۔ شعر کھپانے کا آرٹ کسی قدر اچھے انداز میں ہمیں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے ہاں ملتا ہے باقی ادیب تو یونہی شعر کا استعمال کر دیتے ہیں اور بس۔

مولانا آزاد کے اس آرٹ کی ایک جھلک جس کی طرف خود مولانا نے اشارہ بھی کیا ہے الہلال مورخہ یکم اپریل ۱۹۱۴ء کے شذرات کے کالم "دہلی ڈیپوٹیشن" سے ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں کہ:

"بالآخر وہ ڈیپوٹیشن جس کا تذکرہ بعض اخبارات میں شروع ہو گیا تھا ۲۵ مارچ کی سہ پہر کو ہز ایکسلنسی لارڈ ہارڈنگ کے سامنے پیش ہوا

بتوں کی دید کو جاتا ہو دیر میں قائم
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ایک مفصل ایڈریس کے ذریعے مسلمانوں کی امن پسندی اور وفاداری کے میثاق قدیم کی زبانِ معترف اور سرِ اطاعت کے ساتھ تجدید کی گئی ع

یقین عشق کن و از سر گماں برخیز!

ایڈریس میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا

جز سجدہ متاعے دگر از کس نہ پذیرفت
خاکے کہ ز نقشِ قدم او اثرے داشت

ایک واقعی بات دہرا دینے میں چنداں ہرج نہیں اور اربابِ محبت جانتے ہیں کہ کسی کے لب جاں بخش سے اگر

ایک بار بھی جواب مہر ملنے کی اُمید ہو تو سودائیان عشق کو ہزار مرتبہ پکارنے سے بھی انکار نہیں ہوتا۔

گر وہ سنتے نہیں پر ہم تو کسی حیلے سے
ایک دو بات محبت کی سنا آتے ہیں

سوال عجز کے جواب میں جتنی مرتبہ نگاہ مہر کا نظارہ حاصل ہو جائے عشق کا اندوختہ اور امیدوں کا خزانہ ہے:

یاں عجز بے ریاست : واں ناز دلفریب
شکر بجا رہا گلۂ بے سبب نمک

تاہم موقع پر کوئی دل پسند شعر یاد آجائے تو ضیافت ذوق سے باز نہیں رہ سکتا مولانا فیض الحسن عربی کے ادیب تھے اردو کے شاعر نہ تھے تاہم کبھی کبھی اچھے شعر کہہ جاتے تھے ایک اُن کا پُرمعاملہ شعر مجھے کبھی نہیں بھولتا

پہلے ہی باہی کونسی تھی قدر و منزلت
پر شب کی مستوں نے ڈبو دی رہی سہی

ڈیپوٹیشن کی طویل فہرست ہم نے کسی دوسری جگہ انگریزی معاصر دہلی سے نقل کر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت وسیع مجمع تھا اور تقریباً ہر صوبے اور ہر طبقے کے اشخاص تھے اگرچہ

سر رشتہ درکف اری گوئے طور بود

خاص امتیاز کی بات یہ ہے کہ اس عطر مجموعہ میں ہر طرح کی خوشبوئیں شامل تھیں پیران کہن سال بھی تھے اور جوانان عہد بھی خرقۂ زہد بھی تھا اور قبائے رندی بھی سرہائے سجود پیشہ بھی تھے اور رنگ ہائے عشوہ طراز بھی پہلے کے لئے عذر کی ضرورت نہیں دوسرے سے اگر سوال و جواب کی ضرورت ہو تو مفتی آزردہ مرحوم کی زبانی جواب پہلے سے سن لیجئے :-

میں اور بزم بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تیری بزم شراب میں

اس اقتباس میں مولانا نے جگہ جگہ جو طنز کے نشتر لگائے ہیں وہ بھی اپنی جگہ قابلِ داد ہیں معلوم نہیں اُس ڈیپوٹیشن پر اس تحریر کا کیا اثر ہوا۔

مولانا آزاد نے اپنی متعدد تحریروں میں جو مختلف شعراء کے اشعار اپنی نثر کے ساتھ نگینوں کی طرح استعمال کئے ہیں اُن کو اگر الگ سے جمع کر کے مرتب کیا جائے تو "منتخبات آزاد" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب

بن سکتی ہے۔ مولانا کی سخن شناس نگاہوں نے خاص طور پر اپنی تحریروں میں نظیری، عرفی، بیدل، غنی کشمیری، فیضی، امیر، غالب اور مومن کے اشعار کو جگہ دی ہے ان کے علاوہ چند ایسے شعراء کے کلام کو بھی مولانا نے اپنے اس "آرٹ" کی خاطر پسند فرمایا ہے جو یا تو گمنام ہیں یا ان پر کسی کی نظر آج تک نہ جم سکی تھی اس طرح سے گویا مولانا نے غیر معروف شعراء کو بھی اپنے اعجاز سے شہرت دلوا کر اُن کو اُن کی شاعری کا حق دلوایا ہے۔

مولانا کی شعر فہمی اور شاعری سے دلچسپی کے بارے میں ایک اور انکشاف بھی سنئے۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے ایک جگہ لکھا ہے جس زمانے میں مولانا وکیل کے ایڈیٹر تھے طباطبائی مرحوم کی شرح دیوانِ غالب میں انھوں نے سادہ اوراق لگوائے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے ایک ندیم نے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اُٹھا لیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ تھا تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذرِ آتش ہو گیا۔

مولانا آزاد کی شخصیت میں قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کر دی تھیں وہ مقرر بھی تھے مفکر بھی مفسر بھی مدبر بھی سیاست دان بھی صحافت کے مردِ میدان بھی معلم بھی ادیب بھی ایک سخن ور بھی اور ایک سخن فہم بھی لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ہر میدان میں مولانا نے اپنے ذوقِ شعری سے جہاں اپنی طبیعت اور اپنے ذوق کی تسکین کو ہم پہنچایا وہاں شاعری اور شاعروں کی صحیح قدر کرنا بھی لوگوں کو سکھایا۔ مولانا کی نثر کو ہم اگر "شعرِ منثور" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

مولانا کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا جو لڑکپن کے زمانے سے لے کر آخر تک کسی نہ کسی طرح اُن کے ساتھ رہا اگر مولانا اپنے افکار کو ابتدا ہی سے شعر میں منتقل کرتے آتے تو کچھ عجب نہیں کہ دنیا ایک دوسرے اقبالؒ کے نام سے اُن کو یاد کرنے لگتی مگر قدرت کے پیش نظر صرف ایک اقبال اور ایک آزاد کی تخلیق تھی اور یہی ہوا۔ اقبال اور آزاد ایک ہی عہد کی دو شخصیتیں تھیں دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے بھی ہم آہنگ تھے دونوں کی راہیں الگ تھیں لیکن منزل ایک تھی اقبال نے شاعری کو بھرپور طریقے سے اپنایا اور آزاد نے نثر کو لیکن ایسی نثر جو نثر بھی تھی اور شاعری بھی۔

رہی بات مولانا کی شعر فہمی کی اس سلسلے میں کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں ہے پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ مولانا کے اندر شعر فہمی کا وہ ملکہ تھا جو اکثر شعراء کو بھی کم نصیب ہوا یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا نہ میں منکر ہوں اور نہ آپ شاکی!

مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و دماغی کاوشوں پر طائرانہ نظر

(از محمد عبدالشاہد خاں شروانی علی گڑھ)

(یہ مضمون ۲۴ر فروری ۱۹۵۹ء کو یونین ہال مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا جو مولانا آزاد کی یاد میں پہلی برسی کے موقع پر عربک سوسائٹی، ریسرچ اسکالرس ایسوسی ایشن اور یونیورسٹی لائبریری کے زیر اہتمام پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے)

انسان کی علمی بقاء کے دو ہی ذرائع ہیں (۱) حلقۂ تلامذہ (۲) تصانیف

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے بالکل اسی طرح انسانی عظمت و قدر کا اندازہ ان دو چیزوں سے ہوتا ہے امام ابوحنیفہ کی قابلیت کا سکہ اپنے معاصرین پر اسی لئے بیٹھا کہ ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے والے امام ابویوسف یعقوب، امام محمد اور امام زُفر جیسے اکابر و فقہا تھے، انھی تلامذہ کی بدولت فقہِ حنفی نے وہ بلند مقام حاصل کیا کہ فلاسفہ مستشرقین اور مقننین مستغربین اس کی علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں پر انگشت حیرت بدنداں ہیں اور خود ہمارے ملک میں مغلیہ دورِ سلطنت میں اس کی باقاعدہ تدوین ہوئی اور فقہِ حنفی کا مدتوں قانونی طور پر نفاذ رہا۔

ارسطو کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی ہزار سال گزر گئے مگر اس کی تصانیف کی بدولت یونان، بغداد اور بعد میں ہندوستان یونانی فلسفۂ و منطق کا گہوارہ بنا اور اُس نے دنیائے علم سے معلّم اول کا معزز لقب حاصل کیا، اُس کی تصانیف کی ترصیع و تذہیب سے ابونصر فارابی معلّم ثانی کہلایا اور فارابی کی مرصعات و مذہبات کی وجہ سے ابوعلی ابن سینا شیخ الرئیس بنا۔

علماء اسلام میں امام فخرالدین رازی، امام ابوحامد محمد غزالی، امام ابن تیمیہ اور محمد بن زکریا رازی وغیرہم

اپنی لاجواب تصانیف ہی کی بدولت آج تک سلطان العلوم بنے ہوئے ہیں۔ اس دور کی ترقی یافتہ دنیا جب یہ دیکھتی ہے کہ ہزار سال قبل کتابوں کی نایابی، کتب خانوں اور لائبریریوں کی کمیابی، نقل و حمل کے صعوبات اور اسباب تالیف و تصنیف سے فقدان کے باوجود ان متبحر علماء نے مختلف فنون پر جو سیر حاصل طبع آزمائی کی ہے اور جتنا کچھ لکھا ہے جس کی نظیر آج کل کی تمام سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی مشکل سے مل سکے گی تو ان کی قابلیت، بے پناہ قوتِ مطالعہ اور عدیم النظیر وسعتِ نظر سے حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے تدریسی اور تصنیفی دونوں صلاحیتیں تفویض فرمائی تھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک طرف درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو دوسری جانب دارالارشاد قائم کرکے طلبہ کو ملک وملت کے لئے زمانۂ حاضرہ کے مطابق مفید و کارآمد بنانا چاہا۔ مگر مشیت ایزدی کو یہ سلسلۂ تلامذہ قائم رکھنا منظور نہ تھا اس لئے ۱۹۱۶ء میں رانچی کی نظربندی اور اس کے بعد ۱۹۲۱ء سے سیاسی مدوجزر اور فرنگی قید وبند نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ ان حالات نے جہاں تدریس و ارشاد کا انقطاع کیا وہیں تصنیف و تالیف کا یکسوئی سے موقع بھی دیا۔ تذکرہ اور ترجمان القرآن دونوں کا عرصۂ وجود میں آنا نظربندی رانچی کا رہینِ منت ہے۔

یوں تو مضامین و مقالات نگاری کا سلسلہ عنفوانِ شباب اور طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع ہوگیا تھا اور مردِ میدانِ علم بننے سے پہلے ہی شہسوارِ مرکبِ قلم بن چکے تھے مگر اشہبِ خامہ کی جولانی کا موقع الہلال کے صفحاتِ قرطاس ہی پر مل سکا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں شاعری اور مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ مضمون نگاری کی ابتدا کتب درسیہ و متداولہ شرح وقایہ، مختصر المعانی، مطوّل، میبذی، شمس بازغہ، میر زاہد، ہدایہ، بیضاوی، تفسیر خازن، سدیدی، رشیدیہ کے مطالعہ، شروح و حواشی کے بعد اسباق کی کتابت سے ہوئی۔ والد ماجد مولانا خیرالدین اور اساتذہ کی جرأت افزائی نے مزید کد و کاوش کا موقع دیا۔ دوسری منزل دینی رسائل کے ترجموں سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے علامہ جلال الدین السیوطی کے رسائل نورالملعۃ فی فضائل الجمعۃ اور انیس اللبیب فی خصائص الحبیب اور امام غزالی کے رسائل منہاج العابدین اور مضمون کا ترجمہ کیا۔ منہاج العابدین اور انیس اللبیب کے ترجمے اسی زمانے میں شائع بھی ہوئے۔ انیس اللبیب کا ترجمہ "خصائصِ محمدیہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ، جامی کی نفحات الانس اور عبدالرحیم تبریزی کی ہیئت جدیدہ مترجمہ فارسی کے تراجم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ اسی طرح شرف جہاں قزوینی کے

دیوان پر جس نے وقوعہ گوئی اور معاملہ بندی کی بنیاد فارسی شاعری میں ڈالی تبصرہ لکھا جس کا مسودہ ضائع ہوگیا اور شائع نہ ہوسکا۔

تیسری منزل یعنی مضمون نگاری کی ابتدا "عوائد و رسوم" پر خامہ فرسائی سے ہوئی جو امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم سے تعصب کی مضرتیں اخذ کرکے لکھا گیا تھا، اس کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سلسلے میں مخالفین کے اعتراضات کے جوابات لکھے جو اسی ہنگامی دور میں بصورت رسائل مختصرہ شائع ہوتے رہے۔ اب اس شوق نے یہاں تک اثر دکھایا کہ رشحات قلم کی جلوہ طرازی کے لئے مستقل نمود کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کلکتہ سے ہفتہ وار المصباح محمد موسیٰ مالک اخبار نے نکالا اس کے مرتب بن گئے، عید کے موقع پر یہ اخبار نکلا اس لئے اداریہ عید پر لکھا جسے پیسہ اخبار لاہور نے بھی نقل کیا اس کے بعد امام غزالی، فیوشن اور مسئلہ کشش ثقل وغیرہ پر مضامین کا سلسلہ جاری کیا جو اہل علم میں پسند کیا گیا۔ ۳-۴ ماہ کے بعد المصباح بند ہوگیا، پھر رسالہ تحفۂ محمدیہ کلکتہ کے مرتب ہوکر مختلف مضامین لکھے۔ مخزن لاہور میں خاقانی شروانی پر مضمون شائع ہوا۔ ہفتہ وار احسن الاخبار سے تعلق پیدا کرکے خواجہ شیرازی، عمر خیام اور دوسرے شعرائے ایران پر مضامین لکھے بعض مضامین پر بحث و رد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ انھیں میں وہ مضمون بھی تھا جس پر "اسلام اور محرم" کے زیر عنوان محرم کی بدعات پر سختی سے قلم اٹھا دیا گیا تھا۔ اس پر سازش اقدام قتل اور مقدمہ تک کی نوبت آگئی تھی۔ ان حالات میں احسن الاخبار کچھ دن کے بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد خود اپنی ادارت میں "پندرہ روزہ" لسان الصدق نکالا۔ بعد میں یہ ماہانہ ہوگیا، کچھ نمبر بمبئی اور آگرہ سے بھی شائع کئے گئے ۱۹۰۴ء میں بند ہو۔

غزلیات کی اشاعت کے لئے ایک گلدستہ نیرنگ عالم کے نام سے خود نکالا جو ۸ ماہ تک جاری رہا۔ ارمغان فرخ بمبئی، خدنگ نظر لکھنؤ، مرقع عالم ہردوئی، مخزن لاہور وغیرہ میں بھی غزلیں شائع ہوتی رہیں، خدنگ نظر لکھنؤ کے سلسلۂ مضامین کی ادارت بھی اختیار کی۔

جب ان اخبارات و رسائل کی باضابطہ و بے ضابطہ ادارت سے قلم میں پختگی اور افکار میں بلندی آگئی اور اہل علم و ادب نے مولانا کی نوعمری میں پختہ کاری دیکھ لی تو مختلف جرائد کی طرف سے رشحات قلم کی فرمائشیں اور ادارت و اہتمام کی پیشکشیں شروع ہوگئیں علامہ شبلی نعمانی کے اصرار پر جن کے کمالات علمی کی بناء پر مولانا کو اُن سے بڑی عقیدت تھی، الندوہ کی سب ایڈیٹری منظور کرکے لکھنؤ میں ۷، ۸ ماہ اقامت گزیں رہے۔ الندوہ اس وقت بڑا معیاری رسالہ تھا اس میں لکھنے والے اکابر ملت میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا نے نہ صرف اس کا

معیار قائم رکھا بلکہ اس میں چار چاند لگائے۔ اس کے بعد وکیل امرتسر میں جو ہفتے میں تین بار شان و وقار کے ساتھ نکلتا تھا سال بھر تک فرائض ادارت انجام دئے، طبیعت کی جولانی نے وہاں بھی زیادہ دن تک رکنے نہ دیا اور کلکتہ پہنچکر سنہ ۱۹۰۶ء میں مولوی عبداللطیف تاجر چرم کی ملکیت اور اپنی ادارت میں اخبار "دار السلطنت" ہفتہ وار نکالنا شروع کردیا، دار السلطنت کا پہلا نام اردو گائیڈ تھا اس سے قبل وہ "دوربین" کے نام سے شائع ہوتا تھا، "غدر" سے قبل یہ دوربین فارسی میں نکلتا تھا پھر دوربین کو دار السلطنت کے نام سے شائع کیا گیا تھا جو بند ہوگیا تھا اب دوبارہ مولانا کی ادارت میں نکلا۔ چند ماہ کے بعد مولانا نے اس سے بھی کنارہ کشی اختیار کی بعد میں وہ بھی بند ہوگیا، کچھ عرصہ کے بعد پھر وکیل امرتسر میں کام شروع کردیا۔ وکیل اب ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا، ۹، ۱۰ ماہ کے بعد یہاں سے بھی علیحدگی اختیار کی اور یہ خیال مستحکم ہوگیا کہ جب تک اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے افکار و خیالات کا کھل کر مظاہرہ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس خیال نے ۱۲ر جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کو ہفتہ وار الہلال جاری کرایا اور اس کے فرنگی مظالم کا شکار ہوجانے پر البلاغ نکالا گیا جس کا سلسلہ سنہ ۱۹ء تک جاری رہا۔

یہ تھا مولانا کے رشحات قلم کا تدریجی ارتقاء، دینی رسائل کے ترجموں کا حال اوپر گذر چکا ہے قلم میں پختگی آنے کے بعد "رسول عربی" کا ترجمہ کیا جو دوسرے پریسوں کے علاوہ اشرف پریس لاہور نے بھی ۵۲ صفحات پر چھاپا اسی طرح "المرأۃ المسلمۃ" کا ترجمہ کیا جو "مسلمان عورت" کے نام سے بار بار شائع ہوتا رہا ہے۔

نئے مباحث میں ایک بڑی بحث عورتوں کی آزادی کی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پچھلے دنوں یہ بحث چھڑ گئی تھی۔ مصر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے ایک ذی اثر ممبر مسٹر قاسم امین بک نے جو کسی زمانے میں پردہ کے بڑے حامی تھے اور یورپ کی موجودہ آزادی کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے فرنچ میں ایک رسالہ بھی پردۂ اسلامی کی تائید میں لکھا تھا پھر یکایک ان کی رائے میں انقلاب پیدا ہوا، اور آزادئ نسواں کی حمایت میں پردہ کو نفرت سے دیکھنے لگے چونکہ گذشتہ "غلطی" کا کفارہ ضروری تھا اس لئے پردہ کی مخالفت اور آزادی نسواں کی ضرورت پر یکے بعد دیگرے دو رسالے لکھ کر شائع کئے، پہلے رسالے کا نام "تحریر المرأۃ" اور دوسرے کا "المرأۃ الجدیدۃ" تھا۔

ان دونوں رسالوں نے اہل مصر کو نئے سرے سے اس مسئلہ پر متوجہ کردیا، مسٹر قاسم امین بک کے دو تین معمولی مضامین کے علاوہ پانچ رسالے پے در پے لکھے گئے جن میں ایک رسالہ بیروت کے کسی عالم کا تھا

اور چار رسالے مصر کے تعلیم یافتہ اشخاص کے قلموں سے نکلے تھے۔ انھیں رسالوں میں ایک رسالہ "المرأۃ المسلمۃ" بھی تھا جو مصر کے مشہور مصنف فرید وجدی کی تصنیف تھا مولانا نے اردو داں طبقے کو اس کے قابل قدر مباحث سے واقف کرنے کے لئے اس کا ترجمہ اردو میں کیا، اس رسالے سے ایک طرف آزادیٔ نسواں کے مسئلہ پر روشنی پڑی تو دوسری طرف اس امر کا اندازہ ہوا کہ مصر کا نیا علمی مذاق ہندوستان کے موجودہ مذاق سے کس درجہ مختلف ہے۔ یہ ڈھائی سو صفحات کا رسالہ ہے۔ مولانا نے اتنا سلیس اور پاکیزہ ترجمہ کیا ہے کہ زبان سے احسنت و مرحبا نکلتا ہے۔ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کہیں سے یہ کسی کتاب کا ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس موضوع پر مستقل اردو کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

مقالات و رسائل ترجمان القرآن کی ترتیب سے قبل الہلال، البلاغ، مخزن، الندوہ اور دوسرے علمی و ادبی رسائل میں مختلف عنوانات کے تحت مولانا کے مبسوط مقالات و مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ بعد میں مقالات الہلال، مضامین الہلال، مضامین البلاغ، انتخاب الہلال، تازہ مضامین ابوالکلام آزاد، صبح امید اور رسائل کی شکل میں علیحدہ بھی طبع ہوئے، اگر ان رسائل کو مستقل تصانیف میں لکھا جائے تو مصنفات کی خاصی بڑی تعداد ہو سکتی ہے۔

حقیقۃ الصلوٰۃ، حقیقۃ الزکوٰۃ، حقیقۃ الحج، دعوتِ حق، عیدین، مقامِ دعوت، خلافت، ذکریٰ، لمعاتِ صداقت، خونِ شہادت کے دو قطرے (حیاتِ سرمد و حیاتِ منصور) وغیرہا۔ اسی طرح ترجمان القرآن کی سورۂ فاتحہ کی مبسوط تفسیر بھی "اُمّ الکتاب" علیحدہ شائع ہو چکی ہے۔

خطبات و بیانات ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جمعیۃ علمائے ہند، خلافت کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس، اور دوسری مذہبی و سیاسی، صوبائی اور مرکزی جماعتوں میں خطبات صدارت پڑھے گئے ان کے مجامیع، خطبات ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد، اور "خطبات امام الہند" کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں، ۱۹۲۲ء کے مولانا کے معرکۃ الآرا عدالتی بیان "قولِ فیصل" کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

آزادیٔ ہند کے بعد سرکاری تقاریب میں بحیثیت وزیر تعلیم جو خطبات و بیانات ہند و بیرون ہند میں دئے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں جس کی پہلی قسط جو ۱۹۴۷ء لغایت ۱۹۵۵ء کی تقریروں پر مشتمل ہے حکومت ہند نے ۳۳۱ صفحات پر "اسپیچز آف مولانا آزاد" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع کر دی ہے۔

پیش لفظ اور تعارف تقریظ و تبصرہ نگاری میں مولانا بڑے کوتاہ قلم واقع ہوئے تھے، مختصر مگر جامع

مانع پیش لفظ اور تعارف کبھی کبھی خصوصی نیازمندوں کی ہمت افزائی کے لئے تحریر فرما دیتے تھے۔ جن تحاریر کا پتہ چل سکا ہے وہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ سرودِ زندگی مصنفہ اصغر گونڈوی مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور تقریظ ۵ ورق محررہ جون ۱۹۳۴ء

۲۔ باغیِ ہندوستان مولفہ محمد عبدالشاہد خاں شروانی (راقم السطور) مدینہ پریس بجنور تعارف ۲ صفحات ۰ اگست ۱۹۴۶ء

۳۔ شہیدِ اعظم " مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی " محبوب المطابع پریس دہلی پیش لفظ - " " ۵ اجولائی ۱۹۴۶ء

۴۔ یادگارِ حالی " صالحہ عابد حسین " یونین پرنٹنگ پریس دہلی پیش لفظ ایک صفحہ، حالی پر مضمون ۱۵ صفحات " ستمبر ۱۹۴۹ء

۵۔ نوائے حیات مصنفہ یحییٰ اعظمی " معارف پریس اعظم گڑھ تعارف " " سنہ ۱۹۵۰ء

۶۔ مرقعِ شعراء مرتبہ رام بابو سکسینہ " راما پرنٹنگ ورکس دہلی پیش لفظ ۲ صفحات ۱۹۵۶ء

۷۔ مثنویاتِ میر " " " " " " " " " "

۸۔ گلستانِ ہزار رنگ " سید بہاء الدین احمد بہاری " لیتھو پریس پٹنہ " ۴ " مئی ۱۹۵۵ء

۹۔ "۱۸۵۷ء" " سریندر ناتھ سین " سرسوتی پریس کلکتہ مقدمہ " " " ۱۷ مارچ ۱۹۵۷ء

مکاتیب

مولانا کے اب تک پانچ مجامیع مکاتیب منظرِ عام پر آ چکے ہیں، پانچوں اپنی اپنی نوعیت سے امتیازی مقام رکھتے ہیں ان میں اولیت و اولویت کا فخر "غبارِ خاطر" کو حاصل ہے۔

(۱) **غبارِ خاطر**۔ پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۴۶ء میں پانچ ہزار کی تعداد میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے ملک کے سامنے آیا، اہلِ ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا، دوسرا ایڈیشن چوتھے ماہ نظر نواز ہوا، تیسرا ایڈیشن چند ماہ کے اندر ہی آخر ۱۹۴۶ء میں مکتبۂ احرار نے آزاد ہند پبلیکیشنز لمیٹڈ ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے پانچ ہزار کی تعداد میں پہلے دونوں ایڈیشنوں سے ہر طرح ارفع و اعلیٰ ایک خط کے اضافہ کے ساتھ، ۳۴۳ صفحات پر شائع کیا۔ اب چوتھا ایڈیشن ۲۹۶ صفحات پر انارکلی کتاب گھر لاہور نے اشرف پریس لاہور سے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔ غبارِ خاطر کے متعلق اُسی وقت مقدمۂ کاروانِ خیال میں راقم السطور کے نوکِ قلم پر جو بے ساختہ جملے آ گئے تھے وہ درج ذیل ہیں:-

"یوں تو آزاد کی ہر تصنیف و مضمون میں ادبی شان پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے لیکن مجموعۂ خطوط غبارِ خاطر کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کو سیفِ زبان و بیان پر کس قدر قدرت حاصل ہے، الفاظ کی قطع و برید اور حرفوں کی

رائش و خرائش دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ۔

زکدام باغ اے گل کہ چنین خوش است بویت

. . . .

"قلعہ احمد نگر کی تاریخی حیثیت کا بیان ہو یا گرفتاری کی روداد، چینی چا نوشی کا پُر سرور تذکرہ ہو یا اس کے ختم ہو جانے کا فسانۂ غم، شریکِ حیات کا کوئی ماتم ہو یا دردِ فراق کا قصۂ الم، چڑیا چڑے کی کہانی ہو یا قلعہ کی شکستہ و کہنہ قبر کی داستان حسرت و ویرانی، گل ہائے چمن کا ذکرِ زینت آرائی ہو یا بلبلانِ گلشن کی کیفیت نغمہ سرائی، خدا کی وحدانیت پر دلائل قاطعہ پیش کئے جا رہے ہوں یا پھولوں کی خلقت پر براہین ساطعہ سب میں اعجاز نگاری کارفرما نظر آئے گی"۔

اس مجموعے میں دو تمہیدی خطوط کے علاوہ ۲۱ خطوط ہیں جو علمی، ادبی، تاریخی معلومات سے پر ہیں اور اگرچہ "احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان کر" ہی سہی پھر بھی سیاسی ملاوٹ بھی اکثر جگہ نظر آ جاتی ہے۔ "چڑیا چڑے کی کہانی" ظاہر مضحکات اور تفریحی ہے لیکن درحقیقت سیاسی کدوکاوش کی ایک داستان ہے جو مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں بچوں کی کہانی کی شکل میں پیش کی ہے "قلندر کی جرأت، اپنی کوتاہ دستی و بلندیٔ ہمت سب کچھ ہندوستانی جدوجہد آزادی کا کھنچا ہوا نقشہ اس میں نظر آئے گا "داستان بے ستون و کوہکن"، "حکایت بادۂ و تریاک"، "حکایت زاغ و بلبل" بھی گہری نظر سے پڑھنے کی چیزیں ہیں، آخری مکتوب جس میں موسیقی کا تذکرہ ہے وہ فنی خزانے کا بیش بہا موتی ہے

یہ وہ مکاتیب ہیں جو مولانا آزاد نے اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک احمد نگر کے تاریخی قلعہ میں بزمانۂ اسیری اپنے صدیق مکرم نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو مکتوب الیہ تک نہ پہنچ سکے اور رہائی کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں کے ۱۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ کے ساتھ غبارِ خاطر کی شکل میں منظرِ عام پر آئے۔ ابتدا میں چند وہ مکاتیب بھی شامل ہیں جو رہائی کے بعد اگست ۱۹۴۵ء تک لکھے گئے ہیں۔

(۲) کاروانِ خیال ۔ یہ مجموعۂ خطوط مولانا آزاد اور ان کے صدیق مکرم نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا شروانی کے ان مکاتیب پر مشتمل ہے جو دونوں گرامی قدر ہستیوں کے مابین ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء سے ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء تک

جاری رہے۔ اس ۱۵۱ صفحات کے مجموعے میں ۲۶ خطوط ہیں جن میں ۱۶ مولانا آزاد اور ۱۰ مولانا شروانی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں شروع میں، ۵ صفحات کا مقدمہ راقم السطور کے جذبات کا ترجمان ہے۔

مدینہ پریس بجنور نے اواخر ۱۹۵۸ء میں اس مجموعے کو منصۂ شہود پر لا کر دو مسلّم الثبوت اہلِ قلم کے عواطف و امیال، علمی انہماک، استغنا، اور کمالِ ذاتی کا جوہر نمایاں کیا ہے۔ باہمی اخلاص و مودت کے دریا دواں ہیں ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کے لئے دل کی طرح روح بھی بے چین ہے، خلوص کے کشت زار پر اہلِ کمال کے تذکروں کا چمن لگا ہوا نظر آرہا ہے۔

(۳) **مکاتیب ابوالکلام**۔ ۱۹۴۶ء میں ادبستان لاہور نے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل مجموعۂ مکاتیب شائع کیا ہے۔ اس میں اکابر و اعلامِ ہند مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محی الدین قصوری وغیرہم کے نام خطوط ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صغرسنی ہی میں علم و فضل کے اس مقام پر تھے جہاں مکتوب الیہم کہولت و شیخوخت میں پہنچ پائے تھے۔

(۴) **نقشِ آزاد**۔ یہ چوتھا مجموعۂ مکاتیب مولانا کے قدیم عقیدتمند جناب چودھری غلام رسول مہر نے کتاب منزل لاہور سے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل اپنے ۵ صفحات کے مقدمے اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ ابھی ۱۹۵۹ء میں شائع کیا ہے۔

اس میں تین حصے ہیں۔ حصہ اول ۲۵۶ صفحات اور ۱۸۰ خطوط اور تاروں کا مجموعہ ہے جو تمام تر مرتب کے نام مئی ۱۹۱۴ء سے مئی ۱۹۵۶ء تک لکھے گئے ہیں، ان میں ۱۴۲ مکاتیب خود مولانا کے قلم سے اور بقیہ مولانا کے سکریٹریوں پروفیسر محمد اجمل خاں اور مسٹر ناصر مسعود کے قلم سے ہیں۔

حصہ دوم ۲۵۹ صفحے سے ۳۳۸ صفحے تک ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں مولانا سے ۱۴ عنوانات کے تحت مختلف علمی، ادبی، فنی اور تاریخی نوادر جمع کر دئے ہیں، ان میں "غدر" کے حالات و متعلقات کا عنصر غالب ہے جس سے تحریکِ آزادیٔ ہند کے متعلق خاصہ مواد فراہم ہوگیا ہے۔

حصہ سوم ۳۴۳ صفحے سے ۳۵۸ صفحے تک ۱۵ صفحات پر ان مکاتیب پر مشتمل ہے جو شفاعت اللہ خاں، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور نیاز فتحپوری کے نام ہیں۔ خطوط کے علاوہ ایک دردمندانہ اپیل اخبار زمیندار سے متعلق اور ایک پیام عزیزانِ پنجاب کے نام ہے۔ ختمِ کتاب پر ایک مزید خط چودھری غلام رسول مہر مرتبِ مجموعہ کے نام ہے۔

مرتب کے نام زیادہ تر خطوط کاروباری قسم کے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنی تصانیف کی عمدہ طباعت وکتابت اور پروف کی صحت کا کس درجہ اہتمام رہتا تھا۔ پبلشروں سے حسن معاملت اور ادائگی اجرت میں فراخ حوصلگی، حق تصنیف میں سیر چشمی اور احباب ومخلصین کے جذبات کی کتنی پاسداری ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ اس مجموعے میں تین خطوط بڑے اہم ہیں، مکتوب ۵۲ مورخہ ۳ ردسمبر ۱۹۳۶ء ۸ صفحات پر ہے جس میں ذاتی حالات، عہد طفولیت، غیر معمولی ذہانت کا تذکرہ تحدیث نعمت کے طور پر آگیا ہے۔ اسی کی جھلک مکتوب ۴۲ سے ملتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

" افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

نا روا بود بہ بازار جہاں جنس وفا　　رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم وفنون، ادب و انشاء، شاعری کی کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بیشمار راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن وہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔

ما زلت انزل فی ودادک منزلا　　تتحیر الالباب عند نزولہا!

لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا اسی نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالہ کر دیا گیا۔

کم اردنا ذاک الزمان بمدح　　فشغلنا بذم ہذا الزمان "

مکتوب ۵۷ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، صوبہ سرحد میں اقلیت کی گورکھی زبان کے بقا کے مسئلہ میں عام مسلمانوں کے رجحانات کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے متنبہ کرتے ہیں :-

"ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک وقت یہ پیش آگئی تھی کہ کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی ایسی عظیم اکثریت ہو جیسی ملک کے اکثر صوبوں میں ہندوؤں کی ہے اور جہاں وہ اپنا عملی نمونہ قائم کر کے ہندو اکثریت کے صوبوں کے لئے مثال قائم کر سکیں۔ وہ اکثریت و اقلیت کے مسئلے میں جو کچھ بھی کر سکتے تھے بحث و منطق تھی، عملی اقدام کی کوئی قوت نہیں رکھتے تھے۔ اب حسن اتفاق سے دو صوبے اپنے عمل آئے جہاں وہ بہار اور یو، پی کی ہندو اکثریت کے درجے کی مسلم اکثریت رکھتے ہیں۔ سرحد اور سندھ۔۔ اور اس طرح انھیں موقع مل گیا کہ یہاں اپنے طرز عمل کی ایسی مثالیں قائم کر دیں جو تمام صوبوں کے مسلمانوں کے لئے عملی دلیل و حجت کا کام دے سکیں۔

اب جبکہ ملک تقسیم ہو گیا اور سرحد و سندھ ہندوستان سے جدا ہو گئے صرف کشمیر ہی ایسی ریاست رہ جاتی ہے جہاں مولانا کے سنہرے اصول کے مطابق مسلمانوں کو مثالی نمونہ بننے کا موقع حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی نظریئے سے ہندوستان کا ہوشمند مسلمان کشمیر کو ہندوستان کا حصہ رکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔

مکتوب ۶۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۴۳ء مسلمانان ہند کے لئے خصوصی طور پر لائق توجہ ہے تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ لکھتے ہیں" کانگریس سے آپ کی وابستگی کی کوئی شق سمجھ میں نہیں آتی لیکن میں سمجھتا ہوں کوئی نہ کوئی بات ہو گی جو میری سمجھ میں نہیں آتی"

عزیز من! اگر آپ کو عقائد و افکار کی اُس دنیا سے جس میں تیس سال سے زندگی بسر کر رہا ہوں اس درجہ بُعد ہو گیا ہے کہ آپ میرے کانگریس میں ہونے کی کوئی وجہ محسوس نہیں کر سکتے تو میرے لئے ناممکن ہے کہ کوئی وجہ آپ کو بتا سکوں۔

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما!

مجھے معلوم نہیں آپ میرے خطوط رکھتے ہیں یا ضائع ہو جاتے ہیں۔ بہر حال یہ خط کہیں سنبھال کر رکھ دیجئے میری زندگی کا بڑا حصہ گزر چکا، جو باقی ہے وہ بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ میں اس وقت نہ رہوں لیکن یہ سطور باقی رہ سکتی ہیں۔ ایک وقت عنقریب آئے گا اور وہ میری وابستگی کی علت آشکار کر دے گا"

(۵) میرا عقیدہ - پانچواں مجموعۂ خطوط ابھی فروری ۱۹۵۸ء میں یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے ۳۰ صفحات پر مشتمل شائع ہوا ہے جس کے مرتب قاضی احمد حسین ممبر پارلیمنٹ ہیں ۲ صفحات کا پیش لفظ مرتب کی طرف سے

اور ۴۰ صفحات کی توضیح چودھری غلام رسول مہر کے قلم سے ہے ۔ اس مجموعے میں کل ۶ خطوط ہیں۔ ایک ایک خط چودھری غلام رسول مہر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری اور ۴ حکیم سعد اللہ کے نام ہیں ایک خط کسی کے نام سے موسوم نہیں اس میں مولانا کے دو خطوط کا عکس بھی شائع کر دیا گیا ہے ۔

ترجمان القرآن جلد اوّل کی اشاعت کے بعد حساد و معاندین کے گروہ نے مولانا کے عقائد پر ناروا حملے کر کے بدنام کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے واضح البیان فی تفسیر القرآن میں سب سے بڑا اچھالا تھا، الزام یہ تھا کہ مولانا نجات اخروی کے لئے ایمان بالرسالۃ کو ضروری نہیں سمجھتے ۔

مولانا نے ان خطوط میں اسی غلط فہمی کو دور کیا ہے اور جس انداز میں کیا ہے اُس سے مولانا کی بلند نگاہی اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان میں سے بعض خطوط اُسی زمانے میں انقلاب وغیرہ میں شائع بھی ہو گئے تھے پھر بھی اعداء نے بہتان طرازی اور الزام تراشی میں آج تک کسر نہیں اٹھا رکھی ۔ مولانا کی وفات کے بعد سفر عراق، حیدر مادری مولانا نور الدین اور نجات اُخروی وغیرہ کے مباحث پھر اٹھ کھڑے ہوئے قاضی محمد حسین صاحب نے یہ مجموعۂ مکاتیب شائع کر کے ایک اہم غلط فہمی کے ازالہ کی کوشش کی ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء

ان مطبوعہ مجامیع مکاتیب کے علاوہ سیاسی خطوط کا مجموعہ بھی مولانا نے مرتب کیا تھا ایک بار جب اس کے متعلق راقم السطور نے دریافت کیا تو فرمایا کہ "ابھی حالات کا انتظار ہے، آخری خط کی ترتیب کے بعد اشاعت کی نوبت آسکے گی" افسوس کہ زندگی میں یہ مجموعہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا ۔

مستقل تصانیف

معارف النغمات

مولانا کی سب سے پہلی تصنیف فن موسیقی میں معارف النغمات ہے تحصیل علم سے فراغت کے کچھ عرصے بعد ۱۹۰۵ء میں فقیر اللہ سیف خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مستند نسخہ خدا بخش کتب فروش سے مولانا کو دستیاب ہوگیا، فارسی کے اس مخطوطہ کے مطالعہ نے موسیقی کا شوق پیدا کر دیا اور اس نے یہاں تک ترقی کی کہ اس فن کے حصول میں نہ صرف ہندوستان کے استادانِ وقت سے بلکہ مصر وغیرہ کے ماہرین فن سے بھی استفادہ کر کے پوری مہارت حاصل کی ۔ اس نسخہ کے متعلق مولانا "غبار خاطر" میں لکھتے ہیں :-

"سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا

ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدا بخش کے ہاتھ لگا تھا آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کتب خانے کا تھا، اور نہایت اہتمام سے مرتب کیا گیا تھا"

فارسی کے اس مخطوطہ کے مطالعہ نے موسیقی کا شوق پیدا کیا اور اس نے یہاں تک ترقی کی کہ اس فن کے حصول میں نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر وغیرہ کے ماہرین فن سے بھی استفادہ کرکے پوری مہارت حاصل کی، کلکتہ میں مسیتا خاں اور لکھنؤ میں مرزا محمد ہادی نے موسیقی کے فنی و علمی کمالات سے بڑی حد تک بہرہ مند کیا۔ مرزا صاحب نے "معارف النغمات" کی ترتیب میں بھی مدد دی جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

جامع الشواہد

مولانا ۱۹۱۶ء میں رانچی (بہار) میں حکومت ہند کے حکم سے نظر بند کر دئے گئے تھے، تدریس و ارشاد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، اخبارات کی ترتیب و اہتمام سے بھی مہلت مل گئی تھی، اب فرصت کے سارے لمحات تصنیف و تالیف میں صرف ہونے لگے۔ اس ۴ سالہ زمانۂ نظر بندی رانچی نے مولانا کے قلم سے بڑے بڑے کام لئے، یہیں تذکرہ کی ابتداء و انتہا ہوئی، اسی جگہ ترجمان القرآن کی آخری دونوں جلدوں کے ترجمے کی تکمیل ہوئی، اسی مقام پر جامع الشواہد جیسی مفید معلومات پر مشتمل کتاب تیار ہوئی۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی، اس کی سب جلدیں مولانا کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ رانچی کو دے دی گئی تھیں جو بہت جلد ختم ہو گئی تھیں، مولانا کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ ۱۹۲۷ء میں چھپی وہ بھی تقریباً مفقود ہے۔

جامع الشواہد میں اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے مسجد کن کن اغراض کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے؟ اور اسلام کی رواداری نے کس طرح اپنی عبادت گاہوں کا دروازہ بلا امتیاز مذہب و ملت تمام نوعِ انسانی پر کھول دیا ہے۔

تذکرہ

مولانا کی تصانیف میں تذکرہ ہی وہ پہلی تصنیف ہے جس نے مولانا کے اسلوبِ نگارش کا سکہ اہل علم و ادب کے دلوں پر بٹھایا اور الہلال والبلاغ کے جاہل تحاریر نے جلوۂ کمال کا سروسامان تذکرہ میں پیدا کر دکھایا، پہلا ایڈیشن مرزا فضل الدین احمد کے اصرار و انصرام سے البلاغ پریس کلکتہ سے ۱۹۱۹ء میں ٹائپ میں، ۳۱ صفحات پر مشتمل شائع ہوا، شروع میں مولانا کے شباب کا فوٹو بھی زینتِ کتاب ہے جس کے اوپر یہ شعر لکھا ہوا ہے

فیضی احسنت ازیں عشق اکہ دوراں امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

اس کا دوسرا ایڈیشن انارکلی کتاب گھر لاہور نے سویرا آرٹ پریس لاہور سے ۳۳۴ صفحات پر ۱۹۵۵ء میں اور تیسرا ایڈیشن کتاب محل لاہور نے پاکستان ٹائمز پریس لاہور سے ۳۲۰ صفحوں پر ۱۹۵۶ء میں شائع کیا ہے۔

مرزا فضل الدین احمد اور دوسرے احباب و معتقدین کا عرصہ سے اصرار تھا کہ مولانا اپنے قلم سے اپنے حالات زندگی مرتب کر دیں، عوام بھی مولانا سے بے پناہ عقیدت کی بنا پر اس کے آرزومند تھے مگر مولانا ہمیشہ ٹالتے رہے اور کسی طرح آمادۂ نگارش نہ ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں جب رانچی میں نظر بند ہوئے تو مرزا صاحب نے پہلے تو خطوط سے توجہ دلائی پھر خود جا کر ۶ مہینے تک ڈیرا ڈالے رہے۔ مولانا نے جب چارۂ کار نہ دیکھا تو قلم اٹھایا مگر اصل مقصد ٹالنے کے لئے پہلے اسلاف خاندان کے حالات لکھنا شروع کئے، مطبوعہ تذکرہ حصۂ اول ہے اس میں مولانا کے اجداد کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شیخ جمال الدین دہلویؒ کا ذکر خیر ہے۔ آخر میں اجمالی طور پر ۴۰ صفحات میں اپنے حالات دئے ہیں جنھیں اشارات کہنا زیادہ مناسب ہوگا جنگی مشکلات کے باعث اسبابِ طباعت کی عدم فراہمی کی وجہ سے کتاب کا حجم کم کرنے کے لئے تین فصلیں اور چار بڑے بڑے حاشئے نکال دئے گئے جن میں شیخ محمد بن شیخ جمال الدین، شاہ محمد افضل اور مولانا منور الدین کے حالات تھے، مرزا صاحب کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ مولانا کے اپنے تذکرہ کے ساتھ حصۂ دوم کی صورت میں شائع کیا جائے۔ پھر اس کی نوبت نہ آئی اور دنیا حصہ دوم سے اب تک محروم رہی۔

حصۂ اول صرف سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ ضمنی طور پر مسائلِ علمیہ و حقائق فقہیہ سے لبریز ہے۔ اس میں جا بجا جوشِ جوانی اور علمی فراوانی کی وجہ سے تحریر میں تندی اور بیان میں درشتی آگئی ہے اور جہاں کہیں اختلافِ مسلک کے سلسلے میں کوئی مسئلہ آگیا ہے قلم پر قابو نہیں رکھ سکے ہیں۔ چونکہ مولانا نے تقلیدی بندشوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا اس لئے اس مسئلہ پر خصوصیت سے ہر جگہ زورِ قلم دکھایا ہے جس کا "اعتذار" میں خود بھی اعتراف کیا ہے۔

ترجمان القرآن

مولانا نے ۱۹۱۵ء ہی میں ترجمۂ قرآن پاک کا کام شروع کر دیا تھا ۱۹۱۶ء میں جب البلاغ میں اس کا اشتہار چھپا تو پہلی منزل کا ترجمہ پورا ہو چکا تھا، ابتدا سے مولانا کے پیشِ نظر تین چیزیں تھیں ترجمہ، تفسیر اور مقدمۂ تفسیر، عام تعلیم کے لئے ترجمہ، مطالعہ کے لئے تفسیر اور

اہل علم و نظر کے لئے مقدمہ۔

جب ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت کی طرف سے نظربندی کا آرڈر ملا تو ترجمہ کا مسودہ ۸ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورۂ نسا تک پہنچ چکا تھا جو تلاشی کے وقت حکومت کے قبضے میں چلا گیا۔ مولانا نے نظربندی رانچی میں نویں پارے سے ترجمہ کی ترتیب جاری رکھی اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا۔ جب مطالبوں کے باوجود حکومت کی طرف سے مسودات واپس نہ ملے تو مولانا نے ابتدائی ۸ پاروں کا دوبارہ از سر نو ترجمہ کر ڈالا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہائی کے وقت نصف سے زیادہ حصہ ٹائپ کرایا جا چکا تھا۔ ۱۹۲۱ء کی گرفتاری کے موقعہ پر پھر یہ اثاثۂ علم حکومت کے قبضے میں پہنچ گیا۔ ۱۵ ماہ کے بعد رہائی پر جب واپس ملا تو اوراق پریشاں کا ڈھیر تھا۔

۱۹۲۷ء میں دوبارہ ترجمہ و تفسیر کا کام شروع کیا گیا جو ۲۰ جولائی ۱۹۲۹ء کو اختتام پذیر ہوا۔ اس طرح ترجمان القرآن جلد اول جید برقی پریس دہلی سے ۱۹۳۲ء میں اور جلد دوم مدینہ پریس بجنور سے ۱۹۳۶ء میں نظر نواز ہو سکی۔ پہلی جلد کا دوسرا ایڈیشن بہت کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور نے مقبول عام پریس لاہور میں چھپوا کر ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ یہ شرف راقم السطور کو بھی حاصل ہے کہ مولانا نے غبار خاطر کی طرح ترجمان القرآن کی یہ مرقمہ جلد بھی دستخطوں سے مزین کر کے ذریعۂ ڈاک ارسال فرمائی۔

۱۹۵۶ء میں ملک محمد شفیع مالک مکتبۂ مصطفائی لاہور نے بھی کو آپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ ورکس پریس لاہور سے دونوں جلدیں شائع کر دی ہیں۔

مولانا نے دیباچہ طبع ثانی میں پہلی جلد کے اس دوسرے ایڈیشن کی پانچ خصوصیات شمار کرا کے اسے ہر طرح نقش ثانی قرار دیا ہے۔ تیسری جلد ابھی تک کمال طبع سے آراستہ ہو کر مشام قلب و جاں کو معطر نہیں کر سکی۔ منشی عبد القیوم مراد آبادی خطاط سے مولانا نے تیسری جلد کی کتابت شروع کرانے کا ذکر نقش آزاد کے مکتوب ۱۲۲ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۶ء میں کیا ہے اس کے بعد انجام کار سے سارے وابستگان دامن بے خبر ہیں۔

۱۹۳۱ء میں جب پہلی جلد شائع ہوئی تو ہندوستان کے مشہور اہل قلم اور زعمائے اسلامیہ کے مستند عالم علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے جو طویل تقریظ لکھی اس کا کچھ حصہ درج کیا جاتا ہے۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال و البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشا پردازی اور زور تحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا

اُس نے اُن کے لئے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا ضرورت تھی کہ اسی موثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہو، تاکہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لئے نور بینش اور افزائش بصیرت کا سر و سامان اردو میں میسر آئے ۔

. . . .

مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انھوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا اور جس طرح انھوں نے اُس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا اسی طرح اِس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفۂ یونان و فرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا، اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلام الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل اور فلسفہ سے سمجھنا چاہیے ۔

. . . .

سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشیں تشریح اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سے اس سورہ کے ام الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے ۔ خصوصاً قرآن پاک کے طرز استدلال، خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے ۔ اور امام غزالی نے "الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ" میں اور ابن قیم نے "مفتاح دار السعادۃ" میں اس بحث پر جو کچھ لکھا تھا، اس سے زیادہ بسط و تشریح اور مقتضیات زمانہ کی مطابقت سے "ترجمان القرآن" میں یہ بحث آگئی ہے چنانچہ توحید اور دلائل توحید نیز تحقیق بالحق، الہدیٰ اور الدین کی مصنف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں وہ اگر ایک طرف نکتہ پرور ہیں تو دوسری طرف ایمان پرور ہیں ۔"

علامہ سید سلیمان ندوی جیسا وسیع النظر فاضل اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم جیسے اکابر کے طرز پر اگر کوئی تفسیر اس وقت تک لکھی گئی ہے تو وہ مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن ہے۔ چونکہ ان دونوں افاضل کی تفسیریں ناپید ہیں اس لئے صرف یہی تفسیر ایسی ہوسکتی ہے جسے مسلمانانِ عالم پڑھ اور سمجھ کر قرآن کی روح تک پہنچ سکتے ہیں۔

اپنی تفسیر میں مولانا نے تفسیر ابن اثیر سے بہت کچھ اخذ کیا ہے اور اسی تفسیر کو اپنے معیار کے مطابق دوسری تفاسیر پر ترجیح دی ہے اور یہ تفسیر نہ مطبوعہ ہے نہ اس کی زیارت سہل الحصول۔

ترجمان القرآن کی جلد اول کی اشاعت کے بعد مولانا کے حسّاد و معاندین نے اعتراضات کا طوفان اٹھایا، بڑا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نجات اخروی کے لئے ایمان بالرسالۃ ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہوا کہ انھوں نے " لا تقربوا الصلوۃ" کے ساتھ " و انتم سُکاریٰ" کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مولانا نے اسی وقت بعض احباب و معتقدین کے استفسار پر مسئلہ کی وضاحت کر دی تھی اب اسی سلسلے میں "میرا عقیدہ" ایک مجموعۂ مکاتیب شائع ہوا ہے جو اس الزام و بہتان کا شافی جواب ہے۔

روایتی مصنّفات

مولانا کی رحلت کے بعد دو کتابیں ایک اردو میں اور دوسری انگریزی میں شائع ہوئی ہیں، ان دونوں نے اہل علم و نظر اور ارباب سیاست میں ہلچل ڈال دی ہے بعض اہمات امور پر بحث و رد کا دروازہ کھل گیا ہے۔

آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی

بہ روایت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر اپریل ۱۹۵۸ء میں مولانا کی وفات کے دو ماہ کے اندر ۴۴۲ صفحات پر مشتمل دو ہزار کی تعداد میں شائع کی ہے۔ مولانا ملیح آبادی کے جذبات عقیدت بصورت مقدمہ بڑے موثر پیرائے میں زیب کتاب ہیں اس میں ملیح آبادی صاحب نے بتایا ہے کہ ان کے اصرار پر مولانا نے ۱۹۲۱ء میں جیل میں یہ حالات املا کرانا شروع کئے تھے اور رہائی کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اس کتاب میں ۴۴ عنوانات کے تحت مولانا کے خاندانی حالات، خود ان کے بچپن سے عنفوان شباب تک کے واردات، تحریری و تقریری صلاحیتوں کا بتدریج ارتقا، ذہنی اختلال، عقائد کا مدوجزر اور دوسرے سوانح زندگی پر روشنی پڑتی ہے، بعض مندرج امور پر بحث و رد کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، انہی میں سفر عراق، مولانا

منور الدین کی رکن المدرسینی اور مولانا خیر الدین کی نہر زبیدہ کی درستگی بھی شامل ہے۔

انڈیا ونس فریڈم (ہندستان آزاد ہوا)
بقلم پروفیسر ہمایوں کبیر

لانگمین اینڈ کمپنی کلکتہ نے انلینڈ پرنٹنگ ورکس کلکتہ میں اواخر جنوری ۱۹۵۹ء میں ۵۲ صفحات پر پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کی ہے، شروع میں مرتب، پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر امور ثقافت حکومت ہند کا ۱۰ صفحے کا مقدمہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ مہینے میں ختم ہو گیا اور دوسرا ایڈیشن اسی تعداد میں مارچ ۵۹ء میں منظر عام پر آگیا ہے۔

اس سوانح حیات کو مرتب نے مولانا سے مذاکرات کی بنیاد پر انگریزی میں ترتیب دیا ہے۔ کتاب میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مختصراً ابتدائی زندگی کے حالات ہیں، اصل کتاب ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۴۸ء تک کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے کتاب میں ملک کے سیاسی حالات سے بحث کی گئی ہے اور ان حالات میں مولانا کا جو رول رہا ہے اس کی تفصیلات ملتی ہیں

مولانا نے اس کتاب میں ملک کی تقسیم اور گاندھی جی کے قتل کی ذمہ داری بڑی حد تک سردار پٹیل آنجہانی کی ضد اور غفلت پر ڈالی ہے پنڈت جواہر لال کا لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور خصوصیت سے لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے متاثر ہو کر تقسیم پر رضا مند ہونا اور ۴۶ء میں دو سیاسی غلطیاں کر کے ملکی حالات کو ناساز گار بنا دینا بھی بیان کیا ہے۔ سفر عراق، مصر، شام، ترکی اور فرانس ۱۹۰۸ء میں بتایا ہے جس کی تائید حالیہ مطبوعہ کتاب Azad - a memorial volume مرتبہ پروفیسر ہمایوں کبیر میں فرانسیسی مستشرق Luis messignen کے مضمون سے بھی ہوتی ہے کہ اس کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں مولانا سے عراق میں ہوئی تھی۔ اس کی تائید کاروانِ خیال کے ایک مکتوب مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء سے پہلے ہی ہو چکی تھی کیونکہ اس میں ۳۲ برس پہلے دجلہ کی لہروں پر ایک غزل سننے کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ۳۲ سال کم کئے جائیں تو ۱۹۰۸ء ہی ہوتا ہے۔

سفر عراق سے متعلق غلط فہمی علامہ سید سلیمان ندوی کی ایک عبارت سے پیدا ہوئی تھی جو معارف کے دسمبر ۱۹۵۰ء کے "شروانی نمبر" میں کاروانِ خیال کے ایک مکتوب کے سلسلے میں موصوف کے قلم سے نکلی تھی کہ نواب صدر یار جنگ نے مولانا آزاد کے سفر عراق کی جو تائید کی ہے وہ کبر سنی کی وجہ سے ذہول طاری ہو جانے کی بنا پر ہے ورنہ مولانا آزاد عراق گئے ہی نہیں۔ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ علامہ مرحوم کی اس عبارت میں ایک ذہول نہیں کئی ذہول ہیں، آپ نے مولانا آزاد کے بھائی کا نام غلام محی الدین لکھا ہے حالانکہ ان کا نام

غلام یٰسین تھا ، اسی طرح ان کا انتقال عراق میں بتایا ہے جبکہ ہندوستان واپس ہونے کے بعد رفیق اعلیٰ سے ملاقی ہوئے تھے ۔

اسی طرح " آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی " میں سفر عراق کی تاریخ سنہ ۱۹۰۸ء تحریر ہوگئی ہے جو سہو کاتب یا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی املا کی غلطی ہوسکتی تھی مگر منتظرین موقع نے مولانا کے بیانات کا تعارض دکھا کر شکوک وشبہات کی گنجائش نکال ڈالی انھیں میں ہمارے محترم رفیق مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی بھی ہیں جنہوں نے الفرقان لکھنؤ (ماہ دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء) میں اپنے طویل مضمون میں دوسرے امور پر شبہات کی طرح سفر عراق پر بھی خامہ فرسائی کی ہے ۔

مولوی ریاض الرحمٰن خاں شروانی ایم ۔ اے استاد شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی نے اس معاملہ (سفر عراق) پر جس سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ (مدینہ بجنور ۲۸ مارچ سنہ ۵۹ء)

مولانا آزاد کی علمی و دماغی کاوشوں کا یہ استقرار و احصا نہیں ، ہوسکتا ہے ابھی بہت کچھ سرمایۂ علم و ادب ہاتھ آجائے ، پھر بھی جہاں تک ہوسکا ہے کوشش کی ہے کہ کوئی قابل ذکر چیز چھوٹنے نہ پائے ۔ مولانا پر ریسرچ شروع ہوگئی ہے ، خود ہماری یونیورسٹی میں محترمہ مسز عابدہ سمیع ایم اے نے مولانا کی سیاسی حیثیت پر اور مسٹر غیث الدین فریدی نے ادبی حیثیت پر کام شروع کردیا ہے علی گڑھ کے علاوہ حیدرآباد دکن اور دہلی میں بھی کام ہو رہا ہے ۔ دہلی کے ریسرچ اسکالر کو ریاست کشمیر وظیفہ دے رہی ہے ۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب نے سوانح حیات (جس میں علمی و ادبی کاوشوں کو اولیت حاصل ہے) کا بڑا حصہ مرتب کرلیا ہے ۔

مولانا پر ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد کتنا کام ہوچکا ہے یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اور مستقل عنوان چاہتا ہے ۔ موقع ملا تو اس موضوع پر بھی لکھنے کی کوشش کی جائے گی ۔ وما توفیقی الا باللہ ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب زندگی

حسن عسکری بلکھنوی

تعلیمی ماحول اور ذہنی خلش

۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ہندوستان سے باہر (مکہ میں) ہندوستان کے اس مولوی گھرانے میں ہوئی جس کا تعارف انھوں نے اپنی کتاب غبار خاطر میں اس طرح کرایا ہے

"میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا اس لئے خلقت کا ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈروں کے عروج کا کمال سمجھا جاتا ہے وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لئے بڑی آزمائش ہوتی ہے اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں بر خود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے ممکن ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصہ میں بھی آئے ہوں کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لئے خود اپنے کمین میں بیٹھنا جیسا کہ عرفی نے کہا ہے آسان نہیں ۔

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا　　　یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش

لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جا رہی تھی میں خاندانی بزرگی

> ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے
> بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس
> ڈھونڈھتے ہیں اور ملتی نہیں مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدر شناس نہ ہو سکا"

۸ر اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا کی صدارت میں کانگریس نے بمبئی میں انگریزوں کے متعلق ہندوستان چھوڑو کا ریزولیوشن پاس کیا لہذا مولانا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ساتھ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں گرفتار کیے گئے اور احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند ہوئے مولانا اور ان کے سیاسی رفیقوں کی یہ نظر بندی ایسی تھی جس میں اپنے عزیزوں تک سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی تھی ایسی حالت میں مولانا اپنی فرصت کو اس طرح کام میں لائے کہ قلعہ احمد نگر کی فصیل کے اندر ایک چھوٹے سے ماحول کی عکاسی کے ساتھ اپنی زندگی کی کہانی مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو اپنے ذہن میں اپنا مخاطب بنا کر سپرد قلم کی اس میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ میرا بچپن اور شباب کس ماحول میں گزرا اس کے متعلق بطور شکوہ انھوں نے کہا ہے "میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا" اس لئے لوگ اس کا احترام کرتے تھے اور اس کی طرف جھکتے تھے یہ بات دوسری ہے کہ اس احترام اور جھکاؤ کا سرچشمہ وہم و مرعوبیت سے ترکیب پانے والا وہ روحانی فریب تھا جسے ارادت و عقیدت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے تخریبی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مولانا نے کہا ہے خاندانی پیشوائی و مشیخت کا نوعمر طبیعتوں پر بُرا اثر پڑتا ہے یعنی اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ" ابتدا ہی سے طبیعتیں برخود ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوتا ہے" مولانا نے سامنتی امارت کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس روگ کے تخریبی اثرات سے اپنے ذہن کو بھی پوری طرح محفوظ نہیں بتلایا ہے یعنی انھوں نے کہا ہے "ممکن ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصہ میں بھی آئے ہوں" اپنی کمیوں کو دیکھنے اور ان کو دور کرنے کی مشکل کا اعتراف یہ بتلاتا ہے کہ انھیں اپنی کمیوں کو دیکھنے اور ان کو دور کرنے کی بڑی لگن تھی لہذا اس سلسلہ میں وہ اپنے بچپن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا" یعنی ان سے خوش نہ ہونا ان کی اہمیت سے انکار کرنا تھا لہذا جب اس انکار کا انکر پوری طرح بڑھ گیا تو اس نے مولانا کو نئے راستے تلاش کرنے کی طرف مائل کیا ان کا بچپن اگرچہ کلکتہ جیسے بڑے شہر میں گزرا جو مختلف تہذیبوں کا سنگم تھا مگر مولانا کا خاندان

(انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں) اپنی قدیم روایات کی حفاظت کرنے میں اس درجہ مبالغہ سے کام لیتا تھا کہ اس کو یاد کر کے مولانا نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں یہ رجحانات پیش کیے ہیں۔

"جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات و خصائل کا تعلق ہے اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادات و خصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی ہے چال ڈھال طور طریقہ امیال و اذواق سب کے اندر خاندان کا ہاتھ صاف دکھائی دے رہا ہے یہ خاندانی زندگی کی روایتیں مجھے میرے ددھیال و ننھیال دونوں سلسلوں سے ملیں اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں وہ بہرحال میرے حصہ میں آئی تھیں"

اپنے اخلاق و عادات میں اپنے توارث کا عکس دیکھ کر اس کی کمی بیشی کو محسوس کرنے کی صلاحیت مولانا میں نہ معلوم کب سے پیدا ہو چکی تھی مگر انھوں نے احمد نگر کے قلعہ میں صحیح معنوں میں اس عکس کو عکس جانتے ہوئے کہا تھا "میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ متعصب اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر ادھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سنیں وہ بھی سرتا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغی ورثہ اس تصلب اور جمود سے بوجھل تھا"

انھوں نے اپنے بزرگوں کے افکار و عقاید اور ان کے مسلک پر بلاکسی رو رعایت کے روشنی ڈالی ہے اور ان کو ان لوگوں سے بلحاظ جمود دماغی ورثہ جو ملا اس کی اہمیت انھوں نے اس طرح ظاہر کی ہے " میرا دماغی ورثہ اس تصلب اور جمود سے بوجھل تھا" یعنی جمود نے ان کے ذہن میں جو گلکاریاں کی تھیں ان کے گہرے خطوط کے مٹانے میں انھیں جو دقتیں ہوئی تھیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں" میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گزر ہی نہ تھا والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا وہ بھی وہی تھے جنھیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ ان کے معیار عقاید

و فکر پر پورے پورے اتر سکتے ہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ ان کے معاصروں میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہو سکتی تھی بس ظاہر ہے کہ اس دروازہ سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا"

وہ اپنے تعلیمی ماحول کو قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا بتلاتے ہیں یعنی ان کے استادوں کے ذہن تقلید کی اس درجہ گرفت میں تھے کہ جن روایات کو وہ لوگ عزیز رکھتے تھے ان سے ہٹ کر کسی نئے تجربہ کی طرف مائل ہونا ان کے بس کی بات نہیں تھی دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخصیت کے نکھارنے یا سنوارنے کے لئے ان کے ماضی نے انھیں جو کچھ دیا تھا اس میں کسی قسم کی کاٹ چھانٹ یا اضافہ کی آرزو ان کے ذہنوں میں پیدا ہی نہیں ہوتی تھی جس تعلیم کے نزدیک تعصب، تنگ نظری، تقلید اور روایت پرستی کی پونجی میں اضافہ کرنا ضروری ہو آزادی رائے اور عقل کو آسودہ کرنے والے اختلافات کو برداشت کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو، اس سے اچھے خاصے ذہنوں کے لئے بھی بے راہ ہونے کا سامان پیدا ہوتا ہے تعلیمی ماحول کی اس نا سازگاری کے متعلق مولانا نے کہا ہے ۔

"جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں میں زندگی بسر کر رہا تھا"

بے حس بے خبر اور اس تنگ ماحول سے کسی نئی راہ پر چلنے کا اشارہ کیسے مل سکتا تھا لہذا اس بڑی کمی سے پوری طرح متاثر ہو کر انھوں نے کہا ہے

"ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچا ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے لیکن میری سوسائٹی اوائل عمر میں گھر کی چار دیواری کے اندر محدود رہی اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے یا رجعت قہقری کر کے پیچھے ہٹتے اور دور مودب ہو کر بیٹھ رہتے انگریزی تعلیم کی ضرورت کا

یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ سے واسطہ پڑتا، مدرسہ کی تعلیمی زندگی بہر حال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لئے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے "

ایک تنگ تعلیمی ماحول میں مولانا کو اپنی ذہنی نشو و نما کے لئے جو سامان دستیاب ہوا تھا اس کا مقابلہ ۱۹۴۶ء کے ترقی یافتہ تعلیمی وسائل سے کرتے ہوئے مولانا کے ذہن میں زبردست احساس زیاں کروٹیں لے رہا تھا وہ احساس زیاں کبھی باپ اور اپنے اعزا کی محبت کے تاریک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے کبھی خاندانی مریدوں کی وہم پرستی کو ٹھکراتے ہوئے انگریزی تعلیم کی کمی کی طرف اشارہ کرتا ہے کبھی عربی فارسی کے مدرسوں کی گھٹے مقابلہ میں تھوڑی بہت کشادگی کے بھی نہ ملنے کا شکوہ کرتا ہے مقصد یہ ہے کہ اس احساس زیاں نے مولانا کو مولانا بنا دیا تب بھی اس نے ان کا پیچھا اس لئے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا لہذا اسی کے اثر میں آکر وہ لکھتے ہیں

"جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا پھر اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا ایک ایسا فرسودہ نظام تعلیم جسے فن تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے سرتا سر عقیم ہو چکا ہے طریق تعلیم کے اعتبار سے ناقص مضامین کے اعتبار سے ناقص انتخاب کتب کے اعتبار سے ناقص درس و املا کے اعتبار سے ناقص اگر فنون آلیہ کو الگ کر دیا جائے تو درس نظامیہ میں بنیادی موضوع وہی رہ جاتے ہیں۔ علوم دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے ان سے ان کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو لیکن خود ان علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ تاریخ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار رہے حالانکہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی "

گھر کی چار دیواری اور طریقہ تعلیم کا وہ پرانا پن جو پرانے پن کو چھاتی سے لگائے رکھنے کے علاوہ اور

کچھ نہیں سکھاتا تھا اس سے زندگی کی نئی راہوں کے کھوجنے کے متعلق کسی اشارے کے نہ ملنے کے باعث مولانا نے اس نظامِ تعلیم کو بانجھ کہا ہے یعنی مولانا جس مجتہدانہ بصیرت کو دوست رکھتے تھے اس کی تشفی نہ علوم دینیہ سے ہوئی اور نہ سینکڑوں سال پہلے اسلامی تمدن میں پیدا ہونے والے فلسفیوں کی ذہنی کاوشوں کو مرعوبیت کے ساتھ دیکھنے سے لہذا انھوں نے کہا ہے -

"ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور نا آشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا"

اس میں شک نہیں مولانا کو جس طرح کی تعلیم ملی وہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی مگر اس کے ذریعہ سے مولانا کے ذہن میں جو شکوک پیدا ہوئے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں انھوں نے کہا ہے

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہئے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقاید و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں بہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں"

مولانا کو خاندان، تعلیم اور ماحول نے جو عقائد و افکار دئے تھے ان کی دیواروں کو ہلانے والے شکوک کو جن احساسات نے ابھارا وہ اس درجہ اہمیت رکھتے تھے کہ ان کے باعث مولانا میں پورے ہندوستان کے مسائل زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑنے میں اس درجہ ترقی پسندی کے ساتھ حصہ لیا کہ ماضی کی فرسودگی کی طرف بھولے سے بھی مڑ کر نہیں دیکھا ان کی اس تشکیک نے مذہب کے تنگ گھروندے سے انسانیت کی کھلی فضا میں آنے کا جو تقاضا کیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے

"شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لئے دلیل راہ بنی بلا شبہ

اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کردیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی
تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین و طمانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا گویا
جس علت نے بیمار کیا تھا وہی بالآخر دارو نے شفا بھی ثابت ہوئی "

مولانا کی اس تشکیک سے کھونے اور پانے کا جو تصور وابستہ ہے اس سے ہندوستان کے قومی تصور کے
رخنوں کو دریافت کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے ۔۔

سعی پیہم کی ایک سمت

غبارِ خاطر میں ایک مقام پر مولانا نے اپنی فکر آشنا نوخیز جوانی کا تعارف اس طرح
کرایا ہے

"پچیس برس کی عمر میں جبکہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں
میں اپنی دشت نوردیاں ختم کرکے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا "

یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے غیر ملکی جبر و استبداد کے فتنوں سے ہندوستانی سماج کے لئے پیدا
ہونے والی تلخیوں اور محرومیوں کے خلاف ۱۹۱۲ء سے جب ان کی عمر ۲۴ سال ہی کی تھی الہلال کے
ذریعہ سے آواز اٹھانی شروع کردی تھی انھوں نے الہلال میں جو مضامین لکھے ان کی اہمیت پر اس اقتباس
سے روشنی پڑتی ہے ۔

"کارساز قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں کچھ خاک امید کی لی اور کچھ خاکستر
حسرت کی دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا اور انسان نام رکھ کر اس
ہنگامہ زار ارضی میں بھیج دیا، کبھی امید کی روشنی میں شگفتہ ہوتا ہے کبھی ناامیدی
کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے کبھی ولولوں کی بہاروں میں زمزمہ ساز نغمۂ انبساط ہوتا ہے
کبھی حسرت و افسوس کی خزاں میں امیدوں کے پژمردہ پتوں کو گنتا ہے کبھی ہنستا
ہے اور کبھی روتا ہے کبھی رقص نشاط ہے اور کبھی سینۂ ماتم ایک ہاتھ سے جمع کرتا ہے
اور دوسرے سے کھوتا ہے ۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پس اے ساکنانِ غفلت آباد ہستی! وائے رہروانِ سفر مدہوشی و فراموشی مجھے بتلاؤ
کہ تمھاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے اور اے نیرنگ آرائے

تماشاگاہ عالم! کیا یہ ہنگامہ حیات، یہ شورش زندگی، یہ رستخیز کشاکش ہستی تو نے صرف اتنے ہی کے لئے بنائی ہے

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند　　بمن حوالہ نومیدیم گنہ گیرند

یہ مضامین جس تاریخی ماحول میں لکھے گئے تھے اس میں سامراج وادیوں اور ہندوستان کے انقلاب پسندوں میں زبردست ٹکریں ہو رہی تھیں یعنی سنہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کا زمانہ بنگال میں انقلابی سرگرمیوں کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا تھا ایک طرف انقلاب پسند اپنے محدود وسائل سے انگریزوں کو ہندوستان سے باہر کرنے پر تلے ہوئے تھے اور دوسری طرف انگریز اپنے لامحدود سامراجی وسائل سے انقلاب پسندوں کو کچلنے میں مصروف تھے ان حالات کو مولانا آزاد نے کلکتہ میں رہتے ہوئے بہت قریب سے دیکھا تھا لہٰذا ان کی حساس طبیعت پر ان کا جو اثر ہوا وہ الہلال کے مضامین کی روح بن گیا انھوں نے اس اقتباس میں امید و نا امیدی، حسرت و تمنا، رنج و خوشی، ولولوں اور امنگوں کے سرمایہ کو قومی مسائل کی طرف سے برتی جانے والی غفلت و مدہوشی میں ڈوبتے دیکھ کر ہندوستانی عوام کو زندگی کے شہر غفلت میں رہنے والے، مدہوشی و فراموشی کی راہ پر چلنے والے کہہ کر ان سے سوال کیا ہے کہ تم زندگی کی انفرادی بھول بھلیوں میں ہی پڑے رہو گے کیا تمہاری زندگی کا صرف اتنا ہی مقصد ہے اس کے بعد انھوں نے عرفی کے اس شعر سے اپنے مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند　　بمن حوالہ نومیدیم گنہ گیرند

یعنی میری کمند بھی کوتاہ ہے اور بازو بھی تھکے ہوئے ہیں یہ وہ حالات ہیں جن میں ایک بام بلند کی طرف جانے کی آرزو رکھتا ہوں یعنی میرے سامنے جو بڑا مقصد ہے اس کے مطابق مجھے مادی وسائل نہیں ملے ہیں ان حالات میں بھی جو عام طور سے لوگوں پر مایوسی طاری کر دیتے ہیں میری یہ حالت ہے کہ میں خود کو مایوسی کے حوالے نہیں کر سکتا ہوں یعنی میرے حوصلے ذرا بھی پستی کی طرف نہیں جاتے ہیں مولانا کے اس قسم کے رجحانات کا گورنمنٹ بنگال پر یہ اثر پڑا کہ اس نے اپریل ۱۹۱۶ء میں ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت انھیں بنگال سے باہر نکال دیا وہ رانچی پہنچے کچھ دن بعد ان کو رانچی میں ہی حکومت نے نظر بند کر دیا اور یہ سلسلہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک چلا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا کانگریس میں شامل ہو گئے۔ یہ مولانا کی قوت فیصلہ کا شاہکار تھا اس نے مولانا کی سیاسی جد و جہد کی سمت متعین کی

کہ فرقہ پرستی اور سامراج واد کی بڑی بڑی آندھیاں مولانا کے رخ کو بدلنے میں ناکام ہوگئیں انھوں نے صرف تین سال کے عرصہ میں ہی اپنی زبردست قوت ارادی سے کانگریس کو اس درجہ متاثر کیا کہ ۱۹۲۳ء میں چونتیس سال کی عمر میں ہی ان کو کانگریس کا صدر چنا گیا۔ انھوں نے کانگریس میں شامل ہونے سے پہلے ہی قید و بند کی دشواریوں کے برداشت کرنے کے لئے اپنی کمر کس لی تھی لہذا انھوں نے قلعہ احمد نگر میں ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کو ایک خط میں اس کے متعلق لکھا ہے۔

"قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اسی منزل سے قافلۂ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے۔

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں عمر کے ترپن سال جو گزر چکے ہیں ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لئے بھی تھا یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں گویا خواجہ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے۔

نگویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسا می باش

مولانا نے اپنے قید و بند کی زندگی اور آزاد زندگی کے تناسب پر جو اس خط میں روشنی ڈالی ہے اس سے سات دن میں ایک دن کی قید کی زندگی کا ہوتا ہے گر یہ خط مولانا نے جس دن لکھا تھا وہ قلعہ احمد نگر کی نظربندی کا دوسرا دن تھا لہذا اس کے بعد مولانا نے دو برس گیارہ مہینہ قید کی زندگی اور گزاری چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا نے غبار خاطر کے حاشیہ میں لکھا ہے۔

"یہ مکتوب ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا گیا تھا اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گزر گئے اور مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینہ کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی اس

اضافہ کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں
تصہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا "

غیر ملکی جبر و استبداد کے بھاری بوجھ اٹھانے کے لئے مولانا نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ پیش کر دیا مگر اس عرصہ میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں آئی جس میں مولانا کی گردن اس بوجھ سے ذرا بھی جھکی ہو! انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو اس سلسلہ میں لکھا تھا ۔

" وقت کے حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں ان میں اس ملک
کے باشندوں کے لئے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں بے حسی کی زندگی
بسر کریں یا احساس حال کی پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جاسکتی ہے مگر
دوسری کے لئے قید خانہ کی کوٹھری کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی ہمارے سامنے
بھی دونوں راہیں کھلی تھیں پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی"

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود   لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

یہ رجحانات ملک کی سیاسی و اقتصادی بدحالی سے اک در مندانہ لگاؤ کا پتہ دینے کے ساتھ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بے حسی کے ساتھ زندگی کا بسر کرنا مولانا کے بس کی بات نہیں تھی لہذا اس کی آسانی سے کنارہ کش ہوتے ہوئے ان کی مشکل پسند طبیعت نے قید خانہ کی کوٹھری کو اپنایا، انھوں نے جس سمت میں اپنا سیاسی سفر شروع کیا اس میں ان کا آرام کھو گیا مگر اس آزادی کا پتہ مل گیا جس کو انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنایا تھا اس مقصد کے متعلق ان کا ایک اشارہ ملاحظہ ہو ۔

" طالب علمی کے زمانہ میں فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے عمر کے ساتھ
یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں
فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی
پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں
لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں یہ ہمیں ایک طرح کی
تسکین ضرور دیدیتا ہے لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے ایجابی تسکین سے
اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی یہ فقدان کا افسوس کم کر دیگا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائیگا"

فلسفۂ قدیم اور اس کی دین، غلام ہندوستان اور اس کی عملی سیاست کی مانگ، ان دونوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رجحانات پیش کئے گئے ہیں یعنی فلسفہ کسی چیز کے کھو جانے کے غم کو کم کرنے میں مدد کرتا ہے مگر اس مدد سے ہندوستان کی غلامی کا اہم سوال حل نہیں ہوتا تھا اس کے حل کے لئے سامراجی ظلم و استبداد کو قربانیوں کے ذریعہ للکارنا ضروری تھا لہذا انھوں نے کہا تھا۔

"اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں تو فلسفہ ہمیں کلیلہ دمنہ پنچ تنتر کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا" لا تاسُ علیٰ ما فات" جو کچھ کھو چکا اس پر افسوس نہ کر لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے"

مولانا کے تاریخی ماحول میں کچھ لوگ بے حسی کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے انھیں یہ آرزو ذرا بھی نہیں ستاتی تھی کہ ہندوستان نے کیا چیز کھو دی ہے؟ اس کھوئی ہوئی چیز کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ مگر مولانا اس کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کرنے والوں میں بلحاظ قربانی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے لہذا رنج و راحت کو ناپنے کے مختلف طریقوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے کبھی مرہم بن جاتا ہے طلب و سعی کی زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو۔

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی کوئی اٹکاؤ کوئی لگاؤ کوئی بندھن ہونا چاہئے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں، یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد   سرمدئے و پیالہ ربطے دارد

یہاں پانے کا مزہ انھی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں انھیں کیا معلوم کہ پانے کے کیا معنی ہوتے ہیں"

مولانا پورے ہندوستان کی خوشحالی کے تصور کو پیش نظر رکھ کر جو الجھنیں اور دقتیں اٹھاتے تھے ان میں انھیں ایک طرح کی لذت محسوس ہوتی تھی لہذا وہ لوگ، جو اپنے کسی مقصد کی طرف آرام دہ طریقوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے کہا تھا، "یہاں پانے کا مزہ انھی کو مل سکتا ہے

جو کھونا جانتے ہیں" مولانا اپنے راحت و آرام کو کھو کر جس سمت میں ہندوستان کی خوشحالی کی تلاش کو پہلے دن نکلے تھے اسی سمت میں وہ زندگی بھر چلتے رہے، ان کی قوت فیصلہ نے انھیں رخ بدلنے اور بھٹکنے بھی نہیں دیا اور ان کی ترقی پسندی کو نمایاں کر دیا ۔

جنس محبت کا لین دین

مولانا اجمل خاں صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس حبیب گنج (ضلع علی گڈھ) اور مولانا آزاد کے تعلقات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے" نواب صاحب سے حضرت مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم ہے مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل ان سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی یہ علاقہ محبت و اخلاص صرف علمی اور ادبی ذوق کے رشتہ اشتراک میں محدود ہے'

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر جس وقت صرف اٹھارہ سال کی تھی اس وقت ان کے تعلقات مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے ہو گئے تھے مولانا شیروانی ایک ادیب بھی تھے اور شاعر بھی تھے ان کا ذوق ادب و شعر اس درجہ معیاری تھا کہ اس سلسلہ میں ان کی خط و کتابت ڈاکٹر اقبال سے بھی ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب کسی حد تک ان کے ہم عمر بھی تھے مگر ان کی خط و کتابت میں اس درجہ محبت کی گرمی نہیں ہے جس درجہ مولانا آزاد کی خط و کتابت میں ہے ۔ مولانا آزاد مولانا شروانی کی شخصیت میں اس درجہ کشش محسوس کرتے تھے کہ عزیزوں اور قرابت داروں سے بھی پہلے قلعہ احمد نگر کی تنہائی میں ان کے ذہن میں مولانا شروانی کی یاد آئی تھی لہذا انھوں نے مولانا شروانی کو اپنا مخاطب اس حالت میں بنایا ہے جبکہ ان کے خطوط قلعہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے ، انھوں نے مولانا شروانی کو ۱۰ راگست ۱۹۴۲ء کو جو خط لکھا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ۔

> " دوسرے دن یعنی ۱۰ راگست کو حسب معمول صبح تین بجے اٹھا جائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا تھا میں نے چائے دم دی فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا ، خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے اچانک وہ خط جو ۳ راگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا یاد آ گیا بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف ہے چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا اور اس کے بعد

> ہر دوسرے تیسرے دن مکتوبات قلمبند ہوتے رہے آگے چل کر بعض دیگر احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آئی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبع درماندہ عال درازنفسی کرتی رہی قید خانہ سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ سکیں گے یا نہیں تاہم ذوق مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دل سمت پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا "

"آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں روئے سخن آپ ہی کی طرف ہے" یہ فقرہ پوری طرح محبت میں شرابور ہے اس کے بعد مولانا نے کہا ہے "آگے چل کر بعض دیگر احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آئی" یعنی قلعۂ احمد نگر کی تنہائی میں قلعہ سے باہر کے جن لوگوں کو انھوں نے یاد کیا ان میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی پہلے تھے، مولانا شروانی کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ علمی و ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں کو بہت چاہتے تھے لہذا اس کوچہ کے لوگ اس کا معاوضہ اس طرح ادا کرتے تھے کہ مولانا شروانی جس نظر سے ان کو دیکھتے تھے اسی نظر سے وہ بھی ان کو دیکھتے تھے اسی اصول کے مطابق ان دونوں ادبی شخصیتوں میں جنس محبت کا لین دین ہوا تھا، مولانا آزاد کی صدارت میں اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس انگریزوں کے تعلق ہندوستان چھوڑدو کا ریزولیوشن پاس کر چکی تھی اور اس دور میں انگریز جاپان اور جرمنی کے لگائے ہوئے زخموں سے چڑھے ہوئے تھے لہذا انھوں نے کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں پر اس طرح کا سیاسی پردہ ڈالا تھا کہ مولانا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے متعلق کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں ہیں اسی لئے ان لوگوں کو قلعۂ احمد نگر سے باہر خط و کتابت کرنے تک کی اجازت نہیں تھی یہ ایک بڑا سیاسی دباؤ تھا جس سے متاثر ہو کر مولانا نے کہا تھا " قید خانہ سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے مستقبل پردہ غیب میں مستور تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ سکیں گے یا نہیں" یہ درد میں ڈوبے ہوئے رجحانات درد مند مخاطب تک پہنچنے کی بڑی آرزو لئے ہوئے تھے مگر انھیں حالت درد کی نمایندگی کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا مولانا کی رہائی کے بعد ان دونوں حضرات میں پھر خط و کتابت جاری ہوئی جس کا نمونہ ایک دوسرے کے جوابات کی صورت میں ملاحظہ ہو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے شملہ کانفرنس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنہ ۱۹۴۵ء میں لکھا تھا

"جس دن بدر کامل گہن سے نکلا تھا دل نے محسوس کیا تھا کہ نور عظمت جہاں تاب ہوگا ہوا اور کس شان سے ہوا، ۲۷ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ایک ہنگامہ ایک گروپ کی شکل میں سامنے آیا اس میں ایک پیکر محبوب بھی تھی قینچی لی جمع اغیار سے اسے جدا کیا دیکھا شیراز کی طرف سے صدا آئی۔

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست — منت خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

اس غزل کا اور دوسرا شعر شاید بے موقعہ نہ ہو۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

خیر یہ تو ترانۂ شیراز تھا کان لگا تا ہوں تو شملہ کی چوٹیوں سے دوسرا ترانۂ محبت سامع نواز ہو رہا ہے

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل — می بینمت عیان و دعا می فرستمت

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا بدر کامل، نور عظمت جیسے استعارات سے مولانا کو نوازنا ان کی گرمی محبت کا ایک ایسا مظاہرہ ہے جو ان کو ایک بزرگ نسل کا فرد ثابت کر رہا ہے انھوں نے شملہ کانفرنس میں شریک ہونے والے لوگوں کے گروپ کو اخبار میں دیکھ کر مولانا سے اپنے جذباتی لگاؤ کی بنا پر ان کی تصویر کو اس میں سے قینچی سے الگ کر کے اس کو اس مقام احترام تک پہنچایا جو کہ اس گروپ کی کسی دوسری تصویر کو وہ دینا نہیں چاہتے تھے مولانا شروانی نے اس خط میں خواجہ حافظ کے جن اشعار کا استعمال کیا ہے وہ عزیز ترین ادبی روایات اور مولانا کی محبت کی گہرائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کے بعد مولانا شروانی نے مولانا آزاد کو یہ منظوم خط لکھا تھا جو انھیں کشمیر میں ملا تھا

نو نظارۂ گلرخ نگارے دارم — کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بحضورش گزری — عرضۂ دہ شوق کہ در جان فگارے دارم
در بپرسد کہ اگر شوق پیامم دارد — سر فرود آر و زمن گوئے کہ کارے دارم

مولانا شروانی اور مولانا آزاد ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے اس درجہ قریب تھے کہ انھوں نے ان اشعار میں مولانا کو نگار کہا ہے یہ پیار کو ظاہر کرنے کا وہی انداز ہے جیسا کہ غالب اپنے سالے امین الدین خاں کے لڑکے علاؤ الدین خاں کو جانا عالیشانہ اور میر مہدی مجروح کو میری جان کہا کرتے تھے، اس کے جواب میں مولانا آزاد نے لکھا ہے۔

"گلمرگ سے سری نگر آگیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوب منظوم حوالہ کیا کہہ نہیں سکتا کہ اس پیام محبت کو دل دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے جو غالب نے کہا تھا

با چوں توئی معاملہ بر خویش منت است از تو شکوہ تو شکر گزارِ خودیم

دو طبیعتوں کا یہ جھکاؤ ایک خاص ذوق کے دائرہ میں ایک دوسرے کے احترام کے لئے جو لفظ سازی کرتا ہے اسے ایک خاص نسل کی یادگاری حیثیت سے دیکھنا لطف سے خالی نہیں ہے اس کے بعض پیچ و خم آج بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ کافی عرصہ تک اچھے معلوم ہوں، حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی محبت ایک تجربہ تھی مولانا نے محبت کے تجربات آدمیوں سے گزر کر چڑیوں پر بھی کئے تھے لہذا ۷؍ مارچ ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں انھوں نے مولانا شروانی کو لکھا تھا۔

"آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں" دگر با شنیدستی، ایں ہم شنو" یہاں کمرے جو ہمیں ملے ہیں پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں چھت لکڑی کے شہتیروں کے سہارے کے لئے محرابیں ڈال دی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے گزشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے ٹھیک اس کے اوپر نہیں معلوم کب سے ایک پرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا دن بھر سیدان سے تنکے چن چن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں وہ ٹیبل پر گر کے اس کو کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے ادھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا ادھر تنکوں کی بارش شروع ہو گئی پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی اس کے اوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں تھیں"

یہ وہ حالات تھے جن کے باعث مولانا سے گھروں میں گھونسلا بنا کے رہنے والی چھوٹی چڑیوں سے باقاعدہ جنگ ہوئی اس جنگ میں وقتی طور سے مولانا کامیاب ہوئے یعنی انھوں نے اپنے کمرے میں سے ان کو مار کر بھگا دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے دیکھا کہ وہ ان کے کمرے میں ان کی جنگ سے پہلے جس طرح اپنا کاروبار جاری رکھتی تھیں اسی طرح ان کا کاروبار جاری تھا مولانا ان کی اس مضبوطی سے

کافی متاثر ہوئے لہذا انھوں نے مصالحت سے آگے بڑھ کر ان سے محبت کرنے کا پروگرام بنایا اس سلسلہ میں انھوں نے کہا ہے۔

"ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی تو چاہیئے کہ پوری طرح صلح ہو یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح، میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دئے کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی اور اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا لیکن پھر صاف نظر آگیا کہ معشوقان ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے پہلے ایک چڑیا آئی اور ادھر ادھر کودنے لگی بظاہر چھپانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے۔

چہ لطف ہا کہ دریں شیوۂ نہانی نیست عنایتے کہ تو داری بمن بیانی نیست

مولانا نے دانے کے اگاؤ کے ساتھ اپنے دام محبت کو جو چڑیوں پر پھینکا اس کے متعلق انھوں نے جزیات نگاری کا حق پوری طرح ادا کرتے ہوئے چڑیوں کے ناز و غمزے کے مظاہروں سے پیدا ہونے والے اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے وحشی یزدی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا سہارا ذرا تصرف کے ساتھ یوں لیا ہے (چھوٹے چھوٹے محبوبو تم جو اپنی آرزؤں کو چھپا کر میرے سامنے آرہے ہو میں اس سے بہت محظوظ ہو رہا ہوں، تمھاری یہ عنایت وہ عنایت ہے جس کا بیان نہیں کیا جا سکتا ہے اس طرح دانوں کی طرف آنے والی پہلی چڑیا کے انداز نماص کا بیان کرنے کے بعد پھر دوسری چڑیوں کی آمد کا تذکرہ مولانا نے یوں کیا ہے۔

"پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی کبھی دانوں پر نظر پڑتی کبھی دانے ڈالنے والے پر کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے پھر کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے لیکن براہ راست دانوں کی طرف نہیں آئے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدا نخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں دروغ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر بے اختیار ظہوری کا یہ شعر یاد آگیا۔

بگو حدیث وفا۔ از تو با درست بگو   شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

محبت کے اس تجربہ کے سلسلہ میں کتنی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں ان سے مولانا کے فطرت شناسی کے ملکہ پر جو روشنی پڑتی ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے انھوں نے آگے کہا ہے۔

"التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا سلسلۂ کار کی درازی سے اُکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا اور زبان حال سے یہ نعرہ مستانہ لگاتا ہوا یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا۔

زدیم بر صفت رندان و ہرچہ بادا باد!

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک تمام رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی نہ کسی نگاہ میں تذبذب مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا۔ غور کیجئے تو اس کارگاہ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں"

افسانۂ محبت کی اس تفصیل کے ساتھ جرات وہمت کی اہمیت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس قسم کے اشارات مولانا کی تحریروں میں اکثر آتے ہیں، ان کی تہذیبی کشمش میں مولانا کے سیاسی مسلک کا افسانہ چھپا ہوتا ہے اس افسانہ کو پڑھنے والے ہی پڑھ سکتے ہیں اس میں اور بوجھل پروپگنڈہ میں بڑا فرق ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس تجربہ کو مولانا یہاں تک ترقی کی طرف لے جا سکے کہ اس سلسلہ میں ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ان یاران سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا ایک ہلکا سا پردہ حائل رہ گیا تھا چند دنوں میں وہ بھی اٹھ گیا پھر وہاں سے اڑے اور سیدھے پنکھے کے دستہ پر پہنچ گئے پھر دستے سے جو کودے تو کبھی میرے سر کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزت بخشی پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزول اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر ہل گیا تھا، قدرتی طور پر ان آشنایان زود گسل پر ناقدر شناسی گراں گزری ہوگی لیکن یہ جو کچھ ہوا محض ایک اضطراری سہو تھا طبیعت فوراً متنبہ ہوگئی اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بے حس ہو کر رہ گیا کہ منارہ کی چھتری کی جگہ بال خانے کا کام دینے لگا"

مولانا نے محبت کے اس تجربہ کو بڑی دلسوزی اور صبر کے ساتھ بتدریج ترقی کی طرف مائل کیا اس میں ان کی

قوت مشاہدہ نے محبت کے چھوٹے سے چھوٹے اشارہ کو سمجھتے ہوئے اپنے ان چھوٹے چھوٹے دوستوں کی رضا جوئی کے اسباب کی تلاش میں بڑے کامیاب قدم اٹھائے تھے یعنی ایک چڑیا کا پہلی مرتبہ ان کے کاندھے پر بیٹھنا اور ان کا ہل جانا اور پھر اس سلسلہ میں کافی احتیاط برتنا یہ بتاتا ہے کہ انھوں نے اپنی محبت کو اس طرح دیا جس طرح ان کے ان دوستوں سے لینا پسند کیا اور ان کی محبت کو اس طرح لیا کہ ان کی قدیم اور نسلی وحشت میں کوئی ہلکی سی بھی لہر نہ پیدا ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحشت بد اعتمادی کی گرفت سے نکل کر محبت میں ڈوب گئی یہ قربانی اور ضبط غم کا شاہکار تھا اس تجربہ کی ترقی کے سلسلہ میں مولانا نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

"ایک دن میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر تک نہیں رکھا مہمانان باصفا بار بار آئے اور جب سفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا تو ادھر ادھر چکر لگانے اور شور مچانے لگے اب میں نے برتن نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیا اور ہتھیلی صوفے پر رکھ دی جونہی قلندر (ایک چڑا) کی نظر پڑی معاً جست لگائی اور ایک چکر لگا کے انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا اس تیزی میں کچھ تو طبع قلندرانہ کا قدرتی تقاضہ تھا اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا، چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اڑ اڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا اس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ ماردی اور ایسی خار اشگاف ماری کہ کیا کہوں اگر ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہوچکا ہوتا تو یقین کیجئے بے اختیار منہ سے چیخ نکل جاتی"

مولانا کی طبیعت دشوار پسند نے جوانی سے ہی ضبط غم کے ملکہ کی نشو و نما کا بڑا خیال رکھا تھا ورنہ سامراج داد کے جبر و ظلم کے حربوں کو برداشت کرنا ایک کھیل نہیں تھا اسی لئے انھوں نے کہا ہے "کیا کہوں اگر ستم پیشوں کی جور و جفا کا خوگر نہ ہوچکا ہوتا تو یقین کیجئے۔ بے اختیار چیخ نکل جاتی"۔

انھوں نے قلعہ احمد نگر میں لکھے جانے والے اپنے غبار خاطر کے خطوط میں اپنی جنسی محبت پر بھی روشنی ڈالی ہے یہ ہندوستان کی آزادی کے غم کے بوجھ سے دبی ہوئی معلوم ہوتی ہے انھوں نے اس سلسلہ میں ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے خط میں مولانا شروانی کو لکھا ہے۔

"اس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں ان

آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی ۱۹۴۲ء میں جب میں بمبئی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا حال نہیں ہوتا تھا"

غیر ملکی استبداد کا دباؤ مولانا سے گزر کر مولانا کی رفیقۂ حیات کی حساس طبیعت پر بھی اس طرح پڑا تھا کہ مولانا کی بیگم اپنے خطوط میں درد کے اظہار کے بجائے درد کو چھپاتی تھیں لہذا مولانا نے کہا ہے "ان کے خطوط مجھے قید خانے میں ملتے تھے ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا حال نہیں ہوتا تھا" یعنی ضبط غم مولانا ہی نہیں کرتے تھے ان کی تقلید میں ان کی بیگم کو بھی اس کا عادی بننا پڑا تھا، یا یوں سمجھئے کہ مولانا کے اوپر ملک کی آزادی کے غم کا بڑا بوجھ دیکھ کر وہ اس میں اپنے غم کے بوجھ کا اضافہ نہ کرکے مولانا کے بوجھ کو کم رکھنا چاہتی تھیں، ضبط غم کی یہ مشق انھیں بھی مولانا کے ساتھ جوانی سے ہی کرنی پڑی تھی اس سلسلہ میں مولانا نے کہا ہے۔

"وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے، گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا پھر جب روک ہٹالی گئی تو ۱۰ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی اس لئے گھر کے بعض عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا"

ان رجحانات سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے ضبط غم کی کوشش کی جاتی تھی یعنی غیر ملکی استبداد نے دو حساس طبیعتوں کو کس کر دکھ درد کی کہانی سنانے پر براہ راست کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی تو کم از کم کچھ ایسے اسباب ضرور پیدا کر دئے تھے جن کے باعث یہ لوگ اپنا درد ایک دوسرے سے چھپاتے تھے آخر کار مولانا کی

بیگم کا اپنا اور اپنے شوہر کی پریشانیوں کا دوہرا درد بڑھتے بڑھتے ایک دن خطرناک حالت میں پہنچ گیا اس کے متعلق مولانا نے کہا ہے ۔

"جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا لیکن میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی"

حاصل کلام یہ ہے کہ جس حکومت نے مولانا کی بہت سی آرزوؤں کے کچلنے میں کمی نہیں کی تھی اس کے سامنے جنسی محبت کے دباؤ میں آکر کوئی درخواست لے کر جانا مولانا کی خود دار طبیعت نے گوارا نہیں کیا اور وہ اپنے غم کو دبانے کے ظاہری طریقوں کو کام میں لاتے رہے یعنی اس سلسلہ میں انھوں نے کہا ہے ۔

"اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے، میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جیسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا اور اس لئے کھیلتا تھا کہیں اس کے دامن صبر و وقار پہ بے حالی اور پریشانی خاطر کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے"

مولانا نے اپنی جنسی محبت کے دباؤ کو کم کر کے دکھانے کی جو کوشش کی تھی اسے انھوں نے اپنے غرور کی نمائش سے تعبیر کیا ہے وہ اپنی اس کمزوری کے ظاہر کرنے میں ہچکچائے نہیں تھے۔ جہاں تک جذباتی لگاؤ کا تعلق ہے اسے کمزوری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر مولانا کو اس سلسلہ میں یہ بھی تو خیال تھا کہ میری کسی کمزوری کو دیکھ کر استبداد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آجائے آخر کار مولانا کے الفاظ میں ۹ر اپریل کو "زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا" یعنی ۹ر اپریل ۱۹۴۳ء میں ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا لہٰذا انھوں نے اپنی جنسی محبت کے لین دین کے گھاٹے پر خود کو اس طرح مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے ۔

"غور کیجئے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہوتی ہے، میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں مگر اینٹوں کا پژاوہ بھر جاتا ہے، درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں مگر جہاز بن کر طیار ہو جاتے ہیں، سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن ملک کا خزانہ دیکھئے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پا تک بہا دیا مگر سرمایہ دار کی راحت و عیش کا سر و سامان درست ہو گیا ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاریاں اجڑی ہوں گی جبھی تو یہ جھولی معمور ہوئی ہے"

مولانا اسد احمد نگر کے قلعہ کے ماحول کا ذکر جو غبار خاطر میں کیا ہے اس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تین ممبروں کا ذکر بار بار کیا ہے، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود، اور مسٹر آصف علی ان لوگوں کا ذکر اس طرح سے کیا ہے جس میں محبت کی گرمی نہیں پائی جاتی ہے مگر ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کی اردو کانفرنس دہلی کے پنڈال میں پنڈت نہرو داخل ہو کر اسٹیج پر پہنچ چکے تھے تب مولانا آزاد تشریف لائے تھے اسٹیج دو منزلی تھی لہذا مولانا پہلی پر پہنچ کر جب دوسری منزل پر چڑھنا چاہتے تھے تب پنڈت نہرو اٹھے اور انھوں نے اپنی بانہہ کو مولانا کی بانہہ میں ڈال کر سہارا دے کر ان کو اسٹیج کی دوسری منزل پر پہنچنے میں اس طرح مدد کی کہ مولانا اور پنڈت جی کی محبت کے خط و خال پوری طرح نمایاں ہو گئے تھے۔

طرز جنبش زبان و قلم مولانا کی تحریروں میں مانوس عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ بہت سے نامانوس عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے وہ اپنے خطوط میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو "صدیق مکرم" سے خطاب کرتے ہیں جس میں (دال) بلا تشدید کی ہے یہ صدیق عربی میں دوست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے فارسی الفاظ میں ان کے ہندوستانی چلن کو پیش نظر نہیں رکھا ہے مثلاً "ناخوشی" کے لفظ کو انھوں نے اس کے ایرانی چلن کے مطابق استعمال کیا ہے ایران میں ناخوشی کا لفظ بیماری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، انھوں نے چائے اور سگریٹ کے استعمال کی اس ترتیب کا ذکر ایک چائے کا گھونٹ اور ایک سگریٹ کا کش اس طرح کیا ہے "میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا نقش عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا عملی اصطلاح میں اس صورت حال کو علیٰ سبیل التوالی والتعاقب کہئے" اسی طرح عقیم تعبیر تسمیہ، زلال صافی،

سفرہ کرم ۔ کلفات ، یاراں سقف و محاریب تعرف الاشیا ، باضدادہا ، حفیض خاک وغیرہ الفاظ کے استعمال کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ذوق ادب کو دیکھتے ہوئے وہ عوام کو بھول گئے ہیں یا مولانا کی عربی کی مہارت ان کی اردو پر اثر انداز ہو گئی ہے فارسی ترکیبوں کا مولانا کافی استعمال کرتے تھے انھوں نے مضمون آفرینی کے سلسلہ میں فارسی اشعار سے بڑا سہارا لیا ہے وہ کہیں کہیں پر انگریزی الفاظ سے بھی اپنے کلام میں زور پیدا کرتے ہیں مثلاً " امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے وہاں کے اہل ذوق کہتے ہیں کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی اور جیسا کہ قاعدۂ مقررہ ہے اب ان کی تقلید میں یہاں کے اصحاب ذوق بھی " براؤن شوگر کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں میری یہ پیشین گوئی لکھ رکھئے کہ عنقریب یہ براؤن شکر کا ہلکا سا پردہ بھی اُٹھ جائے گا اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائے گی یاران ذوق جدید کہیں گے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے نہ کافی فرمائیے اب اس کے بعد کیا باقی رہ گیا ہے جس کا انتظار کیا جائے ''

یہاں پر مولانا نے تقلید کے خلاف طنز کے تیر سر کئے ہیں ان کا یہ خیال تھا کہ گڑ ، معمولی شکر اور چینی کے اندر مادی نکھار کے اعتبار سے جو فرق پایا جاتا ہے بلحاظ ترقی اس فرق کی اہمیت کو بھول جانے سے بدذوقی کا پہلو نکلتا ہے خوش ذوقی کا پہلو نہیں نکلتا ہے اسی لئے انھوں نے ہندوستان کے ان اصحاب ذوق پر مسکرانے کی کوشش کی ہے جن کی ذہنی کشادگی نقالی کے اس بانکپن کی طرف جھکنے میں تصور ترقی کو بھلا بیٹھی تھی ان کی یہ طنز ان کے دور کے معیاری لوگوں کی ذہنی خصوصیات کو اپنی زد میں لے لیتی ہے انھوں نے ایک جگہ چینی چائے کے استعمال کے بارے میں کہا ہے " ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ دہائٹ جیسمین کہلاتی ہے یعنی یاسمن سفید یا ٹھیٹ اردو میں یوں کہئے گوری چنبیلی ۔

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اتنا ہی کیف تند و تیز ہے رنگت کی نسبت کیا کہوں ؟ لوگوں کے آتش سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے ۔

مے میان شیشہ و ساقی نگر آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھئے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں ملا محمد مازندرانی صاحب بت خانہ نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خانخاناں کی خانہ ساز شراب کی

مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا ۔

نمی ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب　　　　توگوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

جس چینی چائے کو مولانا پیتے تھے اس کے انگریزی نام وہائٹ جیسمین کا استعمال انھوں نے ایک خاص طبقہ کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے پھر اس کو یاسمن سفید کہا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ایک اوپر کی سیڑھی سے نیچے کی سیڑھی کی طرف آئے مگر وہ عوام تک پہنچنا چاہتے تھے لہذا انھوں نے کہا ہے ٹھیٹ اردو میں یوں کہئے "گوری چنبیلی"

مولانا کا بلحاظ اسلوب ایک خاص طبقہ سے بتدریج عوام تک پہنچنے کا یہ طریقہ کافی بھلا معلوم ہوتا ہے پھر اس سلسلہ میں مولانا کی نظر غالب کی آتش سیال پر گئی ہے وہ اس سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے اور وہ اسلوب بیان کی ترقی کی دھن میں آگے بڑھتے ہوئے کہتے ہیں" میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں" چنانچہ وہ اپنے بلوریں فنجان میں" سورج کی کرنیں حل کر کے گھول دینے کی تعبیر سے مطمئن ہوتے ہیں انھوں نے بعض پیچیدہ مطالب پر روشنی ڈالنے کے لئے اشعار کا جو استعمال کیا ہے ان سے ان کے اسلوب بیان کی ترقی کے متعلق یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے کن بزرگوں سے استفادہ کیا ہے یعنی ملا محمد مازندرانی کے اس شعر سے ۔

نمی ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب　　　　توگوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا نے آفتاب کی کرنوں کو چینی چائے میں گھلا ہوا پایا ہے اور ملا نے شراب میں آفتاب کو گھلا ہوا پایا ہے اسی چائے کے سلسلہ میں مولانا نے کہا ہے ۔

"یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شایق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دور واقع ہوئی ہے؟ عمریں گزر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی کہاں چائے کے ذوق لطیف کا شہرستان کیف و سرور اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پری کی نگری"

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق　　　　رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں خواص یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی لیپچوہی کی

قسموں پر قانع رہتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بے سود تھا بلکہ وضع الشئی فی غیر محلہ"

یہاں پر مولانا غالب کے رنگ میں پوری طرح ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں یعنی شاہراہ عام پر چلنے کو اکثر غالب نے بھی اچھی طرح نہیں دیکھا تھا دودھ دہی اور چائے کے اجزا کی افادیت سے بلند ہو کر ان کی لطافت سے بحث کرتے ہوئے چائے کے ذوق لطیف کو انھوں نے شہرستان کیف و سرور کہا ہے اور دودھ دہی کو شکم پری کی نگاہ سے ان نعمتوں کا وزن مادی افادیت کے اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو مگر زور کلام کے اعتبار سے ضرور اہمیت رکھتا ہے۔ اسی چائے کے سلسلہ میں انھوں نے کہا ہے۔

"ان حضرات میں صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں مگر یہ بھی چنداں بری نہیں زمانہ کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے یہ ان کی صرف اچھی ہے کہ داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انھیں بلا لیا کرتا تھا کہ آئیے ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجئے"

"اس اچھی ہے" کے ہلکے پھلکے عوامی لفظوں میں مولانا کے اسلوب بیان کی روح پڑ جانے کے باعث جو لطافت پیدا ہو گئی ہے وہ ذوق سلیم پر احسان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، یہ اشارات فن کی وہ کرشمہ سازیاں ہیں جن سے مولانا کے بعض فقرے، فقرے ہو جاتے ہیں مثلاً

"لیکن جونہی اس کی سوئی ہوئی خودشناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرند ہوں اچانک قالب بیجان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی"

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن　　　حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی

گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا غور کیجئے تو یہی چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے"

مولانا نے اس فقرہ میں خودشناسی کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالنے کے لئے جو لفظ سازی کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور حرارت کے سوتے ان کے ذہن سے پھوٹ نکلے ہیں انقلاب کی کہانی سنانے کے لئے

اس کہانی کو لوگوں نے سامراج داد اور فرقہ پرستی کی سازشوں کے باعث اس طرح نہیں سنا جس طرح سننا چاہئے، حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا معمولی فقروں میں بڑی جان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان کے اسلوب بیان میں فارسی ترکیبیں اور فارسی اشعار بڑی خوبی کے ساتھ گھلے ہوئے ہیں انھوں نے خواجہ حافظ، عرفی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب وغیرہ سے کافی فائدہ اٹھایا ہے مثلاً۔

"وقت وہی ہے مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی"

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

یہاں پر غالب کے شعر سے کام لے لیا، اسی طرح چڑیوں کے چاول کے دانوں کی طرف آنے کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا ہے۔

"پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے لیکن براہ راست دانوں کی طرف نہیں، آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ غدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں دروغ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر بے اختیار ظہوری کا شعر یاد آ گیا"

بگو حدیث وفا، از تو با ورست بگو — شوم فدائے دروغ کہ راست مانند ست

یعنی راست مانند کی ترکیب کو مولانا نے اپنے اسلوب بیان میں حل کر لیا اسی طرح انھوں نے ایک جگہ کہا ہے "ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے ادھر موسم ختم ہوا ادھر انھوں نے بھی دنیا کو خیرباد کہہ دیا گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن ان کے حصے میں آیا تھا وہ کفن کا بھی کام دے گیا میر مبارک اللہ واضح عالمگیری کو بھی خیال پانی کا بلبلہ دیکھ کر ہوا تھا دیکھئے کیا خوب کہہ گیا ہے"

رشک فرمائے دلم نیست بجز عیش حباب — یافت یک پیرہن ہستی و آں ہم کفن ست

یعنی جو پیرہن زندگی میں کام آتا تھا وہی کفن بن گیا یہ تصور میر مبارک اللہ نے حباب کے لئے استعمال کیا ہے اور مولانا نے پھولوں کے لئے فارسی ترکیبوں اور فارسی اشعار سے قطع نظر کرتے ہوئے مولانا کا عوامی زبان میں بھی اپنے مفہوم کو ادا کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا تھا۔

"دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اس دنیا میں جو قید خانے کے اندر تھی برسوں کی مسافت حائل ہوگئی"

اپنے ایک ریل کے سفر کے سلسلہ میں انھوں نے کہا ہے

"رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں نہ سکون سے آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا"

مختلف اسالیب کے استفادے، فارسی ترکیبوں اور عوامی انداز بیان سے ہٹ کر دیکھا جائے تو مولانا کے اسلوب بیان میں انانیت کا بھی ایک مقام ہے غبار خاطر انانیتی ادب میں شامل ہے اس میں بعض مقامات پر ان کی میں کا ابھار ذہنوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمود کے ایک تجربہ کا ذکر ملاحظہ ہو ۔

"یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں دن بھر ان کا شور وہنگامہ برپا رہتا ہے چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیئے ممکن ہے گوریاؤں کی زبان حال نے انھیں توجہ دلائی ہو جیپرہ میں ایک مرتبہ انھوں نے مرغیاں پالی تھیں دانہ ہاتھ میں لے کر آ آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتی یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے کہنے لگے عجیب معاملہ ہے دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانہ کی پیشکش بھی جرم ہوا ۔

"میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوۂ ناز کی تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے نیاز و عشق کے دعووں کے ساتھ ناز حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں، یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی دو تین جوڑے آ نکلتے ہیں اور اپنی غزغزاور چیو چیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو داسوخت پڑھا مگر ان آہوان ہوائی کے لئے دام ضیافت بچھا دیا اور صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کر کھڑے ہوتے پھر جہاں تک حلق کام دیتا آ۔آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے یہ صلائے عام میناؤں کو ملتفت نہ کرسکی

البتہ شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کووں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کردیا میں نے کووں کو شہرستان ہوا کا دریوزہ گر اس لئے کہا کہ کبھی انھیں مہمانوں کی طرح کہیں جانے دیکھا نہیں طفیلیوں کے خوان میں بھی بہت کم دکھائی پڑے ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازہ پر پہنچے صدائیں لگائیں اور چل دیئے۔

بہرحال محمود صاحب آ آئے تسلسل سے تقاضے کرتے منی مرتبہ یہ دریوزہ گران کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کرکے رکھ دیتے محمود صاحب کے صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کووں کی رد غن چوک برابر جتی رہتی تھی اب جو ان کا دسترخوان ارم بچھا تو نقاروں پر بھی چوٹ پڑ گئی ایک دو دن تک لوگوں نے صبر کیا آخر انہیں کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دست کرم کی بخشش رک نہیں سکتی تو کم از کم چند دنوں کے لئے ملتوی کر دیجئے ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور ہی کر رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا ایک دن صبح کو کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمر مینا کدھر سے تشریف لے آئے ہیں معلوم ہوتا ہے ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد محمود صاحب پر بھی باایں ہمہ جود و سخائے عام گراں گزری کہنے لگے بزرگوں نے کہا ہے کہ دوں کا آنا منحوس ہوتا ہے بہرحال ان حضرات کے بارے میں بزرگان سلف کا کچھ بھی خیال ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لئے بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ ادھر ان کا مبارک قدم آیا اور محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا"

اس سلسلہ میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ گوریاؤں اور جنگلی میناؤں کے متعلق قلعہ احمد نگر میں ڈاکٹر سید محمود نے اور چڑے چڑیوں کے متعلق مولانا نے تجربہ کیا تھا مولانا نے پہلے ڈاکٹر محمود صاحب کے تجربے کا ذکر کیا ہے اور اپنے تجربہ کا بعد میں ذکر کیا ہے لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود صاحب کے تجربہ کی کمیوں کو پوری طرح پیش نظر رکھ کر انھوں نے چڑیوں کے متعلق تجربہ کیا تھا انھیں محمود صاحب کا اپنے تجربہ میں ناکام ہو کر بیٹھ رہنا یاد تھا، انھوں نے محمود صاحب کو یہ نصیحت بھی کی تھی" میں نے کہا طلب دنیا نہ کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوۂ ناز کی تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے نیاز عشق کے دعووں کے ساتھ ناز حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں"
اس نصیحت میں محمود صاحب کو یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ آپ نے ان کی وحشت کا جائزہ لینے میں کمی کی ہے ورنہ

ہوسکتا ہے کہ آپ ناکام نہ ہوتے اس کے بعد انھوں نے محمود صاحب کے گوریاؤں کے تجربہ کی ناکامی پر جو روشنی ڈالی ہے وہ محمود صاحب کو زیرِ لب مسکراہٹ کی زد میں لاتے ہوئے ڈالی ہے یعنی "محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا" پھر جنگلی میناؤں کے تجربہ کی پوری تصویر کھینچ دی ہے "مگر ان آہوان ہوائی کے لئے دامِ ضیافت بچھا دیا روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کر کھڑے ہوتے جہاں تک حلق کام دیتا آ۔آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے یہ صلائے عام میناؤں کو ملتفت نہ کر سکی"

محمود صاحب کی ناکامی کی اس تصویر میں "صلائے عام" کا رنگ کافی شوخ ہے یہی نہیں اس سلسلہ میں جو ایک دوسری واردات کوؤں کی ہوئی تھی اس کے متعلق مولانا نے اپنے خاص انداز میں کہا ہے "البتہ شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا" محمود صاحب کے تجربہ ... کوؤں کے مبارک رشتہ کا قائم ہونا محمود صاحب کی ناکامی کی پہلی منزل تھی دوسری منزل کی طرف وہ اس طرح بڑھے "بہرحال محمود صاحب آ۔آ کے تسلسل سے تھک کر جونہی مڑتے یہ دریوزہ گران کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے" تیسری منزل میں ان کے مزاحیہ الفاظ کا زور کافی بڑھ گیا "محمود صاحب کے صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوؤں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی برابر بجتی رہتی تھی اب ان کا دسترخوان کرم بچھا تو نقار دل پر بھی چوٹ پڑ گئی" مولانا کے زورِ بیان نے یہیں پر بس نہیں کی بلکہ پوپلے ماہِ دل کی احتجاجی انگلیوں کا محمود صاحب کی ناکامی کی طرف اٹھنے اور اس سے آگے بڑھ کر حمیت کی منذیر پر دو دو معمرِ ومشین گدوں کی تشریف آوری وغیرہ کے متعلق جو اشارات ہیں ان کو اور مولانا نے اپنے چڑیوں اور چڑوں کے تجربہ کی ترقی کے متعلق جو اشارات کئے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو محمود صاحب کا تجربہ کافی بھیانک معلوم ہوتا ہے، ایک طرف اس بھیانک پن کی نمائش اور دوسری طرف اپنے سلیقہ کی نمائش میں مولانا کی انانیت صاف ابھری ہوئی نظر آتی ہے غبارِ خاطر میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں مولانا کی انانیت شوخیوں کی طرف مائل نظر آتی ہے مگر یہاں پر ایک مثال اسی طرح کی اور پیش کی جاتی ہے۔

"دوسرے دن صبح برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ بلبل کے ترانے کی آواز پھر اٹھی میں نے ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سننا بلبل کی آواز آ رہی ہے ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ دیر کے لئے رک گئے اور کان لگا کر سنتے رہے پھر بولے کہ ہاں قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے۔"

خدارا انصاف کیجئے اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دئے جائیں کہ ایک میں تو بلبل کی
نوائیں بسی ہوئی ہوں دوسرے میں جھنکار ہے کے پیسوں کی رہیں بسی ہوں تو آپ اسے کیا کہیں گے "

مولانا کے ذوق جمال کے ساتھ جو یہ حادثہ ہوا اس سے بے چین ہو کر ان کی انانیت ابھری ہوئی معلوم ہوتی ہے لہذا انھوں نے ان صاحب کے ذوق جمال کا پورا کارٹون تیار کر دیا ہے، یہ تو مولانا کی جنبش قلم کی کیفیت ہے اب مولانا کی جنبش زبان کے متعلق سنئے ۱۹۵۲ء ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "حکومت کی خارجہ پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے ایسی زبردست تقریر فرمائی جیسی کہ اس جلسہ میں کوئی دوسری تقریر نہ تھی انھوں نے اس قدر سادہ اور صاف اردو میں تقریر فرمائی کہ یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ کہاں تک ان کی زبان اردو تھی اور کہاں سے اس کو ہندی سمجھا جائے .. .. تقریر کے اختتام پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے "

یہ مولانا کے انداز بیان کی ترقی کا وہ مقام تھا جس کے متعلق غالب نے یہ کہا ہے ..

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالنا کہ وہ حقیقت پوری طرح جگمگانے لگے یہ عمل فن تقریر کی اس بلندی کا پتہ دیتا ہے جہاں زبان ولفظ کا افسانہ ایک افسانہ ہو جاتا ہے ۔

مولانا کی اس قسم کی تقریریں ہندوستان کے لسانی مسائل کے سلجھانے کے متعلق جو اشارات کرتی ہیں وہ ہم سے سائنٹفک انانیت کے ٹکراؤ کی تلخ روایات کی کثافت سے دامن بچانے کا مطالبہ کرتے ہیں یعنی ایک جمہوری ملک میں وقت کے اہم تقاضوں کو پوری طرح محسوس کرنا اور عوام کو ان تقاضوں کو محسوس کرنے کے لئے آمادہ کرنا اس صحت مند قومی تصور پر موقوف ہوتا ہے جو جذبات و رجحانات کو سلیقہ سے پیش کرنے اور تھوپنے کے طریقوں کے ہلکے سے ہلکے فرق سے آشنا ہوتا ہے، مولانا کے قومی تصور کی صحت اس درجہ نمایاں تھی کہ اس کے متعلق شک [illegible] مولانا کے سامنے ابھر کے بات کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے تھے چنانچہ مارچ ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ میں مولانا پر کچھ ایسے اعتراضات ہندی کے چلن کے سلسلہ میں کئے گئے جو مولانا کے قومی تصور کی صحت کی حدود پر اچھے اشارات نہیں کرتے تھے۔ سیٹھ گوبند داس نے وزارت تعلیم پر یہ اعتراض کیا کہ وہ "بھارتی" ہو گئی ہے ہماری زبان یکم اپریل [illegible] اسی طرح ٹنڈن جی نے مرکزی وزارت تعلیم پر یہ اعتراضات کئے کہ "اس نے ہندی کی اشاعت کے لئے صحیح پالیسی اختیار نہیں کی" اور وہ "ہندی ساہتیہ سمیلن کی کوئی ہمت افزائی

نہیں کرتی" اس کے برخلاف "ہندوستانی پرچارنی سبھا اور شبلی اکاڈمی وغیرہ کو انہوں نے امدادیں دی ہیں۔ ان اعتراضات کے وزن پر مولانا نے گرم لہجہ میں مختلف طریقوں سے روشنی ڈالتے ہوئے اپنے قومی تصور کی صحت کی طرف یہ اشارہ کیا تھا "میری عمر اٹھارہ یا انیس سال کی تھی جب میں بنگال کی قومی تحریک میں شریک ہوا تھا اس دن سے آج تک تمام دنیا کے سامنے میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب رہی ہے میرے دل میں اب کوئی تمنا نہیں ہے میری زندگی کا بہترین حصہ گزر چکا کچھ باقی ہے اور میں نہیں جانتا کہ کب وہ بھی ختم ہو جائے پھر کوئی شخص کیا چاہے جبکہ اس کی کوئی خواہش باقی ہی نہ رہی ہو۔"

ٹنڈن جی اور سیٹھ جی کے اعتراضات سے مولانا کے ذہن میں جو غصہ کی لہر آئی اور اس لہر کا مظاہرہ جوان کے الفاظ کی نشست و برخاست سے ہوا اسے ایک کمی تسلیم کرتے ہوئے بھی مولانا نے ٹنڈن جی اور سیٹھ جی کے اعتراضات کے کھوکھلے پن اور اپنی کتاب زندگی پر جو روشنی ڈالی وہ ایک ایسی روشنی تھی جس سے پارلیمنٹ کے ممبران کے سامنے مولانا کے قومی تصور کی صحت پوری طرح چمک اٹھی تھی، مولانا نے ہندی پریمیوں سے ان کے پریم کے تاریک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس قسم کا رجحان ہندی سے محبت ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بعض لوگ علاقائی زبانوں کی ترقی کے مخالف ہیں۔ میں ہندی کے پریمیوں سے کہوں گا کہ اپنا سر اونچا رکھو لیکن دوسروں کی ترقی کو اس خواہش کے ساتھ روک کر بڑا بننے کی کوشش نہ کرو کہ وہ تمھارے سامنے بالشتئے نظر آئیں"

مولانا نے جس طرح ہندی کے پریم کو صحت مند بنانے کے لئے یہ رجحانات پیش کئے ہیں اسی طرح ہندوستان کے قومی تصور کو صحت مند بنانے کے لئے ذہنی تنگی کی تنقید اس طرح کی ہے۔

"مسلم لیگ ہی تقسیم کی ذمہ دار ہے .... ایسے ہی خیالات والے لوگ تھے جنھوں نے تقسیم کرائی یہ اس لئے کہ جو دل تنگ ہوتا ہے اس میں کسی دوسری چیز کے لئے جگہ نہیں ہوتی قدرتاً جو لوگ اہل ملک کے درمیان تفریق پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے انھوں نے اس تنگ دلی سے فائدہ اٹھایا، ایوان کو معلوم ہے کہ میں نے ملک کے اتحاد پر اس حملہ کا کس طرح مقابلہ کیا تھا، ایوان کو وہ انقلاب بھی یاد دلاتا ہوں جو میں نے لاکھوں مسلمانوں میں پیدا کیا تھا"

ان رجحانات میں فکری و جذباتی اعتبار سے جو توانائی ہے اس کی اہمیت سے انکار کرنے کی تاب کس میں ہو سکتی ہے۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

مولانا ابوالکلام آزاد کی پہلی تقریر

از فوقانی بن شوق نیموی

حضرت شوق نیموی مرحوم رسالہ سیر بنگال مطبوعہ پٹنہ احسن المطابع میں تحریر فرماتے ہیں ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۱۹ھ کو ایشیاٹک سوسائٹی کی بعض کتابیں دیکھنے کو ڈاک پر میں عظیم آباد سے کلکتے روانہ ہوا۔ کلکتے پہونچ کر میں ان کتابوں کے مطالعہ سے مشرف ہوا پھر چند مقامات کی سیر کی۔ ۱۱ محرم کو مچھوا بازار میں باہتمام جناب ماسٹر تصدق حسین صاحب ایک اردو لائبریری قائم کرنے کی غرض سے ایک جلسہ قائم ہوا جس کا میں صدر انجمن بنایا گیا۔ جناب مولوی غلام حسین صاحب آہ و مولوی غلام محی الدین صاحب آزاد وغیرہ نے نہایت ہی سلاست کے ساتھ اغراض جلسہ کو بیان فرمایا۔ پھر ۲ کو ایک صاحب نے کولو ٹولے میں مشاعرہ کر دیا اور میری شرکت کے لیے بہت اصرار کیا ہر چند میں نے یہ عذر کیا کہ اب میں مشاعروں میں شریک ہوتا ہوں اور نہ مجھے شاعری کا اب کچھ شوق ہے۔ مگر انھوں نے ہرگز نہ مانا مجبوراً مجھے شریک ہونا ہی پڑا۔ مجمع بہت ہی اچھا تھا۔ جب میری نوبت آئی تو حضرات حاضرین کمال قدردانی سے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ہر شعر پر واہ واہ کی وہ صدائیں بلند ہوئیں کہ لکھنؤ کے شاعروں کا سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ راقم سطور محمد عبدالرشید فوقانی بن شوق نیموی کہتا ہے کہ مولانا شوق نیموی کا وصال بروز جمعہ ایک بجکے دس منٹ پر ۱۷ رمضان شریف ۱۳۲۲ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ء ہے اس حساب سے ۱۱ محرم ۱۳۲۰ھ تقریباً ۱۹ مارچ ۱۹۰۲ء ہوتا ہے لہٰذا مولانا آزاد مرحوم کی اولین تقریر مولانا شوق نیموی کی صدارت میں بمقام کلکتہ ۱۱ محرم کو تخمیناً دو برس نو ماہ قبل وصال مولانا شوق نیموی واقع ہوئی۔ اخبار ہند روزنامہ کلکتہ مورخہ ۱۰ شعبان ۱۳۷۷ھ میں بحوالہ تیج اخبار صفحہ چار کالم تین سطر چھ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ قول منقول ہے۔ سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۲ء میں کی اس وقت عمر پندرہ سال تک پہونچی تھی غالباً دوسرے سال انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ احقر محرر سطور فوقانی بن شوق نیموی عرض کرتا ہے کہ جو تقریر کہ مولانا آزاد مرحوم نے ۱۹۰۲ء میں کی ہے اس سے بھی اولین تقریر ۱۹۰۲ء میں بمقام کلکتہ ۱۱ محرم ۱۳۲۰ھ کو صدارت مولانا شوق نیموی میں بھائیوں کی واقع ہوئی جیسا کہ رسالہ سیر بنگال مؤلفہ مولانا شوق میں مرقوم ہے۔ بندہ فوقانی کہتا ہے کہ ہم مارچ ۱۹۵۲ء میں بہ تاریخ کلکتہ مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم آپ کے آنے سے بہت خوش ہوئے آپ کے والد مرحوم ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری دیکھنے آئے تھے اور میرے والد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے میرا سن دس پندرہ چودہ برس کا تھا اسی سال ہم فارغ التحصیل ہوئے تھے میں نے مولانا شوق کو ایک غزل کہہ کر دکھائی تھی۔ مولانا نے دیکھ کر فرمایا تھا کہ یادگار وطن میں ہم سو جنگی کی بحث مولانا نے خوب لکھی ہے۔

از شوق امرتسری
مدیر نارون لاہور

آہ

علامہ ابوالکلام محی الدین احمد آزاد

مولانا آزاد (خدا انھیں غریق رحمت کرے) میرے ہم عصر ہی نہیں بلکہ میرے ہم عمر اور ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۹ء تک میرے ہم نشین بھی تھے۔ میں اور حسن الدین خاموش اُن دنوں "وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر" سے وابستہ تھے اور آپ مولانا عبداللہ العمادی کے ساتھ اخبار وکیل امرتسر کے شعبہ ادارت سے منسلک تھے۔ یہ آپ کی ادبیت کا ابتدائی دور تھا۔ چنانچہ امرتسر کے نظارے سے متاثر ہوکر "دن کا دربار" نام سے آپ نے ایک کریکٹ لکھا تھا۔ جو وکیل بکڈپو کی طرف سے شائع بھی ہوا تھا۔ اب شاید ناپید ہے۔

اخبار وکیل کے زمانہ ادارت سے ہی آپ کی ادبی بلکہ سیاسی شہرت کا بھی آغاز ہوا۔ جو کلکتہ سے اسلامیت میں جذب ہوکر الہلال کی صورت میں آسمان صحافت پر نمودار ہوا۔

آپ صاحب اثر مقرر۔ باکمال انشاپرداز۔ پرجلال مبصر۔ باوقار مورخ۔ خوددار سیاست داں اور قدیم و جدید علم و عمل کے پیکر تھے۔

محترمی آل احمد سرور مدیر "ہماری زبان" نے اپنے اداریہ میں کیا خوب لکھا ہے

ایک مولانا گئے اور ہاتھ سے کیا کیا گیا

"اُس کی زندگی بڑی شاندار اور بھرپور تھی۔ اُس کی موت بھی بڑی باوقار اور جلیل ہوئی۔ وہ ملک و قوم کی خاطر جیا اور اسی کی خاطر اُس نے جان دی۔ شروع سے آخر تک وہ وضعدار رہا۔ ایمان و عاشقی دونوں کو اُس نے سربلند کیا۔

جب تک وہ ہم میں موجود تھا تو ہمارے پاس کیا کچھ نہیں تھا اور اب جبکہ وہ ہم سے جدا ہوگیا ہے تو ہم نے کیا کیا نہیں کھو دیا ہے۔"

میں شاہد ہوں کہ انھوں نے اپنوں کے ساتھ غیروں کی بھی رہنمائی کی۔ اس رہنمائی میں نظربندیوں۔ گرفتاریوں کے علاوہ ان کو اپنی اقتصادی مشکلات و مصائب کا جس قدر سامنا کرنا پڑا وہ انھیں کا دل گردہ تھا۔ اُن کی علمی۔ ادبی۔ سیاسی خدمات کو تو چھوڑیے صرف رشحات الہلال کی ایک ایک سطر سے بیسیوں پبلشروں نے لاکھوں روپے پیدا کئے لیکن وہ خود تقسیم ہند و ہند تک تہی دست رہا۔

افسوس وہ زندگی بھر اپنوں کی طنز و تعریض کا نشانہ بنا رہا۔ حالانکہ ادب و سیاست قطع و نظر کرنے پر بھی اُن کی اسلامی خدمت ترجمان القرآن وہ شہ کار اسلام ہے جس کے اظہار تشکر سے تمام دنیائے اسلام عہدہ برآ ہونے سے قاصر ہے۔

لہٰذا مسلمانوں پر بھی تو مولانا مرحوم کی اس خدمت تبلیغ اسلام کا حق پہنچتا ہے؟

میں شکر گزار ہوں۔ پنڈت نہرو وزیر اعظم ہندوستان کا۔ جنھوں نے اپنے مخدوم کی علمی و قومی خدمت کے ادا کرنے کا یہ اعلان کر دیا ہے۔

"ساہتیہ اکاڈمی مولانا کی ساری تصانیف اسی خوبصورت زبان (اردو) میں جس انھوں نے شاندار اور خوبصورت اور مضبوط بنایا۔ چھاپے گی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوگا۔ بلکہ چند یونیورسٹیوں میں ان علوم کے مطالعے کے لئے جن سے مولانا کو شغف تھا پروفیسر مقرر کئے جائیں گے۔"

آپ کو اپنی زبان اردو سے تو انس تھا ہی۔ پنجابی زبان سے بھی شغف تھا۔ بالخصوص ہم سے (یعنی مجھ سے اور شیخ عبدالرحمٰن نو مسلم سے) پنجابی زبان ہی میں بات کرتے تھے۔ بلکہ ہم کو بھی پنجابی زبان میں ہی بات کرنے کی اسلئے تاکید کیا کرتے تھے تاکہ وہ پنجابی کے ٹھیٹھ الفاظ اور محاورے خود بھی یاد کر سکیں۔ چنانچہ ایک روز میں پان اور مٹھائی لینے بازار جانے لگا۔ ساتھ دفتر سے اٹھے تو دریافت کیا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟ ... اس پر فرمایا ... بھئی یہ کیوں نہیں کہتے ... جا رہے ہیں۔

اللہ اللہ کتنے ذی علم۔ کیسے باوقار کس قدر صاحب ایثار انسان تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

پے یام اللہ ۵

فن اخبار نویسی

مخزن جلد ۲ نمبر ۲ مئی سنہ ۱۹۰۲ء

(از مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ)

یورپ اور امریکہ نے جو آج کل حیرت انگیز ترقی کی ہے اور علوم و فنون، تہذیب و شائستگی میں جو ان کا آج طوطی بول رہا ہے اُن میں من جملہ اور اسباب ترقی کے ایک بڑا سبب اخبار دیکھنا ہے جسے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اور بچے سے لے کر بوڑھے تک روزانہ ہر ایک دیکھا کرتا ہے اور علمی عملی فیوضات حاصل کرتا ہے چونکہ کچھ عرصہ سے ہندوستان اور پنجاب میں بھی اخباروں کا چرچہ ہو رہا ہے۔ اکثر اُردو اخبارات ترقی کر رہے ہیں لوگوں کو ایک حد تک اُن سے دلچسپی بھی ہوگئی ہے اس لئے ہم اس فن کی مختصر تاریخ اور اس کے اقسام و شرح بیان کرتے ہیں

اخبار کا موجد

اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ اخبار کا موجد کون ہے چین والے اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ایجاد کرنے والے ہم ہیں روما والے مدعی ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے کئی سال پیشتر ہم نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ تمام باتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتیں۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع اہل چین یا اہل روما اس کے موجد ہیں اور سینکڑوں برس پہلے یہ شائع کر چکے ہیں تو بھی ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ ہم جس اخبار کا بیان کر رہے ہیں اور اخبار سے جو مفہوم بالفعل سمجھا جاتا ہے اس میں اور اس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے وَالشتان بینهما۔

اخبار جب ہی اخبار ہو سکتا ہے جبکہ اس کے مقصد لکھنے اشاعت کی غرض سے موجود ہوں اور ساتھ ہی

مختلف مقامات میں بھیجنے کے آسان وسائل کیا ہوں اور یقیناً اس زمانے میں یہ تمام باتیں مفقود تھیں نہ تو مطبع تھا کہ دس چھوڑ ہزار نسخے بہم ہو جائیں۔ اور نہ یہ انتظام ریل تھا کہ جہاں چاہیں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک چیزیں بھیج دیں۔ اس لئے اس زمانے کے اخبار پر اخبار کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ پس اخبار جب ہی سے اخبار ہو سکتا ہے جب سے کہ چھاپہ ایجاد ہوا ہے اس اعتبار سے اس چیز کی ایجاد کا سہرا اہل جرمن کے سر باندھنا چاہئے جنہوں نے پندرھویں صدی عیسوی میں پہلا اخبار دنیا میں پیش کیا اور ہمارے نزدیک پہلے پہل یہیں اخبار شائع ہوا۔ والعلم عند اللہ۔

انگلستان

انگلستان میں پہلے پہلے اخبار ۱۶۲۲ء میں جاری ہوا یہ وہی اخبار ہے جو آج کل ٹائمز کے نام سے شائع ہوتا ہے پہلے اس کا نام ویکلی نیوز تھا پھر ۱۷۸۵ میں ڈیلی یونیورسل کے نام سے شائع ہوتا رہا اب ۱۷۸۸ء سے ٹائمز کا نام اختیار کر چکا ہے اس کے بعد ٹیٹلر وغیرہ اسٹیل اور اڈیسن نے شائع کئے اور پھر گویا یہ راستہ سبھوں کو معلوم ہو گیا لیکن اصل اس کی داغ بیل انگلستان میں ویکلی نیوز نے ہی ڈالی۔

فرانس

فرانس میں پہلا اخبار ۱۶۳۱ء میں شائع ہوا۔ جس کا نام گزٹ دی فرانس تھا اس میں زیادہ تر ملکی معاملات پر بحث ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے اخبار شائع ہوئے۔ لیکن ابتدا میں فرانس سے ۱۶۳۱ء ہی کو اخبار نکلا۔

روس

روس میں پہلا اخبار ۱۷۰۳ء میں شائع ہوا۔

امریکہ

یہ کون نہیں جانتا کہ جو ترقی امریکہ نے اخبارات میں کی ہے وہ یورپ کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ بڑی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اخبار یہاں پہلے پہل ۱۷۰۴ء کو شائع ہوا اس کا نام بوسٹن نیوز لیٹر تھا اور اس کا دفتر شمالی امریکہ میں تھا

اس کے قبل اخبار کو اہل امریکہ جانتے بھی نہ تھے کہ اخبار کیا چیز ہے آج جو ترقی امریکہ کو نصیب ہوئی ہے وہ بہت کچھ اخبار ہی کی بدولت ہے۔

اخبار کی قسمیں

یورپ میں جہاں اس مفید اخبار نویسی نے اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے اخبار کی بہت قسمیں ہوگئی ہیں اور ہر ایک قسم کے اخبار ایک نہیں سینکڑوں شائع ہوئے ہیں مگر اس کے مفید اقسام اور اعلیٰ مضامین یہ ہیں:۔

اقسام	مضامین
گزٹ۔میگزین، ریویو جرنل وغیرہ	مذہبی، تعلیمی، تجارتی، قومی، ٹیکنیکل وغیرہ

اخبار کی تعریف

چونکہ اخبار کے بانی اور موجد اہل یورپ ہیں اس لئے ان کی تعریف ہمارے نزدیک معتبر ہے۔

اخبار جمع ہے خبر کی۔خبر کو انگریزی میں نیوز کہتے ہیں۔نیوز میں چار حرف ہیں

N (این)، E (ای)، W (ڈبلیو)، S (اس)

یہ چار حرف ان چار لفظوں کا اشارہ کرتے ہیں

(۱) N (اشارہ ہے) NORTH کا جس کے معنی ہیں شمال

(۲) E (اشارہ ہے) FAST کا جس کے معنی ہیں مشرق

(۳) W (اشارہ ہے) WEST کا جس کے معنی ہیں مغرب

(۴) S (اشارہ ہے) SOUTH کا جس کے معنی ہیں جنوب

اب دیکھو کہ اس چھوٹے سے جملہ میں کتنی بڑی وسعت ہے کہ جہات اربعہ کو لئے ہوئے ہے پس اخبار کی تعریف یہ ہوئی کہ " وہ مجموعہ اک وقت معینہ پر شائع ہونے والا جس میں مغرب مشرق، جنوب شمال کی تمام خبریں اور ان جہات اربعہ کے متعلق مفید باتیں درج ہوں۔

اخبار کے فوائد

ناظرین! کیا اخبار کے سوا دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی ایسی دور بین ہے جس سے آپ دنیا کو اپنا منظر

بنا سکیں؟ اور کیا اخبار کے سوا کوئی اونچے سے اونچا بلند مقام یا کوئی پہاڑ ہے جس پر بیٹھ کر آپ تمام دنیا کا نظارہ کر سکیں؟ نہیں! ہرگز نہیں! نہ دنیا میں کوئی ایسی دوربین ہے نہ کوئی ایسا بلند مقام ہے۔ یہ صرف اخبار ہی اک ایسی چیز ہے جس کے ملاحظے سے آپ تمام دنیا کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اور جس کے حاصل کرنے سے آپ تمام دنیا کے نظارے حاصل کر سکتے ہیں۔

پچھلے زمانے میں واقفیت اور معلومات حاصل کرنے کا عجائبات عالم دیکھنے کا سوائے سفر کے دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا مگر اس میں سوا صرف کثیر کے کہ جس کی وجہ سے غریب اور مفلس شخص اس سے مستفیض نہیں ہو سکتا۔ محنت اور تکلیف و پریشانی بہت تھی اور بعض اوقات خود جان کا خطرہ تھا۔ علاوہ بریں اگر ایک شخص متعلقین کی جدائی اور پریشانیوں کا تحمل بھی ہوتا اور تمام عمر سیاحی بھی اختیار کرتا جب تو تمام دنیا کی سیر نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ اخبار اک ایسی چیز ہے کہ گھر بیٹھے بلا محنت و مشقت تمام دنیا کی سیر کر لے اور معلومات اور عجائبات عالم کی سیر سے طبیعت کو محظوظ کرے۔

یورپ میں اخبار سلطنت کا ایک جزو اعظم سمجھا جاتا ہے کیونکہ رعیت کے خیالات کی باگ فی الواقع اخبار کے ہاتھ میں ہے پرنس بسمارک کی کیفیت یہ تھی کہ جب کسی معاملات ملکی میں اس کو کوئی خاص طرز اختیار کرنی ہوتی تھی تو اس کے قبل ہی وہ اخبار میں تائیدی مضامین شائع کرا دیتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام اس کا ہم زبان ہو کر اسی کا کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔

یورپ کے اخباروں کو آج وہ طاقت حاصل ہے کہ جو چاہیں سو کریں۔ ایک سے ایک کی جنگ کروا دیں یا کسی جنگ میں صلح کرا دیں یا ایک کا ملک چھنوا کر دوسرے کو دلوا دیں۔ کسی عہدہ دار کو معزول کرانا اور کسی ادنیٰ شخص کو اعلیٰ عہدے دار بنانا ان اخبارات کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

اخبار کی خاص صفتیں

اخبار گورنمنٹ کے حقوق اور منشا کی حفاظت کرتا اور رعایا کے حقوق گورنمنٹ سے طلب کرتا ہے۔

اخبار علمی مذاق ہر طور سے پھیلاتا ہے اور قابل توجہ باتوں پر توجہ دلاتا ہے۔

اخبار غیر ملکوں کی اچھی باتوں کو ہم تک پہونچاتا ہے اور ہماری باتوں کی اُن تک اشاعت کرتا ہے۔

اخبار ہر ملک کے حالات رسم و رواج آب و ہوا، طرز معاشرت، طرز حکومت، مذاہب، عادات، اخلاق،

قوانین سلطنت جھگڑے فساد جنگ و جدال کو اخباری حیثیت سے لکھتا ہے اور اُن پر بحث کرتا ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ اچھے کو بُرے سے جدا کرتا ہے۔

اخبار ناظر کی تحقیقات کو بڑھاتا ہے اس کے علم کو جلا دیتا ہے۔

اخبار غلط خیالوں کی تردید کرتا ہے اور سچے خیالوں کی تائید کرتا ہے۔

اخبار انسان کی تعریف اور فضیلت انسانیت بیان کر کے رؤسا اور امرا کو انسانیت کی جانب بلاتا ہے اور اُن کو علوم و صنائع حرفت کی تعلیم عام کرنے اور مریضوں کی دوا اور علاج کے نئے مدرسے اور نئے شفا خانے قائم اور جاری کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اخبار فوائد عدالت بیان کر کے حاکم کو اس کی جانب توجہ دلاتا ہے اور گویا تمام رعیت کی وکالت کرتا ہے ان کی فریاد اور شکایتوں کو گوش حکومت تک پہونچاتا ہے۔

اخبار حکام اور عمال اور معمورین رشوت خوار اور ظالموں کے ظلم و جبر کے دفع کرنے میں کوشش کرتا ہے اور منتظمین اعلیٰ کو اس کی اطلاع دے کر اس کا کافی انسداد کرتا ہے۔

اخبار ہر ایک عالم عاقل کی امانت افکار اور ودیعت خیالات کو ہر ایک عالم عاقل کی نگاہوں اور کانوں تک پہونچاتا اور علما و عقلا کو ایک دوسرے سے آگاہ کرتا اور تبادلہ خیال کا موقع دیتا ہے۔

اخبار اپنی قوم کی اجزائے پراگندہ اور اعضائے متفرقہ کو ایک جا کر کے حیات تازہ بخشتا ہے اور از سر نو زندہ کرتا ہے۔

اخبار اپنے ناظرین کو بیٹھے بٹھائے تمام عالم کی سیر و سیاحت سے تجربہ کار بناتا اور خوش اور محظوظ و مسرور کرتا ہے۔

اخبار دوست داران امت اور محبان قوم کو دشمنوں اور عدوؤں سے جدا کرتا ہے اور لباس کذب اور برقعہ زریب کو چاک چاک کر دیتا ہے۔

اخبار شر اور بدبختی کی گھاٹیوں اور کمیں گاہوں سے بچانے کی غرض سے خبر دے کر خیر اور سعادت نیک بختی اور بصیرت کی شاہراہوں کا راستہ بتاتا ہے تاکہ قوم برابر چلے اور صراط مستقیم سے منزل مقصود تک پہونچ جائے۔

اخبار جس چیز میں ملک کا فائدہ دیکھتا ہے فوراً اسے محبتانہ الفاظ میں قوم پر ظاہر کر دیتا ہے اور نکتہ چینی اور اعتراض کی راہ سے ہمیشہ بچتا رہتا ہے۔

اخبار ایسے ضروری امورات اور معارف کا جس کا جاننا ہر فرد بشر پر ضروری ہے عام فہم عبارت میں جس سے عوام الناس کو انتباہ ہو ذکر کرتا ہے ۔

اخبار پست ہمتوں کے برانگیختہ کرنے اور مردہ دلوں کو زندگی بخشنے کے لئے ملکی دلچسپ ترقیات اور حالات کو اور صالحین کے کارناموں کو نہایت اور موثر الفاظ میں بیان کرتا ہے ۔ اور ان کے عمدہ خصائل کو بیان کرکے قوم کو ان کی تقلید پر آمادہ کرتا ہے کہ تذکرۃ الاسلاف تبصرۃ الاخلاف ہے ۔

اخبار ہمیشہ اخلاق جمیلہ اور خصائل پسندیدہ کے اوصاف اور عادات رذیلہ کے نقصانات بیان کرکے قوم کو اچھی باتوں پر مائل اور بری باتوں سے متنفر کرتا ہے ۔ اخبار سے ذہن اور عقل میں ترقی ہوتی ہے اور علمی مذاق بڑھتا ہے ۔

الغرض اخبار کے فوائد بے شمار ہیں جن کے بیان سے اتنا کہہ دینا بہتر ہے کہ جو شخص دنیا میں اپنے برے بھلے کی تمیز کرنا چاہے اور دنیا میں رہ کر دنیا کی عمدہ باتوں کو حاصل کرنا اور بری باتوں کو چھوڑنا چاہے حقائق و معارف اور مختلف علمی عملی معلومات کا شوق رکھتا ہو ۔ اور دنیا میں مہذب اور شائستہ عاقل فرزانہ ہوکر رہنا چاہے اور گھر بیٹھے بلا صرف وخرچ ایک استاد شفیق تلاش کرتا ہو تو وہ اخبار بینی اختیار کرے ۔

اخبار آپ کو بتاتا ہے کہ دیکھو ! فلاں ملک میں فلاں شخص نے یوں ادنیٰ حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقی کی اور عزت و دولت یوں حاصل کی ۔ وہ ایک معمولی مفلس شخص تھا مگر تھوڑے دنوں میں دولت مند ہوگیا ۔ یہ کیوں ؟ اس لئے کہ تعصب اور نفسیات کو بالائے طاق رکھ کر بے تعصبی اور سلامت روی کا سبق یاد کرلیا تھا اگر تم بھی ویسے ہی ترقی کے زینے طے کرکے اعلیٰ مینار پر پہونچنا چاہتے ہو تو اسی شخص کے قدم بہ قدم چلو ۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگے ۔

اخبار ایک قومی ہادی ہے

اخبار در اصل ایک زندہ ہادی ہے جو ہر قسم کی باتوں میں ہدایت کرتا ہے ۔ بُری باتوں سے تنفر دلاتا ہے اور عمدہ باتوں کی جانب مائل کرتا ہے کیونکہ انسان کی طبیعت میں ایک ایسی زبردست قوت گمراہ کنندہ موجود ہے جس کا کام انسان کو چاہِ ضلالت میں ڈالنا ہے اس کی اعلیٰ کوششوں سے انسان سیدھے سعادت اور نیک بختی کے راستے کو چھوڑ کر شقاوت کی تنگ و تاریک اور خوفناک و بیچدار گھاٹیوں میں آنکھ بند کئے پڑجاتا ہے اور اس بدبختی کے مقام پر خوش قسمتی کے راستے کو تلاش کرتا ہے اور جب کوئی خضر صفت رہبر کے ہاتھ پکڑ کر منزل مقصود تک

نہ پہونچائے وہ یونہی پریشان و سرگرداں رہتا ہے

اس لئے ہر قوم اور فرد کو ایک رہبر اور ہادی کی سخت ضرورت ہے اور بے اس کے کوئی بھی صراط مستقیم پر نہیں چل سکتا۔

پس حالت موجودہ کے اعتبار سے اخبار سے بڑھ کر قوم کا کوئی ہادی اور رہبر نہیں ہے جو اُسے سیدھی راہ پر چلانے میں مددگار اور ترقی کا بدل و جاں خواستگار ہو۔

اخبار کے متعلق نامور لوگوں کی رائے

ایک بڑے مدبر کی رائے اخبار بینی کے متعلق یہ ہے کہ کتب بینی سے اخبار بینی زیادہ سودمند ہے اور اس کا نفع اس سے کہیں بدرجہا زیادہ ہے۔ کیونکہ ہر ایک کتاب ضرور کسی خاص بحث اور مضمون پر ہوا کرتی ہے اور برخلاف اس کے اخبار میں چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف بحثوں پر ہوا کرتے ہیں۔ اور بجائے ایک بات کے اُن میں متعدد سودمند باتیں ہوتی ہیں جس چیز سے ہماری طبیعت کو مناسبت ہو ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

علامہ سید جلال الدین افغانی المصری اخبار کے فوائد میں یہ لطیف شعر پڑھتے ہیں

لا سعادت لامۃ لیس لھا سائق

الی الفضائل ولا ناجع عن الرذائل

(یعنی جس قوم میں اچھی باتوں کی جانب ہدایت کرنے والا اور بری باتوں سے منع کرنے والا (اخبار) نہ ہو اسے نیک بختی اور سعادت نہیں مل سکتی)

یہ شعر اس حکیم وقت کا ہے جس کی علمی لیاقت آج تمام اخباری دنیا میں مسلم ہے۔ اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالت موجودہ کے اعتبار سے اخبار سعادت کا باعث ہے۔ سعادت سے محروم ہے وہ قوم جو اخبار بینی سے ناواقف ہے نیک بختی سے دور ہے وہ قوم جو اخبارات سے مستفیض نہیں ہے۔ یورپ کو دیکھو آج دنیاوی سعادت میں کوئی قوم اس کے لگ بھگ نہیں ہے تمام دنیا میں مسلم ہو چلا ہے کہ جو شخص یا قوم دنیاوی سعادت کی خواہاں ہو، یورپ کی تقلید کرے۔ یہ کیوں؟ بس اسی لئے کہ اخبار بینی وہاں طبیعت ثانی ہو گئی ہے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مردوں، معماروں، کتب فروشوں، مزدوروں، عطاروں، ڈاکٹروں، پادریوں، شاعروں، نجومیوں، تاجروں، مصوروں، زمینداروں، کسانوں، انجینیروں، نوکروں وغیرہ وغیرہ ہر ایک فرقہ، ہر ایک عہدہ، ہر ایک فن،

ہر ایک علم، ہر ایک قوم کے لوگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اخبار شائع ہوتے ہیں اور وہ اُسے روزانہ دیکھ کر اپنی ضروری حاجتوں کو رفع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہیلن ڈی ڈی اپنی ایک تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ میں جس وقت ڈیونٹی کالج میں تحصیل علم میں سرگرم تھا مجھے مضامین نویسی کا بہت شوق چڑھا تو مجھے اخباروں کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدہ ہوا اور بہت باتوں کو میں نے اس سے سیکھا جو علمی اور عقلی مضمون اخباروں میں ہوا کرتا تھا اُسے میں اوّل غور و فکر کے ساتھ پڑھتا اور رائے زنی کیا کرتا تھا اور پھر اس کو اور طالب علموں کے آگے پیش کیا کرتا اور بحث کیا کرتا تھا اس طرح سے ایک علمی مذاق میری طبیعت میں پیدا ہو گیا اور اس نے ایسا اضطراب پیدا کر دیا کہ میں اس فن اخبار نویسی کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور پھر تو ایسے ایسے لاجواب مدلل علمی آرٹیکل اور مضامین لکھنے لگا جن کی قوم نے داد دی۔ یہ اخبار بینی ایسی عمدہ چیز ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں ہے۔ مسٹر گلیڈ اسٹون سابق وزیر اعظم انگلستان اخبار کے متعلق لکھتا ہے کہ "پبلک اخبار کی کیوں شاکی ہوتی ہے یہ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے۔ اس کا وجود تمہارے لئے غنیمت ہے یہ ایک زبردست ہاتھ ہے جس سے تمام دینی اور دنیوی باتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اس کا فیض چاروں طرف پھیلتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں اس سے بڑے بڑے فائدے انسان کو ہوتے ہیں پرنس بسمارک فن اخبار نویسی میں بڑا مشاق تھا اور اس کے رموز و نکات سے ایسا ماہر تھا جیسے کوئی بڑا نامور مشاق لائق و فائق اور تجربہ کار اڈیٹر ہو۔ مجھے چونکہ اس کام پر اس نے مامور کیا تھا اس لئے وہ دن میں کئی بار بلا کر اخبار کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا اخبار کا وہ ایسا عاشق تھا کہ رات دن اسی دھن میں رہتا تھا رات کو آدھی آدھی رات دفعتاً چونک کر مجھے طلب کرتا تھا اور جو مضمون اس کے ذہن میں اس وقت سماتا تھا کہہ کر حکم کرتا تھا کہ اُسے فوراً صبح کو فلاں فلاں اخبار میں شائع کرا دیا جائے۔ غرضکہ اخبار سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور سب سے عمدہ مشغلہ سمجھتا تھا۔ پیٹر اعظم شاہ روس کی لائف میں لکھا ہے کہ وہ نہایت دلچسپی سے اخباروں میں اڈیٹوریل مضامین لکھا کرتا تھا اور اخبار کو رعایا کے خیالات کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اخباروں سے اس کو اتنا شغف تھا کہ بذات خود اس کے پروف کی صحت کیا کرتا تھا اور وہ تمام پروف اس کی مشہور لائبریری میں موجود ہیں۔ فرانس کے مشہور مدبر نپولین کے حالات میں مورخ لکھتا ہے کہ نپولین کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا تھا تو پہلے اخباروں میں اس کے متعلق موافق اور تائیدی مضامین شائع کراتا تھا اور اس طور سے عام لوگوں کو اپنے موافق کر لیتا تھا۔

ہندوستان میں جتنے نامور جنرل اور گورنر آئے ہیں جب وہ پنشن لے کر ولایت کو واپس جاتے ہیں تو

وہاں بھی اخبار نویسی کے پر لطف شغل میں باقی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سر ولیم میور سے ہندوستان کا کوئی تعلیم یافتہ ایسا ہے جو واقف نہیں۔ یہ علاوہ اس کے کہ ہندوستان میں عرصہ تک گورنر رہ چکے ہیں بہت بڑے مصنف بھی ہیں ان کی تصانیف میں لائف آف محمد ایک ممتاز کتاب ہے جس میں آنحضرت پیغمبر برحق روحی فداہ کی لائف لکھ کر اس پر زاہدانہ نکتہ چینی کی گئی ہے اور جو اس طریق اعتراض سے مختلف ہے جو عام مشنری اور پادری کیا کرتے ہیں۔ اس سے میور صاحب کی ایک ممتاز صفت معلوم ہوتی ہے یہ فاضل شخص بھی اخبار کے نامہ نگار ہیں۔ اور اُن کے اکثر مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ سر الفرڈ لائل، سر لیپل گریفن، سر رچرڈ ٹیمپل، سر رچرڈ گارتھ وغیرہ تمام مضامین نگار ہیں۔ سر ولیم ہنٹر سابق ممبر کونسل گورنمنٹ ہند اخبار ٹائمز کے اڈیٹر ہوئے اور اُن کے پر زور آرٹیکل نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فن اخبار نویسی کیسا باجواب اور دلچسپ فن ہے کہ ایسے ایسے افاضل اُسے اختیار کرتے ہیں۔

جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ

(۵ جولائی سنہ ۱۹۰۲ء الپنچ پٹنہ)

شاعر کو دل سے بھاتی ہے تعریف شعر امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

حضور شاہ عالم پناہ کی تاجپوشی کی خوشی میں (خدا انھیں جلد صحت عطا فرمائے) غالباً یہ شرف شعرائے کلکتہ کو ہی حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے اس پر اظہار مسرت کے لئے خاص طور سے مشاعرہ ترتیب دیا اور ثابت کر دیا کہ اس گروہ کو بھی حضور سے ویسے ہی مودت ہے جیسی کہ عموماً وفادار رعایا کو اپنے بادشاہ سے ہونی چاہئے۔ در اصل اس مشاعرہ کے بانی ہمارے محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب رنجور جعفری چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرس کلکتہ تھے جن سے ناظرین الپنچ کو تعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹ جون سنہ ۱۹۰۲ء کو مولوی صاحب ممدوح نے ایک اطلاعی رقعہ شائع کیا جس کی مطلا اور مذہب چھپائی در پردہ مسرت اور سرور کا پتہ دے رہی تھی۔ اس رقعہ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ایسے موقع میں کہ تقریباً تمام دنیا میں ہر ایک اہل فن اور اہل علم نے اپنے اپنے طریقہ پر اظہار مسرت کا اہتمام کرایا ہے شعرائے کلکتہ کچھ حصہ نہ لیں یہ ایک افسوسناک امر ہے۔ اس لئے ۲۵ جون سنہ ۱۹۰۲ء شب پنج شنبہ کو راقم نے ایک مجلس مشاعرہ جناب مولوی عبدالباری صاحب رئیس کلکتہ کے مکان پر ترتیب دی ہے۔ شعرا تشریف لائیں اور اپنی مسرت کا علمی ثبوت دیں اور معمولی غزل خوانی کے لئے "رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں" مصرع طرح دیا گیا تھا۔

تاریخ مذکور کو مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا اور رواداری ایشیائی طریقہ نشست کے موافق تکیوں اور فرش کا خاصہ انتظام تھا رقعہ میں آٹھ بجے مشاعرے کی آغاز کا وقت دیا گیا تھا۔ مگر دس بجے تک کوئی صاحب تشریف نہ لائے کیونکہ ہندستانی

تہذیب نے وقت کی پابندی کا سبق ہی نہیں دیا ہے۔ وعدے سے ایک دو گھنٹہ کا فرق کوئی فرق خیال نہیں کیا جاتا تاخیر دس بجے سے کچھ لوگ آنے لگے اور ساڑھے دس تک مجمع ہو گیا مشاعرے کے قبل جیسا کہ رقعہ میں لکھا گیا تھا تہنیت تاجپوشی کی تاریخیں اور قصائد پڑھنے تھے مگر چونکہ حضور شاہنشاہ عالم پناہ کی علالت کی دن کو خبر ہو چکی تھی اور ولایت میں جشن موقوف کر دیا گیا تھا اس لئے سب سے پہلے جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری نے کھڑے ہو کر بیان فرمایا کہ چونکہ یہ خبر وحشت اثر ہے کہ حضور شاہنشاہ عالم پناہ علیل ہیں اور جشن موقوف کیا گیا اس وقت ہم لوگوں کی طبیعت کو پژمردہ کر رہی ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ آج قطعات کا پڑھنا موقوف کیا جائے اور اس وقت کا انتظار کیا جائے جبکہ عنقریب ہی حضور کو صحت کی فرحت اثر خبر ہمارے دلوں کو شاد کر دے گی اس کے بعد جناب مستطاب آقا کاظم صاحب شیرازی کھڑے ہوئے فارسی میں اول اس خبر پر افسوس کیا پھر مولوی صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان کے بعد جناب مولوی غلام یسین صاحب آہ دہلوی کھڑے ہوئے اور دیر تک گہر ریزی فرماتے رہے آپ کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ "اللہ کی صفتوں میں رحیمی کی صفت بڑی اعلیٰ صفت ہے جن لوگوں میں یہ صفت ہوتی ہے اس تعلق کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں ہماری گورنمنٹ جبکہ ہم پر آزادی کے ساتھ سلطنت کرتی ہے اور ایک حد تک رحیمی کی صفت رکھتی ہے تو ضرور ہے کہ ہم بھی اس کے رنج اور خوشی میں شریک رہیں۔ ان کے بعد ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کھڑا ہوا اور آدھ گھنٹے تک لکچر دیتا رہا۔ اس نے اول ابتدائے عالم سے آج تک کی ایک مختصر تاریخ بیان کر کے کہا کہ غالباً تمام بادشاہانِ وقت میں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ باوجود اختلاف مذہب اور اختلاف قومیت اور اختلاف وطنیت کہ اس آزادی کے ساتھ سلطنت کی ہو یہ اس گورنمنٹ کی خاص آزادی اور اہل ہند کی جانب توجہ ہے اور میری رائے بھی یہی ہے کہ قطعات تہنیت وغیرہ آج موقوف رکھے جائیں اور انشاءاللہ وہ وقت بہت قریب ہے جبکہ ہم آپ اسی طرح ایک جگہ جمع ہو کر صحت کی خوشی میں قطعات اور تاریخیں سنائیں گے اور جشن کریں گے۔ یہ رائے تمام اہل جلسہ نے قبول کی اور مشاعرہ شروع ہوا۔ ابتدا میں اکثر صاحبوں نے غزلیں سنائیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے اپنے کلام کے موافق داد لی اثنے میں جناب شمس اور جناب حمید صاحبان اور جناب شہرت عظیم آبادی تشریف لائے اور ایک دو صاحبوں کے بعد ہمارے یک رنگ دوست جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت نے غزلیں سنانی شروع کیں ابتدا میں انھوں نے چند فارسی کی اور اُردو کی رباعیاں سُنائیں جن کا مزا کوئی آزاد ہی کے دل سے پوچھے رباعیوں کے بعد انھوں نے اپنی فارسی کی غزل پڑھی جس کا

ہر شعر لاجواب اور لطف زبان میں ڈوبا ہوا ہے -

اراد تیکہ مرا تو ہست میدانی — محبتیکہ ترا بامن ست میدانم
مرا تو دوست شماری برو چہ میگوئی — کہ دوستی تو با دشمنت میدانم
بہ بزم او تپش دل بلا سبب نہ بود — نگاہ برق سوئے خرمنت میدانم
ادائے او بے فہمید ست می فہمم — جفائے او بے دانستت میدانم
بہ وحشت ایں ہمہ لطفش بلا سبب نبود — ادائے تازہ دل بردنست میدانم

اس کے بعد انھوں نے اردو کی دو غزلیں سنائیں جن کے چار شعر یاد رہ گئے ہیں

جان اُن کی اداؤں پہ نکلتی ہی رہے گی — یہ چھیڑ جو چلتی ہے تو چلتی ہی رہے گی
گرمیٔ سوزش دل مرگ سے ناچار نہیں — نالۂ مرغ گرفتار گرفتار نہیں
حُسن یہ تیرے کرشمے ہیں کہ با اینہمہ شوق — طاقت دید نہیں قوتِ گفتار نہیں
چاہتے ہو کہ میں پھر کھاؤں فریب غمزہ — لب پہ اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں

پھر طرح کی دو غزلیں سنائیں جو بہت ہی خوب اور زبان و مضمون دونوں کا لطف لئے ہوئے تھیں - اہل مجلس نے بھی خوب دل کھول کر داد دی اور اسی طرح ان کی غزلخوانی ختم ہوئی - ان کے بعد اور بہت سے صاحب غزلیں سناتے رہے مگر چونکہ اُن میں سے اکثر حضرات سے میری شناسائی نہیں ہے اس لئے نہ تو نمونہ کلام دے سکتا ہوں اور نہ اُن کا نام لکھ سکتا ہوں - امید ہے کہ وہ اصحاب معاف فرمائیں گے ان کے بعد ہمارے مکرم جناب منشی احمد صاحب نے نہایت عمدہ نعتیہ غزلیں پڑھیں جن کے ہر ہر شعر سے محبت نبوی روحی فداہ کی بو آتی تھی - سبحان اللہ کیا عمدہ کلام ہے - ان کے بعد بھی جناب سید حسین صاحب سلیم لکھنوی نے ایک دو رباعیاں اور زبان کے رنگ کی غیر طرح نہایت ہی پُرلطف غزل سنائی جس کے لئے چند اشعار اپنی عمدگی کے سبب سے اس وقت تک ہماری زبان پر جاری ہیں .

دل مانگتے ہو مجھ سے بہلا کے بھولے پن میں — کیا میں نہیں سمجھتا شاطر ہوا پنے فن میں
بس بس ہوں غربت اب روکنا نہ بن میں — مضطر ہیں دوست میرے میرے لئے وطن میں
دل اُن سے کھیلتا ہے وہ دل سے کھیلتے ہیں — وہ مست بالے پن میں یہ مست بھولے پن میں

ان کے بعد (خاکسار) ابوالکلام آزاد کی باری تھی - جیسا کہ مشاعرہ کا دستور ہے میں نے بھی چند رباعیاں فارسی اور اردو کی لکھی تھیں - مگر غلطی سے وہ کاغذ ضائع ہو گیا اور رباعیاں نہ سنا سکا ایک رباعی اس وقت یاد آ گئی ہے

ناظرین کے

درد ہر زلف اُو نہ شد طبعم سیر — بر بالا روم کہ خود نہ بالا ست نہ زیر

اے عمر برو برو کہ یاد تو زیاد — اے مرگ بیا بیا کہ یاد تو بخیر

اور فارسی کے چند شعر جو مشاعرہ سے کچھ پہلے لکھے تھے اس کے بعد سنائے جن میں سے پانچ شعر یہ ہیں -

کنی زگریہ اگر منع چشم گریاں را — رواں بود کہ ندیدی سشبانِ ہجراں را

توانم آں کہ کنم ضبطِ آہ دافغاں را — مگر علاج بگو چیست چشم گریاں را

الٰہی چشم فسوں ساز چہ مستی ہاست؟ — کہ مست در بیخبر انداخت ہوشیاراں را

دریں مشاعرہ حرفم نمی تواں فہمید — چہ طور گویم الٰہی بیان پنہاں را

برو برو تو طبیبا! چرا بمن آئی — بغیر مرگ دوانیست دردِ ہجراں را

اس کے بعد میں نے اپنی دوسری فارسی کی غزل (کمالت ایں خیالت ایں) کے چند اشعار پڑھے اور

ان دونوں فارسی غزلوں پر تمام اہل مجلس نے بالعموم اور جناب شمس

کا شکریہ ادا کیا پھر ایک اردو غزل تازہ افکار کے چند اشعار پڑھے جس کے چند شعر یہ ہیں -

اُن شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے

ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے

یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے

دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے

ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے

کچھ اور ہی سمجھے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے

بے خود بھی ہیں ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے

اُن مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے

آزاد ہوں اور گیسوئے پیچاں میں گرفتار

کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

اب میں طرحی غزل پڑھنے ہی کو تھا کہ میرے مکرم دوست جناب سید اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی

جو مشاعرے کے دن دہلی سے آئے ہوئے تھے فرمانے لگے کہ ذرا مشاعرۂ گذشتہ کی غزل (بیمار کے آگے، غلبگار کے آگے) ردیف و قافیہ والی پڑھ دیجئے ۔ میں نے انکار مناسب نہ جانا اور اس غزل کے بھی چند اشعار پڑھ سنائے اہلِ محفل نے خوب ہی داد دی ۔ طرحی غزل پڑھنے کے قبل میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ غزل میں نے جس بے سر و سامانی میں لکھی ہے اُس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مطلع تک ابھی نہیں لکھا جو لکھا ۔ ہے سنائے دیتا ہوں کیونکہ میں بعض علمی تالیفات کا شغل چھوڑ کر اس فضول شغل کو اختیار نہیں کیا کرتا ۔ میرے تمام اشعار پر اہلِ محفل نے خوب دل کھول کر داد دی اور بالخصوص ہمارے مکرم جناب شمس اور جناب حمید وغیرہ اول سے آخر تک داد دیتے رہے یہ اُن صاحبوں کی عنایت ہے ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا ۔ میرے بعد جناب مولوی غلام نسیم صاحب آہ دہلوی نے باوجود علالت طبع کے بیٹھنے دوستوں کے اصرار سے غزل پڑھنی شروع کی اول ایک دو واقعی رباعیاں جن میں کچھ اپنی علالت کا اظہار کیا گیا تھا سنائیں اور اس کے بعد ایک عجیب و غریب پرلطف غزل جو بندش مضمون زبان ہر حیثیت سے قابلِ داد اور صاد ہے پڑھ کر اہلِ محفل ۔ سے خوب داد لی اور واقعی بات ہے جبھی یوں آپ عمدہ شعر دادلے ہی کر چھوڑتا ہے گو انسان کیسا ہی ضبط کیوں نہ کرے وہ دو رباعیاں یہ ہیں :

یہ آپ سے کیا کہوں کہ اب کیسا ہوں اللہ کا شکر ہے کہ میں زندہ ہوں
ہوں مسلسل ہوں درد سر سے رنجور رنجور کے اصرار سے یاں آیا ہوں

ولہٗ

بیداری شب سے تپ بڑھا کرتی ہے اور فکر یہ تکلیف سوا کرتی ہے
سب کچھ مانا مگر کہاں تک انکار ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے

پھر جناب معلی القاب نواب محمد ابراہیم علی خاں صاحب والی ٹونک کی غزل کا مخمس سنایا جس کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے بالخصوص اس شعر کا بند کہ ؎

ہاروں کے بھیجتے ہی سینے وہ گلے کے ہار گوندھے ہوئے تھے کیا کسی اچھی لگن کے پھول

طرحی غزل بھی ہر صورت سے قابلِ داد ہے ہر شعر لاجواب اور ہر مطلب دلچسپ واہ واہ سبحان اللہ ۔ ان کے بعد ہمارے محترم دوست جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری بانیِ مشاعرہ نے (چونکہ صبح قریب ہو چکی تھی اور بہت سے لوگ باقی تھے) صرف اپنی طرحی غزل سنائی جس کی تعریف ہو نہیں سکتی بالخصوص مطلع اول بدر و گر کا قافیہ کس عمدگی اور چستی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے واقعی یہ انھیں کا حصہ ہے جو کچھ کہا جائے کم ہے، کیوں نہ ہو آخر ایک عرصہ کی

مشق اور اس پر علمیت! واہ واہ!

مولوی صاحب کے بعد مکرم جناب مولوی محمد صاحب شمس رئیس کلکتہ کی باری تھی آپ نے اول اپنی بحر طویل کی غزل پڑھ کر سنائی جس کی جس قدر تعریف کی جائے تھوڑی ہے اور خاصکر یہ مطلع ؂

روئے وہ زار زار ہوئے مزار دیکھ کر … دل کے غبار دھل گئے مجھ کو غبار دیکھ کر

پھر ہونا ہوگا۔ جانا ہوگا کی پرلطف غزل سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا اس کے بعد طرحی غزل سنائی جو اپنی نوعیت میں بالکل نرالی تھی واہ کیا کہنا۔ سبحان اللہ!!

ان کے بعد جناب شہرت عظیم آبادی۔ نے چند رباعیوں کے بعد دم لے لو۔ قدم لے لو کی استادانہ غزل سنا کر خوب ہی داد لی اور طرحی غزل کا کیا کہنا سبحان اللہ

ان کے بعد مکرم جناب حافظ عبدالحمید صاحب حمید نے نہایت ہی عمدہ اور دلچسپ دو تین فارسی کی رباعیاں سنائیں اور ایک تصوفانہ بیش غزل پڑھ کر طرح غزل پڑھنی شروع کی۔ حافظ صاحب ایک قابل شخص ہیں ان کے ہر شعر ہر مصرع سے قابلیت کا رنگ ٹپکتا ہے۔

صبح ہو گئی تھی تقریباً پانچ بج گئے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ واہ کیا اچھی مجلس تھی کیسے کیسے باکمال رونق افروز تھے کیا کیا شعر پڑھے گئے کس کس رنگ کے اشعار سنائے گئے۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا کتنا اچھا یہ مشاعرہ مصداق تھا۔ واقعی جلسہ کے ایسے ہی فوائد ہیں ورنہ ہم کہاں اور کہاں شمس کہاں حمید۔ ہاں

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اے مشاعرہ! اے ہمارے دلوں کو زندہ کرنے والا! اے ایشیائی شاعری کے جنازے کو دھوم سے نکالنے والا! خدا تجھے زندہ رکھے۔ باسلامت رکھے باکرامت رکھے۔ تجھ پر اتفاق کا سایہ اور تیرا شاعروں پر سایہ رہے زمانہ ہم سے پھر جائے مگر تو ہم سے نہ پھریو! تو ہم کو نہ بھولیو! تیرا ہی ایک آسرا ہمیں ابھی ایشیائی شاعری کا نام لیوا بنا رہا ہے۔ تیرا ہم پر کرم ہے تو ہمارا بول بالا ہے۔

راقم خادم احباب

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

حکیم خاقانی شروانی

(مخزن لاہور۔ اگست ۱۹۰۲ء)

شعرائے پارس کے تذکرے اگرچہ فارسی زبان میں بہت سے لکھے گئے اور اکثر مشہور شعراء کے حالات ہر ایک تذکرہ نویس نے قلمبند کئے مگر سچ پوچھو تو جامعیت کا اطلاق ایک تذکرے پر بھی نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ بڑی محنت سے لکھا تھا اور بڑی کوشش کی تھی کہ کم و بیش تمام خوش گو شعرائے فارس کے [illegible] حالات اس میں جمع کئے گئے ہیں مگر جب دیکھنے والوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مشہور شاعروں کے [illegible] اور کچھ نہیں [illegible] آزاد ہی پر نہیں ہے بلکہ تمام تذکروں کی یہی کیفیت ہے۔ حال میں [illegible] ہدایت نے ایک ضخیم تذکرہ مجمع الفصحا کے نام سے ایران میں لکھا ہے اور وہیں چھپا بھی ہے۔ ہم نے اسے بھی اول سے آخر تک چھان ڈالا۔ بہت سے شاعروں کے حالات نظر نہ آئے خیر یہ تو حال فارسی تذکروں کا ہے اردو نے معلیٰ تو اپنے شاعروں کے تذکروں سے محروم تھی یہ تو پروفیسر محمد حسین آزاد کی عنایت ہے کہ انھوں نے آب حیات لکھ کر کلنک کا ٹیکہ مٹایا۔ ہم نے یہ حال دیکھ کر ایک تذکرۃ الشعراء کی بنا ڈالی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جامعیت کا لطف پیدا کیا جائے۔ ساتھ ہی پرانی طرز کو ترک کر کے سوانح عمری کے طور پر حالات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور مختلف مقامات سے تذکرے جمع کر کے پہلی جلد تالیف کی گئی ہے جس میں سے نمونہ کے طور پر حکیم افضل الدین خاقانی کی لائف ناظرین مخزن کی دلچسپی کیلئے پیش کی جاتی ہے۔

ابو الکلام آزاد۔ دہلوی از کلکتہ

ز دیوان ازل منشور کار دل درمیاں آمد　　امیری جملہ را دادند و سلطانی بہ خاقانی
برائے حجت معنی براہینے پدید آمد　　ز پشت آزر صنعت علی نجار شروانی

آج ہم اس افصح الفصحا، اشعر الشعراء کے حالات رقم کرتے ہیں جو چرخ فصاحت کا بلند پرواز شہباز تھا۔ اور نیستان بلاغت کا ایک دلیر شیر تھا جس نے نہ صرف نظم پارس میں فصاحت و بلاغت کی روح پھونکی بلکہ اس کو نازک خیالی کے بھنور میں ڈال کر کدورتوں سے صاف کیا اور ایسا صاف کیا کہ اس کی چمک دمک پر سینکڑوں کی نظریں پڑنے لگیں اور یہی جوانمرد سخن نے نظم پارس کو رباعی اور منزل کی قید سے آزاد کر کے ترقی کے اعلیٰ مینار پر پہونچا دیا۔

اس شیر بیشہ بلاغت کا نام نامی حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی النجار شروانی ہے اصل آبائی وطن اس کا بیلقان ہے لیکن غالباً زیادتی سکونت کے سبب سے شروانی مشہور ہو گیا رشید الدین وطواط و اثیر و ظہیر اور فخر الدین و شاپور و کمال الدین کا ہمعصر ہے لیکن اپنے کمال کے سبب سے بدرجہا فوقیت لے گیا اس کی صحیح تاریخ ولادت باوجود تحقیق و تجسس بسیار نہ معلوم ہوئی۔ تذکرہ مرأۃ الخیال، خزانۂ خیال، خزانہ عامرہ تذکرہ دولت شاہ، ریاض الشعراء علامہ قہستانی، آتشکدہ تذکرہ مجمع الفضلا، ماثر الامرا صبح صادق، گلزار عجم، ارمغان شعرا، یادگار شعراء، تحفۃ العجم، کلام مقبول، یادگار ناظم وغیرہ وغیرہ تمام تذکرے چھان ڈالے گئے مگر کچھ پتا نہ چلا مجمع الفصحا مطبوعہ ایران تالیف علامہ فخر المتاخرین رضا علی خان ہدایت سے اتنا پتا بیشک چلتا ہے کہ پانچویں صدی کے اوائل میں یہ صبح صادق کا چمکتا ہوا تارہ عالم اجسام کے [illegible] ہوا اور [illegible] کے لئے نیر اعظم ہو کر چمکا جس کی روشنی سے نہ صرف شروان ہی کو روشن کیا بلکہ اپنی [illegible] آنکھیں روشن کر دیں۔

ہمارے نامور ہیرو کے والد کا پیشہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے غالباً نجاری تھا کیا عجب ہے کہ آباد جدا یہی پیشہ ہو مگر اس بارے میں تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔

جب ہمارا ہیرو سن تمیز کو پہونچا تو تحصیل علوم ضروری کے بعد اپنے خسر اور واجب التعظیم بزرگ ابو العلائی گنجوی کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم ادبیہ اور تکمیلہ حاصل کی [illegible] طبیعت کی موافقت اور ذہن کی رسائی تو فطری تھی پھر استاد کامل اور شفیق ملا دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں فضل و کمال کا ڈنکا بج گیا۔

انسان کا قاعدہ ہے کہ جس قسم کی سوسائٹی میں وہ ہوش سنبھالتا ہے اور جس قسم کی باتوں میں آنکھیں کھول کر اپنے کو مبتلا دیکھتا ہے اسی طرف اس کا قلبی رجحان ہوتا ہے اس زمانہ میں شاعری کی مارا مار تھی اور تمام علوم میں شاعری کو افضل سمجھا جاتا تھا فردوسی اور اس کا شاہنامہ محمود غزنوی کی حکایتیں اور اس کا دربار اس زمانے میں ایسا تھا جیسے آج کل غالب و ذوق اور مرحوم بہادر شاہ۔ جیسے آج کل ان کی حکایتیں مشہور اور معروف ہیں

اور ان کے دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں اسی طرح اس زمانے میں فردوسی اور محمود غزنوی کی حکایتیں زبان زد خاص و عام تھیں ہر ایک شخص کو شاعری کا شوق و ذوق تھا اور اسی خیال میں سرمست تھا جس علمی مجلس میں جاؤ تو وہاں منطق اور فلسفہ کی پریشان کن دماغ بحثوں کی بجائے شاعری کی خوش کن بحثیں ہوتی ہوئی نظر آئیں گی جس دربار میں پہونچو اس کی شاعری کے دلکش راگ گاتے ہوئے دکھائی دیں گے خون لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا آج ہم کہتے ہیں لیکن اس مثل کا سچا مصداق وہی زمانہ تھا اور یہ ہی نہ تھا کہ لوگ شہیدوں میں داخل ہو جاتے تھے بلکہ شہید ہو بھی جاتے تھے ہر ایک شخص یہی چاہتا تھا اور اعلیٰ سے اعلیٰ، خدا تعالیٰ سے اس کی یہی دعا ہوتی تھی کہ میں فردوسی ہو جاؤں۔

الغرض ایسے زمانہ میں جبکہ اسلام کا نیر اقبال نصف النہار ہو رہا تھا اور خاندانِ سلجوقی کا دور دورہ تھا اور اس خاندان عالیشان پر فن شاعری کا راج تھا ہمارے نامور ہیرو نے علم و فضل حاصل کیا اور علامہ ابوالعلائی گنجوی سے اکتساب فیضان کیا جیسا کہ ضرور تھا بعد فراغ کتب درسیہ اس کو شاعری کی طرف میلان ہوا جس پر زمانہ مٹا ہوا تھا اور جس سودا میں خویش و بیگانہ مست نظر آتا تھا۔

استاد کی رائے۔ باکمال استاد نے بھی دیکھا کہ نوجوان طالب علم ہے تو ذہین طبیعت کی شوخی بتا رہی ہے کہ شاعری کے پردے میں اپنا رنگ دکھلانا چاہتی ہے اور کسی کے روکے سے کب رُکے گی، بن دکھائے نہ رہے گی اور یقیناً دکھائے گی۔ کبھی کسی باکمال کی ہجو ہوگی کبھی خشک زاہدوں کی مٹی خراب ہوگی اور ایسے برے طور سے کہ توبہ ہی بھلی۔ کبھی واعظوں ناصحوں اور عشاق پر پھبتی اڑے گی اور اس میں بال کی کھال کھینچی جائے گی۔ پس خداداد موج کا روکنا ایک تو غیر ممکن ہے اور چلتی ندی میں کچھ اٹکا بھی دیا تو نتیجہ اس کا خراب ہے۔ بہتر ہے کہ اسی فن کی جانب میلان اس کا اور بڑھا دیا جاوے۔

شاعری سے ہمارے ہیرو نے جب اپنے شفیق استاد کا اشارہ پایا تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ بھر گیا تھا اُدھر تو پہلے ہی سے اشتیاق سے بھری آنکھیں حکم کی منتظر تھیں فوراً حقایقی تخلص تجویز کر کے کچھ اشعار لکھے اور اس زمانہ کے مشہور شاعر فلکی سے شاگردی کر کے اصلاح لینی شروع کر دی۔

شاعری سے طبع کی مناسبت۔ شاعری کی آگ تو پہلے ہی سے طبیعت میں موجود تھی لیکن علوم درسیہ کے مشاغل کے سبب سے کچھ دنوں خاک تلے دبی رہی جب تحصیل سے فارغ ہوا اور استاد کو بھی موافق دیکھا وہ آگ ایک شعلہ زر افشاں کی صورت میں بھڑکی اور بھڑکتے ہی گلزار ابراہیمی کی بہار دکھلانے لگی۔ پھر تو اس کے تر و تازہ گلہائے خوشبودار، خوش رنگ، خوش نما پھولوں کی مہک نے تمام ملک سخن کو معطر کر دیا اور زبان حال سے وہ

روتازہ گلشن سخن کو مخاطب کرکے کہنے لگا کہ

اے گلشن سخن کے ہوا خواہ شایقو!! آؤ آؤ بہار بے خزاں کے مزے لوٹو!

قسمت کی رسائی تو دیکھو ۔ جب یہ شہرت سخن عالمگیر ہوئی اور لوگ اس کے کمالات سے واقف ہونے لگے تو ملغلہ کمال سلجوقی خاندان کے نامور قدردان سخن پادشاہ خاقان کبیر منوچہر الپ ارسلان سلجوقی شاہ شاہ شیرواں تک پہونچا در وہ اس باکمال حقائقی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے بھی اس توجہ کو غنیمت خیال کیا اور قصائد مدحیہ لکھ کر خاقان کبیر کے دربار میں حاضر ہوا او قصائد نذر گذرانے۔ اقبال نے ہاتھ پکڑا اور قسمت نے یاوری کی نتیجہ ظاہر ہے کہ اس سلجوقی دربار میں اس کا وہ رسوخ ہوگیا جو فردوسی کو محمود کے دربار میں یا ابوالفضل وفیضی کو اکبری دربار میں بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ زیادہ۔

زمانہ چاہتا تھا اور فردوسی و محمود کی کیفیت سن سن کر خواہش کرتا تھا کہ ہم فردوسی ہوں اور کوئی محمود سا قدرداں ملے ظاہر ہے کہ حسب خیال زمانہ حقایقی کو بھی کبھی اس کا خیال ہوا ہوگا لیکن اپنی حیثیت کسی اور ناکامیابی کے خیال سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ ایسا ناممکن خیال سوا اس کے کہ دل کو خوش کرے اور کامیابی کا خوش نما پہلو نہیں رکھتا لیکن قسمت کی یاوری نے دکھا دیا کہ کچھ محمود اور فردوسی ہی پر موقوف نہیں ہماری مدد چاہئے پھر تو کیسا ہی ناقدردانی کا زمانہ کیوں نہ ہو ایک چھوڑ پچاس فردوسی اور محمود ہوسکتے ہیں۔

قسمت کی نصیحت اور پیشینگوئی ۔ دیکھو!! ہمارے مشکور ہو ہم نے تم کو فردوسی وقت بنادیا اور پھر اس سے تمہارا وقار اور تمہاری عزت دربار میں زیادہ ہے خاقان کبیر کو محمود وقت بنادیا مگر اس کی محبت اور شفقت تم پر بہ نسبت شفقت محمود بہ فردوسی کے زیادہ ہے دیکھو!! خبردار خبردار!! فردوسی سا غرور نہ کرنا ورنہ وہی حال ہوگا جو فردوسی کا اسی قدرداں اور مشفق محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا تھا اور آخر کار وہ بڈھا فاضل طوسی یہی کہتا ہوا دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔

پرسی سال بردم بر شاہنامہ رنج کہ تا شاہ بخشد مرا تاج و گنج
اگر شاہ را شاہ بودے پدر بسر برنہادے مرا تاج زر
چو اندر تبارش بزرگی نہ بود نیارست نام بزرگاں شنود

دیکھو کہیں تمھیں اسے لکھنے کی ضرورت نہ ہو! قدرت کے ہاتھ کسے چارہ آخر وہی ہوا جو قسمت مقدس نے پیشینگوئی کی تھی۔

خاقانی تخلص دربارِ شاہی سے عطا ہوتا ہے ۔ اب تو کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا ۔ روز و شب مدحیہ قصائد لکھے جاتے ہیں اور صلے میں ہزاروں روپیہ عطا ہو رہے ہیں چنانچہ خاقان کبیر کے ہاں مقرر تھا کہ فی قصیدہ ایک ہزار درم صلہ میں دیا جائے اور زر و جواہر اس کے علاوہ ہیں۔!!!

لسان الغیب نے کیا سچ کہا ہے ع قبول خاطر لطف سخن خدا داد است ۔ ہمارے اس نامور ہیرو کا تخلص پہلے تو "حقایقی" تھا لیکن شاہ خاقان کبیر نے خاص اپنی عنایت سے عنایت کے ثبوت میں "خاقانی" تخلص عطا فرمایا۔ تقدیر پکاری "ہاں یا ایہا الشاعر!" خاقان کبیر اپنی مملکت کا بادشاہ اور خاقان ہے تو تم ملک سخن کے بادشاہ اور خاقانی ہو۔ اللہ مبارک کرے " ہمارے حقایقی کے زمانہ عروج میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ "حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی شاہ مملکت سخن محبوب خاقان امیر خاقانی اعظم ہے ۔

غرور اور بے ادبی ۔ قاعدہ ہے کہ کمال کے ساتھ غرور بھی آجاتا ہے خصوصاً فن شعر کا تو خاصہ ہے کہ جہاں اس میں کمال ہوا وہیں کمبخت غرور نے آلیا تیر و سودا کا بھی یہی حال تھا ۔ ایسے کریم النفس بہت کم نکلیں گے جنہیں نام کو بھی غرور نہ ہو، بدقسمتی سے خاقانی کے دل میں بھی غرور آگیا کہ ہم وہ ہیں کہ قبولیت سخن میں سب ہم سے کمتر ہیں دربار میں وہ وقعت ہے کہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ عامل یا حاکم کو نہیں ہے" اس لغو خیال کا آنا تھا کہ خاقانی کا رنگ ہی بدل گیا اور کسی کو اپنی نظر میں مانا ہی چھوڑ دیا ۔ پہلے پہل اپنے استاد معظم علامہ ابو العلائی گنجوی سے دو دو کی ٹھیرا دی۔ بھلا ہمارے یہاں کے نصیر و ذوق کی لڑائی کیا حقیقت رکھتی ہے ایسی تو تو میں میں ہوئی کہ توبہ بھلی۔ اس تو تو میں میں کے سبب حکیم افضل الدین خاقانی نے علامہ ابو العلائی گنجوی کی اور ہائے ہائے اپنے استاد کی" ہجو" لکھی اور بُری لکھی اگرچہ اُدھر سے بھی جواب کی ٹھیرائی گئی، لیکن اِدھر کی زیادتی خلق اللہ میں مشہور ہوگئی خاقانی کے ہوا خواہ کہتے ہیں کہ پہلے ابو العلائی کی جانب سے چھیڑ ہوئی اول تو یہ بالکل خلاف ہے مگر ہم مان لیتے ہیں کہ اچھا اسی کی جانب سے پہلے پہل چھیڑ ہوئی ؟ لیکن ابو العلائی کا خاقانی کون تھا؟ شاگرد تھا پس اگرچہ ابو العلائی نے پہلے زیادتی کی ہوتی مگر خاقانی کو ہرگز ہرگز ہجو نہ لکھنی چاہیئے تھی ۔ جو کچھ ہو آخر استاد تھا حضرت امیر المومنین علیؓ فرماتے ہیں کہ جس نے مجھ کو ایک حرف بھی سکھایا ہے تو وہ میرا آقا ہے میرا مولا ہے میں اس کا غلام ہوں !!! مقام غور ہے کہ ابو العلائی تو وہ شخص تھا جس نے اُسے خاقانی بنایا اس کو بچپن سے پڑھاتے پڑھاتے فراغت کرائی ۔ تمام علوم درسیہ کی جس کی خدمت میں اور جس زبان سے خاقانی نے تحصیل کی وہ ابو العلائی کی خدمت اور اسی ابو العلائی گنجوی کی زبان تھی ۔ کہاں تو ایک حرف کی تعلیم سے معلم آقا کی بجائے ہو جاتا ہے اور ابو العلائی نے تو دفتر کے دفتر خاقانی کو سکھائے تھے بھلا کیا وہ اس

لا لو۔ یہی نتیجہ ہے۔ اپنے بڑوں کا جیسے زبانی ادب ہوتا ہے ویسا ہی اس کا عملی کرنا اور اس کے حق میں بد زبانی نہ کرنا ادب ایک ایسی چیز ہے کہ انسان کو فرشتہ خصلت کا منبع بنا دیتی ہے ہمارے روحانی بزرگوں سے کیسے کیسے ادب کے کام سرزد ہوئے ہیں کہ آدمی انھیں بلا مبالغہ یا افسانہ کہہ دے۔ حالانکہ وہ واقعی سچی باتیں ہیں صرف دل سمجھنے والا اور دماغ غور کرنے والا ہونا چاہیے۔ حدیث میں ماں باپ کے ادب کو ضروری ہونا اور ان کی رضامندی کو باعث نجات ہونا اس پیرایۂ لطیف میں بیان کیا ہے کہ ماں باپ کے پاؤں تلے جنت و دوزخ ہیں سمجھ لو ان کی رضامندی باعث عطائے جنت اور ناراضگی باعث جہنم نہ ہوگی مولانا روم کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم ماند از لطف رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

قسمت کی پیشین گوئی ٹھیک آئی - الغرض مقدس قسمت کا کہا ٹھیک اُترا اور اسے اپنے استاد شفیق کی ہجو نویسی کا اثر ظاہر ہونے لگا - اقبال کا چمکتا ہوا ستارہ ڈوبنے لگا اور تقدیر کی بلندی کا آفتاب غروب ہونے کو آیا **استاد کی بے ادبی کی تو نتیجہ بھی بُرا پایا** - خاقانی کی عمر اب زیادہ ہو چلی تھی اور اب باعتبار سن و بتقاضائے وقت حسب قاعدہ کچھ اور ہی رنگ بڑھ گیا تھا طبیعت میں حقائق و معارف کا دریا جوش زن تھا بات یہ کہ شاعری کے کمال کی آخری سیڑھی حقیقی عشق ہے اور مزے دار صوفیانہ خیال ہیں مجازی عشق کی باتیں شاعری میں زیادہ تر ہوا کرتی ہیں اسی کی ترقی کا نام عشق حقیقی ہے جیسا کہ کہا گیا کہ المجاز قنطرة الحقیقة ، اس کا لطیف ترجمہ دیکھنا ہو اور وہ بھی نظم میں تو راقم الحروف آزاد کا یہ اُردو شعر دیکھ لو !

ہوتا ہے مجازی سے حقیقت کا توصل
ہے نفع بھی اس عشق کے ہمراہ ضرر بھی

مجازی اور جھوٹی محبت میں عمر کا گرانمایہ حصہ تمام ہوا تھا دل نے کہا کہ ”تمام عمر تو اس جھوٹے اور مجازی عشق کے بیان اور پرستش میں گزری لاؤ اب اسی آخری عمر کو عشق حقیقی کے مشغلہ میں صرف کریں۔ بس یہی خیال شعرا کو حقائق و معارف تک پہونچاتا ہے پھر اس وقت کے کلام میں ایک خاص لطف ہوتا ہے جو کبھی لسان الغیب اور کبھی اسرار الغیب کبھی بلبل شیراز کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ سعدی ، حافظ ، جامی ، خسرو ، نظامی گنجوی وغیرہ کے عشق حقیقی کے بیانات اور محبت الٰہی کے ارشادات اسی قبیل سے ہیں -

خاقانی پر بھی آخری الامر یہی حالت طاری ہوئی اور یہی خیال غالب ہوا پھر تو تصوف کے رنگین اور حقائق

سے بھرے ہوئے خیالات ہیں اور خاقانی کا دل ۔ اس کا دل ، ہے اور عشق حقیقی کا لگاؤ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ جب تک اہل دول کی صحبت اور جھوٹی مدح کا راگ گایا جاتا ہے، تب یہ خوش نا رنگ نہیں پاتا ۔ اس رنگ کے لئے اس سے علیحدگی چاہیئے ۔

گرفتاری۔ الغرض اسی خیال سے خاقانی نے خاقان کبیر اپنے ممدوح سے رخصت چاہی اُدھر محبت خاقانی کا لطف کہاں فراموش ہو سکتا تھا، کہا " یہ تو غیر ممکن ہے "، خاقانی جب اس میں ناکامیاب رہا تو دوسری کوشش شروع کی اور پوشیدہ فرار کرنے کی ٹھیرائی ۔ ایک دن وقت دیکھ کر وہاں سے اس نے فرار کیا او شہر بیلقان جو اس کا اصل وطن تھا پہنچا ۔ اور شکرانہ بجا لایا کہ محبت اہل دول سے نجات پائی اور بخیر و عافیت اپنے وطن پہنچا لیکن قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا اور ہجو استاد کی ایک بار سزا پانی تھی شاہی کارندوں نے مطلع ہوتے ہی خاقانی کو گرفتار کر لیا اور اُسے خاقان کبیر تک پہنچا دیا ۔

افسوس ۔

غضب سلطانی نے قید کی ٹھیرائی ہر چند شفقت و رحمت ہاتھ جوڑ کر سفارشیں ہوئیں مگر کسی کی ایک نہ چلی اور یہ فاضل حکیم افضل الدین خاقانی شایران کے قلعہ میں قید کر دیا گیا ۔ دیکھو اقسمت کا کیا ٹھیک نکلا ۔ وہی فردوسی اور محمود کا معاملہ پیش آیا ۔

کئی ماہ قید میں گزر چکے تھے کہ طبیعت سخت گھبرائی ۔ اس تنہائی میں اپنی پرانی رفیق شاعری کے سوا کون غمخوار تھا؟ اسی شغل سے طبیعت بہلانی شروع کی چنانچہ تحفۃ العراقین ایک عجیب پر لطف نظم وہیں تصنیف کی اور ایک قصیدہ بھی وہیں لکھا جس سے اس کی لیاقت علمی اور وسعت معلومات اور قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے یعنی اس میں آتش پرستوں کی اصطلاحات لغات ان کے حالات وغیرہ نظم کئے ہیں ۔ سات مہینے قید میں گزرے تھے اور مثل فردوسی کے اس کا بھی زمانۂ کلفت قریب الاختتام تھا ۔

رہائی ۔

قصیدہ جوں ہی خاقان کبیر کی نظر سے گزرا خیال آیا کہ ایسا باکمال اور قید کیا جائے ۔ حکم دیا کہ فوراً باکمال شاعر رہا کر دیا جائے ۔ خاقانی اس خبر مسرت اثر کو سنتے ہی پھولا نہ سمایا اور رہا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ریاضت میں مشغول ہو گیا سوچا کہ خدمت ملوک کا تو نتیجہ دیکھ لیا آؤ اب خدا تعالیٰ کی جو حقیقی شہنشاہ ہے خدمت کریں جس کا نتیجہ عقبیٰ میں کام آئے

زہد و ریاضت — زہد و ریاضت میں ایسے کمالات بہم پہنچائے کہ اب شاعری کی صفت بالکل معدوم ہوگئی اور ولایت اور تقدس کا ضمیمہ مثل نظامی اور رومی کے نمایاں کی جانے لگی۔ جیسا شاعری میں اپنے کمال کا سکہ قلوب خلائق پر جمایا تھا ویسا ہی اب اپنی بزرگی کا سکہ جما دیا اور اولیائے کاملین اسے اولیائے کاملین میں شمار کرنے لگے چنانچہ عارف کامل حضرت عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ اپنے تذکرۃ الاولیاء میں اولیا کے زمرے میں خاقانی کو شمار کرتے ہیں اور بڑی تعریف اور ثنا کے بعد ایک دو شعر ایسے نقل کرتے ہیں کہ جن سے عشق حقیقی کی بو آتی ہے

حج — حج کے شوق نے مکہ اور مدینہ کی زیارت کرائی موفق التوفیق جمال الدین کے ہمراہی تھے راہ حجاز میں جو اس نے پرلطف قصیدہ لکھا ہے اس کا مطلع یہ ہے ؎

سرحد بادیہ است رواں باش برسرش تریاق زہر کن زنسیم معطرش

ان متبرک مقامات سے فیوضات باطنی حاصل کر کے وطن واپس آیا اور اپنے کمالات ظاہری اور باطنی اور سرمایہ قصائد و کمال چھوڑ کر اور بقائے دوام کی نعمت لے کر اس فاضل حکیم نے ۵۹۲ھ میں شہر تبریز میں انتقال کیا اور مقام سرخاب میں مدفون ہوا۔ اس کے اردگرد اور بھی شعرا کی قبریں ہیں۔ منجملہ ان کے ظہیر فاریابی اور شاہ معوذ وغیرہ کے مزارات باعث رونق ہیں اس لئے اس جوار کو مقبرۃ الشعرا کہتے ہیں۔

آزاد دہلوی از کلکتہ

مولانا آزاد
کی
چند یادگار تحریریں

۳۰

شرح و تفصیل کی اب ~~نہیں~~ ضرورت نہیں ہے ۔ اجمال خود بخود دور ہو گیا ۔

(۳) طبع اول میں ذیلی عنوانات کی تقسیم ناکافی سمجھی گئی تھی ۔ اب جابجا حاشیہ کے عنوانات بھی بڑھا دیے گئے ہیں ۔ ان عنوانوں سے تمام مطالب اس طرح منضبط ہو گئے کہ ہر ایک نظر میں خلاصہ مطالب کو سمجھا جا سکتا ہے ۔

(۴) پورے ترجمہ پر ~~مجموعی~~ نظر ثانی کی گئی ہے ۔ عمل میں نظر رکھی گئی کہ زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سہل و شستہ اسلوب پیدا ہو جائے جو پہلے سے تھا ۔ جہاں تک متن کا لفظی انداز قائم رکھا جا سکتا تھا ~~[illegible]~~ متن مفردات کی تطبیق عملاً صحیح مطلب کا ترجمہ کر دیا ہے ۔ وہ اب اس کا مطالعہ کریں گے تو انہیں ہر دوسری تیسری سطر میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ~~محسوس ہوگی ۔ انہیں ضرور محسوس ہوگی~~ ۔

(۵) ترجمہ کے تشریحی نوٹوں میں بھی جابجا اضافے کیے گئے ہیں ۔

بہ حیثیت مجموعی یہ طباعت پچھلی طباعت سے اپنی خصوصیات میں اس درجہ مختلف ہو گئی ہے کہ میں خیال کرتا ہوں جو پچھلی طباعت کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکیں گے ۔ وہ نقش اول تھا ۔ یہ نقش ثانی ہے ۔

قید خانہ قلعہ احمد نگر
۲۰ فروری ۴۵ء

ابوالکلام

دیباچہ طبع ثانی ترجمان القرآن کا آخری صفحہ

جامع مسجد کی تقریر

(۱۹۴۷ء)

عزیزانِ گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا، جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لیے۔ میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی "تلخ نوا سیاست" جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم، کہ آج انہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا۔ جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی

اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اسی کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا تھا، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں، وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور انہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں، لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔۔۔

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ

"تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت

حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شئے چھن گئی اور اس کی جگہ بری شئے آگئی۔ ہاں تمہاری بے قراری اس لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شئے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بری شئے ہی کو ملجا و ماوا سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا ہے۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں لیکن مجھے آج جو کہنا ہے، میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارا بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں سوچ بھی سکتے ہیں یا نہیں؛ اسی خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر بھی غور کرو۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ

یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بیجا تھا، اسی طرح آج تمھارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غایب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔ جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔ ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمھاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہوگئی ہے تو پھر اسی طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم انھی صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہیں۔

عزیزو - تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اسی کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمھارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شاہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان لا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین ط

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں۔ اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی

چیز نہیں کہ تمھیں خرید کرلا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمال صالح کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

زباں ز نطق فرو ماند راز من باقی است

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی است

رام گڑھ کانگریس کے خطبے سے

(۱۹۴۰)

مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں میں لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ بات کہ ہندستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لئے ایک جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملے کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گزشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشے میں دو باتیں خاص طور پر ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں، ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اتنی بات آپ کو یاد دلادوں گا کہ اگر اس معاملے کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (نمبر) کے ساتھ نوعیت (کانٹنٹ) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے کی زیادہ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر اسے ایک اقلیت فرض کر لیا جائے۔ کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں تو اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (فیکٹرس) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکہ دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی

اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یکجہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کردیا جائے تو چار کی جگہ پانچ صوبے ہوجاتے ہیں۔ اور مسلم اکثریت اور اقلیت کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک اقلیت کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرسکے۔

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے کل حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے، ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں ایک لمحہ کے لیے باور نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے مستقبل نقشہ میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہورہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے، ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بےخوف و خطر کودنا چاہیے۔ جونہی ہم نے ایسا کیا

ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جد و جہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو [illegible] برس سے بیگانگی اور مخالفت کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد اس آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اس کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کر لیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب میں موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلا شبہ ہماری راہ دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور ہمیں بھی یہ خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے تو پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھتے جائیں۔

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے

پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لئے ممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے، بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے اندر کے ایک ایک کونے سے دھونا کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظربندی کے بعد رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر ستائیس برس گزر چکے۔ اس عرصہ میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے سیلاب آئے، خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں، تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام ذہنیت پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ آگے بڑھنے کی راہ اس پر کبھی مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، ان میں کوئی ایسی حالت نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا، اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں، اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں، میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے، جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا مگر میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے۔ ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں

زندگی کی محسوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلے کی دیواریں تعمیر کرتی ہیں۔ ایسی دیواریں ریت بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کر لیں۔ وہ اس کے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں میں ہندستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔

ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ انہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے جدا بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی۔

اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے، جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی ہیں۔ اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرہ کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس، تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر وہ اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں تو بہتر ہے۔

ہماری اس ایک ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔

ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے۔ اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

اردو مختصر نویسی

اصل یہ ہے کہ اردو مختصر نویسی کا قاعدہ انگریزی مختصر نویسی کی بنیاد پر ہے، دونوں ان نقائص کے ذمہ دار ہیں۔ اردو مختصر نویسی کا قاعدہ ۱۹۰۸ء میں کرسچین کالج لکھنؤ کے دو پروفیسروں نے ایجاد کیا تھا جن میں سے ایک کا نام مرزا محمد ہادی رسوا ہے۔ میں اس وقت لکھنؤ میں تھا اس لیے مجھے ذاتی طور پر اس کے دیکھنے اور موجدوں سے گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے موجدوں نے انگریزی علامات بہت تھوڑی سی تغیر کے ساتھ منتقل کر لی ہے، لیکن وہ اردو حروف و الفاظ کی پوری طرح نمائندگی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خود انھیں بھی اس نقص کا ایک حد تک اعتراف تھا لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ مختصر نویس اپنی ذاتی قابلیت اور عادت و مناسبت سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ میں اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تجربے سے ان کا خیال درست نہ نکلا۔

صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے ابتدائی تجربے کے بعد دو پولیس سب انسپکٹروں اور ایک کلرک کو تعلیم دلائی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے آزمائشی طور پر جن پبلک تقریروں کو قلم بند کیا، میں بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ میری اور شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی تقریریں تھیں۔ ہم دونوں نے انجمن اسلامیہ ہردوئی کے سالانہ جلسے میں لکچر دیے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا شبلی نے فی منٹ ساٹھ لفظوں کے رفتار سے تقریر کی تھی، اور میری تقریر فی منٹ ستر سے نوے تک تھی جیسا کہ خود مختصر نویسوں نے ظاہر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی تیز رفتار نہ تھی۔ تاہم جب انھوں نے اپنا کام مرتب کر کے دکھلایا تو بالکل ناقص اور غلط تھا۔ اس کے بعد بھی مجھے بارہا اپنی تقریروں کے قلم بند کرانے کا اتفاق ہوا، لیکن ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ نکلا۔ ابھی سال کی بات ہے کہ خلافت کانفرنس آگرہ میں میرا زبانی پریسیڈنشل ایڈریس ایک مشاق مختصر نویس سید غلام حسین نے قلم بند کیا جو عرصے تک یو۔پی کے محکمہ سی۔آئی۔ڈی میں کام کرنے کے بعد مستعفی ہوئے۔ لیکن جب لانگ ہینڈ مرتب کر کے مجھے دکھلایا گیا تو اس کا کوئی حصہ صحیح اور مکمل نہ تھا۔

یہ تو اصولی قاعدے کا نقص ہے، لیکن جب اس پر مختصر نویسوں کی ناقابلیت کا بھی اضافہ ہو جائے تو پھر یہ ایک خرابی ایسی نہیں ہے جس سے انسانی تقریر صحیح نقل کی جا سکے۔ کلکتہ اور بنگال کی مخصوص حالت میں اس نقص کو اور زیادہ مضحکہ خیز حیثیت بنا دیا ہے۔ یہاں کے دیسی اور یورپین افسر خود اس اردو زبان سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ معمولی طور پر بول بھی نہیں سکتے۔ ان کے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی زبان سے کسی مختلف لہجہ میں آواز نکالے، اردو کا ماہر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پولیس اور عدالت ان رپورٹروں اور مختصر نویسوں کو بطور سند کے استعمال کر رہی ہے، جن بیچاروں کی استعداد پر ہمیشہ ہم لوگ تمسخر کیا کرتے ہیں۔

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلکتہ کی پولیس اور [illegible] میں ایک شخص بھی اردو زبان کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اگر یہاں اس حقیقت کا کچھ بھی احساس ہوتا، تو صرف یہی بات بطور ایک عجیب واقعہ کے خیال کی جاتی کہ میری تقریروں کے لیے پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی کے غریب رپورٹروں کی شہادت لی جا رہی ہے! میں تسلیم کرتا ہوں کہ کم از کم یہ منظر ضرور میرے لیے تکلیف دہ ہے!

(عدالت کے سامنے ۱۹۲۱ء کے تحریری بیان سے)

تحریری بیان کا آخری حصّہ

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ، اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے، اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا! والحمد للہ اولاً و آخراً۔

احمد (۱۱ر جنوری ۱۹۲۲ء پریسیڈنسی جیل۔ علی پور بنگالہ)

خطوط

غلام رسول مہر کے نام

کلکتہ

۲۵-جنوری ۱۹۳۷ء

عزیزی

میں کبھی آپ کو اخبار کے مسائل و روش کی نسبت کچھ نہیں لکھتا۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں ہر شخص اپنے اخبار کی روش بہت سی مقامی اور ماحولی مصلحتوں کی بنا پر تجویز کرتا ہے اور جب تک وہ خود خواہش مند نہ ہو، کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں دینا چاہئے مگر بعض اوقات آپ فریقانہ مخالفت کے جوش میں اتنے دور چلے جاتے ہیں کہ منطق و استدلال کی کوئی حدبندی باقی نہیں رہتی اور اس محبت کی وجہ سے جو آپ سے ہے خیال ہوتا ہے کہ آپ کو ایسا تو نہیں کرنا چاہئے۔

اس وقت ڈاک آئی تو سب سے اوپر "انقلاب" تھا۔ میں نے کھولا تو ایک نوٹ پر نظر پڑی "سرحدی کانگرسیوں کے ارادے"، اس میں آپ لکھتے ہیں کسی نے ڈاکٹر خان سے پوچھا (منہ؟) گویا کبھی سرکار کے لئے کیا کروگے؟ انھوں نے کہا "فوراً منسوخ کر دیں گے" "اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ سرحدی کانگرسیوں کی اسلام دشمنیوں کا کیا حال ہے؟"

کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اس معاملے کو اسلام اور مسلمانوں کی مذمت تصور کرتے ہیں جو فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کے مقاصد کے لئے زیادہ سے زیادہ مہلک معاملہ ہے اور جس سے بڑھ کر شاید ہی فتنہ پردازی کی کوئی بات موجودہ سیاسی دور میں ہوئی ہو! آپ لوگ اس بات پر تو بہت خوش ہو گئے کہ اس عقل فروش ......

.... نے وحدت زبان و رسم الخط کا راگ گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرل اسکولوں کی سرکاری اعانت بند

کر دینی چاہی ہے مگر اتنی واضح بات سامنے نہ آئی کہ اگر ٹھیک انہی دلائل کی بنا پر کل کو بہار، یوپی، مدراس، آسام اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دیدیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے ؟

اتنا ہی نہیں بلکہ اس فتنہ نے تو اقلیتوں کے حقوق کی ساری عمارت ہی درہم برہم کر دی۔ یہ اصل ہی باقی نہ رہی کہ ان امور کے فیصلے کا حق خود اقلیت کو ہے نہ کہ اکثریت کو۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان اُردو کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں صوبے کی زبان ایک ہی ہو اور وہ بنگلہ ہو۔ اب پریسیڈنسی ڈویژن کی وہ لسانی اقلیت جس کی زبان اردو ہے کیا کرے گی ؟ کل کو اگر اس فتنہ پردازی کی مثال سامنے رکھ کر بنگال نے سرکلر جاری کر دیا کہ صرف انھیں اسکولوں کو مدد دی جائے گی جو بنگلہ زبان میں تعلیم دیں تو اس وقت کلکتہ کے ہزاروں ہندو مسلمان کریں گے جو اپنے بچوں کو بنگلہ میں تعلیم نہیں دینا چاہتے ؟

ایک لمحہ کے لئے اس غلط فہمی میں اپنے کو نہ ڈالئے کہ ہمارے نزدیک حقیقت و انصاف کیا ہے اور از روئے دلائل و مصالح کیا ہونا چاہئے ؟ ان امور میں سوال دلائل اور منطق کا نہیں ہوتا۔ اگر دلائل سے جماعتی کشاکش کا فیصلہ ہو سکتا تو دنیا کے سارے جھگڑے معدوم ہو جاتے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک صوبے کی ایک اقلیت صحیح بنیادوں پر یا غلط بنیادوں پر مگر اپنے بچوں کو کس رسم الخط کی تعلیم دینا چاہتی ہے ؟ اس کو اس کا حق ہے یا نہیں ؟ اور صوبے کی گورنمنٹ کو اس کا اعتراف کرنا چاہئے یا نہیں ؟ تیس برس سے مسلمان پیٹ رہے تھے کہ اس کا حق اقلیت کو ہے نہ کہ اکثریت کو اور اصل اس بارے میں یہ ہونی چاہئے کہ کوئی اکثریت جبراً اپنا فیصلہ دوسرے پر نافذ نہ کرے۔ متعصب ہندوؤں کو اس کے قبول کرنے میں تامل تھا لیکن بات اتنی صاف تھی کہ اسے اعلانیہ رد نہیں کر سکتے تھے وہ چاہتے تھے کہ اس اصل کی کاٹ کے لئے کوئی ہتھیار ملتا نہیں تھا۔ اب صوبہ سرحد نے یہ سرکلر جاری کر کے انھیں بنا بنایا ہتھیار پکڑوا دیا۔ پہلے انھوں نے تھوڑا بہت شور مچا دیا تاکہ حجت قائم ہو جائے پھر خاموش ہو گئے۔ اب بہار وغیرہ میں گورنمنٹیں بننے دیجئے۔ دیکھ لیجئے گا اس ہتھیار کا استعمال کیونکر کیا جاتا ہے ؟ اس وقت آپ لوگوں کو پتہ چلے گا کہ اس سرکلر کی حمایت میں شور مچا کر آپ لوگوں نے اردو کی کیسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے !

ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک وقت یہ پیش آ گئی تھی کہ کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی ویسی عظیم اکثریت ہو جیسی ملک اکثر صوبوں میں ہندوؤں کی ہے اور جہاں وہ بنائی نہ قائم کر کے ہندو اکثریت کے

صوبوں کے لئے مثال قائم کر سکیں۔ وہ اکثریت و اقلیت کے مسئلے میں جو کچھ بھی کر سکتے تھے بحث و منطق تھی، عملی اقدام کی کوئی قوت نہیں رکھتے تھے۔ اب حسن اتفاق سے دو صوبے ایسے نکل آئے جہاں وہ بہار اور یوپی کی ہندو اکثریت کے درجہ کی مسلم اکثریت رکھتے ہیں۔ سرحد اور سندھ اور اس طرح انھیں موقع مل گیا کہ یہاں اپنے طرز عمل کی ایسی مثالیں قائم کردیں جو تمام صوبوں کے مسلمانوں کے لئے عملی دلیل و حجت کا کام دے سکیں لیکن صوبۂ سرحد نے سب سے پہلی مثال جو قائم کرنی چاہی وہ یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کا معاملہ درہم برہم کردیا۔ اور اردو کی مخالفت میں جو کام اردو کے سخت سے سخت مخالف صوبے بھی نہیں کر سکتے تھے وہ اس اسلامی صوبے نے بڑے جوش، و خروش کے ساتھ انجام دے دیا۔ سب سے زیادہ رنج و قلق کی بات جو سامنے آئی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام اخبارات نے بلا استثنیٰ اس کی حمایت کی اور پنجاب کی تمام اردو پرست انجمنوں نے تجویزیں پاس کردیں کسی نے بھی غور کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ فی الحقیقت اردو کی حمایت ہو رہی یا اس کی تباہی کا سب سے بڑا دروازہ کھولا جا رہا ہے۔

قرآن جا بجا اسماء اور ان کی پرستش کا ذکر کرتا ہے اسماءٌ سمیتموھا انتم و اٰباءکم۔ ٹھیک یہی حال مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ چند اسماء و اعلام ہیں، اور جوں ہی کسی کی زبان سے نکل جائیں فوراً ان کی حمایت میں چیخنے لگنا چاہئے باقی رہا حقیقت کا سوال تو یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ اسلام، حقوق، مسجد، اردو، گائے، اور اس طرح کا کوئی لفظ زبان سے نکل جانا چاہئے پھر ہر مسلمان کے لئے بلا کسی شرط کے ضروری ہے کہ اس کی تائید کرے، اگرچہ یہ تائید اسلام اور مسلمانوں کے مقاصد و مصالح کی قطعاً نفی ہی کیوں نہ ہو۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ گاندھی کو لے کر مسلمانوں نے اسلام کی وہ توہین و تذلیل کرنی چاہی (کرنی چاہی کیونکہ الحمدللہ کسی کے کئے سے اس کی تذلیل ہو نہیں جا سکتی) کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال اس پورے دور غفلت و مذلت میں بھی مل سکے۔ غریب گاندھی نے ایک ایسے مقام میں آکر جہاں دنیا کا کوئی رشتہ بھی اظہار حقیقت سے مانع نہیں ہو سکتا صورت حال کا اعلان کیا تو اس پر اس کی ہنسی اڑائی گئی۔ لیکن مسلمان اخبار نویسوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جو دبی زبان ہی سے مگر مسلمانوں کو اس غیر اسلامی خفیف الحرکتی سے روکتا جو انھوں نے ایک بہروپئے نو مسلم کو خرید کر کرنا شروع کردی تھی۔

سرحد کے اس سرکلر کا معاملہ جب پہلے پہل اخباروں میں آیا تو میں نے خیال کیا اس میں کوئی غلط فہمی کام کر رہی ہے۔ کیونکہ خود مسلمانوں کے فرقہ وارانہ نقطۂ خیال سے یہ بات اس درجہ غلط اور مہلک تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا صاحبزادہ عبدالقیوم اور ان کے مشیروں نے ایسا کیا ہوگا۔ لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا واقعی یہی بات ہے۔

اس پر میں نے بستر علالت سے بارہ صفحوں کا خط لکھ کر انھیں بھیجا اور پوری تفصیل کے ساتھ واضح کردیا کہ یہ کارروائی کس درجہ مضر ہوگی چونکہ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے خاموش ہوکر رہ گئے اب معلوم ہوا ہے سرے سے اردو ہی کو اُڑا دینا چاہتے ہیں اور پشتو کے مناقب و فضائل وردِ زبان ہیں

ہمارے ہاں سالہا سال سے کوشش کی جارہی ہے کہ ناگری رسم الخط کے سوا اور کسی خط کا اعتراف نہ کیا جائے۔ دو بار اقدام ہو چکا ہے اور محض کانگریس کی مداخلت سے رُکا ہے۔ اب صوبہ سرحد کی اس حماقت نے از سرِ نو دروازہ کھول دیا۔ چند دنوں کے بعد دیکھ لیجئے گا، وہی زبان، وہی دلیل، وہی منطق کام میں لائی جائے گی جس پر تمام مسلمانوں کی تائید و توثیق کی مہر لگ چکی ہے۔

اگر فی الحقیقت ڈاکٹر خان یا وہاں کی کوئی جماعت ایسا کر چکی ہے کہ اس فتنہ انگیز سرکلر کو منسوخ کردے تو عزیز من! یہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں ہوگی بلکہ ایک نہایت ضروری خدمت ہوگی جو سرحد کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے۔

یقیناً آپ لوگوں نے اس کی حمایت یہ سمجھ کر کی ہے اردو اور مسلمانوں کے مقاصد کی حمایت کر رہے ہیں۔ لیکن کیا معاملہ کا یہ پہلو قابل غور نہیں ہے کہ حمایت کا ولولہ کس طرح ہم سے تخریب و مخالف کا کام کرا رہا ہے؟ اگر مسلمانوں کی رائے عامہ اس سانچے میں ڈھالی جانے گی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ کس طرح لوگ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا مستقبل خطرہ میں ڈالنے لگیں گے؟ افسوس کہ ڈال رہے ہیں، ہر گوشے اور ہر میدان میں!

امید ہے خلافِ معمول میری یہ دراز نفسی آپ پر شاق نہیں گزرے گی۔ اگر آپ کی محبت متقاضی نہ ہوتی تو کبھی یہ قصہ نہ چھیڑتا۔ مقصود یہ نہیں ہے کہ کسی خاص مسلک یا گروہ کی حمایت کی جائے یا مخالفت کی جائے۔ صرف اس حقیقت پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہر مسئلے کو خود اس مسئلے میں دیکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ حزبی مخالفت کی رو میں بہتے جائیں اور جو چیز سامنے آئے اُسے بہاتے ہوئے لے جائیں:

گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد

غالباً در "اسات اللبیب" دہلی میں بھی نہیں ہے۔

شیخ مبارک علی صاحب کے حساب کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ امید ہے خط مل گیا ہوگا۔

"غالب" کے لئے انشاء اللہ ضرور وقت نکالوں گا جس وقت مطالعہ کیا، اگر اسی وقت لکھتا جاتا تو پورا ہوا دقلم بند ہوجاتا۔ اس وقت خیال نہیں کیا۔ بہر حال کوئی نہ کوئی وقت نکال کر ضرور یہ کام انجام دے دوں گا۔

مولوی رجب علی کی خود نوشتہ سوانح عمری کی نقل اگر نہیں دینا چاہتے تو کم از کم ان کی ملازمت و مشغولیت کے ضروری حالات ہی ملخص کر کے دے دیں یعنی جو حالات ظاہر نہیں کرنا چاہتے، چھوڑ دیں، باقی قلم بند کرا کے دے دیں۔ اگر ممکن ہو تو اس کی کوشش کیجئے۔ جو صاحب قلم بند کریں گے، وہ اگر چاہیں تو نقل و کتابت کے مصارف سے لیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام (نقش آزاد)

کلکتہ

۶۔ فروری ۳۷ء

عزیزی

خط پہنچا۔ اس بات سے طبیعت کو نہایت خوشی ہوئی کہ آپ نے اردو سرکلر کی اصل نوعیت محسوس کر لی۔ حق پسند طبائع کا یہی شیوہ ہونا چاہئے۔ جب اصل مقصود اردو کی حمایت ہے نہ کہ مخالفت، تو کیوں ایسے معاملات کی تائید کی جائے، جس نے اردو کے خلاف ایک نہایت سخت خطرے کا دروازہ کھول دیا ہے؟ اس سے کیا فائدہ کہ سرحد کے دو چار ہزار سکھوں یا پندرہ ہزار ہندوؤں کے اسکولوں کی اعانت روک دی گئی۔ جہاں گورمکھی یا ناگری رسم الخط کی تعلیم ہوتی تھی جبکہ تمام ہندوستان کے طول و عرض میں کروڑوں مسلمانوں کے اسکولوں کی اعانت رک جاسکتی ہے، جہاں اردو کی تعلیم دی جارہی ہے اور جن کا مستقبل اس پر موقوف ہے کہ مزید اعانت کا سروسامان ہو۔

اگر سرحد کے سکھوں کو یہ اعانت نہ ملی تو ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ ان کے لکھنے پڑھنے کی زبان قطعاً اردو ہے اور وہ محض اپنے مذہبی علاقے کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کو گورمکھی سے آشنا رکھنا چاہتے ہیں۔ علاوہ بریں خوشحال ہیں۔ اگر سرکاری اعانت نہ ملے گی تب بھی اسکول جاری رکھیں گے لیکن بنگال، بہار، یوپی، بمبئی، سی پی، مدراس، آسام اور کرناٹک میں تو لاکھوں مسلمان ہیں جن کے لکھنے پڑھنے کی زبان ہی اردو ہے اور جن کی اقتصادی حالت اس درجہ گری ہوئی ہے کہ بغیر سرکاری اعانت کے ایک اسکول بھی نہیں چلا سکتے۔

صاحبزادہ عبدالقیوم نے لکھا تھا کہ چالیس ہزار روپیہ سالانہ اس میں خرچ ہو جاتا تھا جو اب بچ جائے گا۔ خیال کیجئے کیا اچھا سودا چکایا گیا ہے۔ محض اس لئے کہ چالیس ہزار روپیہ سرحد میں بچ جائے یہ صورت حال

گوارا کر لی گئی کہ لاکھوں روپیہ جو لاکھوں انسانوں کے لئے تمام ملک میں خرچ ہو رہا ہے، یک قلم بند کر دیا جائے!
یہ سرکلر جاری کیا جاتا یا نہ کیا جاتا، لیکن اردو رسم الخط سرحد کا تعلیمی اور سرکاری رسم الخط ہے، اس حقیقت کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ پس اس سرکلر نے سرحد میں تو اردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا لیکن تمام ہندوستان میں اس نے عالمگیر فتنہ پیدا کر دیا!

سخت اندیشہ ہے کہ تمام صوبے یہ ہتھیار اردو کے خلاف کام میں لائیں گے۔ صرف اردو ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ اقلیت اور اکثریت کے تمام معاملہ میں، کیونکہ اس فتنے نے ساری دنیا ہی الٹ دی ہے، اس وقت اگر مسلمانوں نے احتجاج کیا تو یہ احتجاج کچھ سود مند نہ ہوگا کیونکہ سرحد کے طرز عمل کی عام طور پر تحسین و تائید کی جا چکی ہے۔ پس جس قدر جلد ممکن ہو اس فتنہ کا سد باب کرنا چاہئے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ بروقت انسداد ہو جائے اور ہندو سکھ ایجیٹیشن نے اس کا بہتر موقعہ بہم پہنچا دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ صاحبزادہ عبدالقیوم پریشان حال ہو کر رہ گئے۔

(نقش آزاد) ابوالکلام

کلکتہ

۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۷ء

"........ اتفاقاً ادھر "درفش کاویانی" پر بھی نگاہ پڑ گئی اور تیس برس کے بعد دوبارہ مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ افسوس کہ اس کی خصوصیات پر خواجہ حالی نے کوئی توجہ نہیں کی۔ کئی جہات خصوصیت کے ساتھ ابھارنی چاہئیں، خصوصاً خاتمے کے فوائد۔ یقیناً ملا عبدالصمد ایک غیر معمولی نظر و تحقیق کا آدمی تھا۔ میں چاہتا ہوں یہ سب باتیں آپ کے لئے لکھ دوں اور آپ "غالب" کا دوسرا اڈیشن ہر اعتبار سے مکمل و متمم بنا سکیں۔

افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی شاعری ہی کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی:

نارروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب،

علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالا مال نہ ہوا ہو۔ بلکہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کردیتی ہیں -

ما نزلت انزل فی ودادک منزلا

تتحیر الالباب عند نزولها!

لیکن افسوس، جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے شاید سر و سامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا

کم اردنا ذاک الزمان بمدح

فشغلنا بذم هذا الزمان

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

نقشِ آزاد

کلکتہ

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

عزیزی،

لاہور سے کئی شخصوں نے مجھے "انقلاب" کا ایک کٹنگ بھیجا ہے، جس میں آپ لکھتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں پر بہتان لگایا اور قرآن کریم کی یہ آیت بھی مجھے یاد دلائی گئی ہے کہ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔ بہتان اگر فرد پر لگایا جائے تو سخت جرم ہے لیکن اگر ایک مسلمان خود مسلمانوں پر لگائے تو اس جرم کی شفاعت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کی وہ رائے میری نسبت نہیں رہی ہوگی، جس کی بنا پر آپ اخلاص کرتے رہے ہیں اور یقیناً آپ یہ پسند نہیں کریں گے کہ مداہنت و نفاق سے کام لیں - میں

چاہتا ہوں کہ اس مخمصے سے آپ کو نجات دے دوں۔ آپ نے اس وقت تک جو محبت و اخلاص مجھ سے رکھا ہے، اس کے لیے شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

۷۔ اپریل سنہ ۱۹۴۷ء

عزیزی،

خط پہنچا اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے میرے خط کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک چیز عقاید و مسائل کا اختلاف ہے، ایک شخصی دیانت و عدم دیانت کا معاملہ۔ آپ یقیناً ایک شخص سے عقاید و مسائل میں سخت اختلاف رکھتے ہوئے بھی اخلاص و محبت رکھ سکتے ہیں اور یہ اخلاص اس سے مانع نہیں ہو سکتا کہ اس کے عقاید و مسائل پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں۔ امام بخاریؒ نے عبدالرزاق کی نسبت کہا تھا لو ارتد عبد الرزاق، اگرچہ عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائے جب بھی میں اس کی دیانت پر شک نہیں کروں گا۔ لیکن اگر آپ کے سامنے ایسی باتیں آئی ہیں کہ آپ کو اس دیانت پر اعتماد نہیں رہا اور اختلاف صرف عقائد و مسائل ہی سے نہیں ہے بلکہ شخصی اخلاق و خصائل سے ہے تو اس صورت میں آپ اس سے اخلاص و محبت نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کے لیے اخلاص ابھر سکے جس شخص کے اخلاص و خصائل پر آپ کو اعتماد نہیں رہا، آپ بغیر مداہنت و نفاق کے کیونکر اس سے اخلاص و محبت رکھ سکتے ہیں؟

ایک شخص کی غیر معمولی قابلیت اور دماغی محاسن کا ہم پر اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ جاننے پر بھی کہ وہ اخلاق و فضائل سے محروم ہے ہم یہ تاثر دل سے نہیں نکال سکتے لیکن اس طرح کے تاثر کو دوسرے ناموں سے پکارنا چاہیے "اخلاص" اور "محبت" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

لاہور سے جو کٹنگ انقلاب کا آیا تھا، وہ اس کے لیڈنگ آرٹکل کا تھا۔ ابھی اس بحث میں نہ جائیے

ملے "انقلاب" میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی، جس کا اسلوب بڑا ہی افسوسناک تھا۔ لیکن میں اس وقت لاہور میں نہ تھا۔ بعد میں مولانا کا گرامی نامہ آیا اور میں نے وہ تحریر دیکھی تو معذرت بھی کی، حقیقت حال بھی لکھی، یہ بھی عرض کیا کہ آخری فیصلے سے پیشتر تحقیق فرمالینی چاہیے تھی۔ (غلام رسول مہر) (نقوش ؟ ؟)

میں نے تقریر میں کیا کہا تھا۔ تقریر ہزاروں مسلمانوں نے سنی تھی اور ان سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ اصلیت کیا ہے۔ بہرحال کسی وجہ سے آپ کو یقین ہو گیا کہ میں نے مسلمانوں پر افترا کیا اور اس درجہ یقین ہو گیا کہ مضمون کی سرخی یہی قرار دی گئی۔ نیز جو آیت واقعہ افک کی نسبت نازل ہوئی ہے، وہ میری بابت لکھنی پڑی کہ سبحانك هذا بهتان عظیم۔ اب سوال یہ نہیں ہے کہ آپ میرے عقیدے و مسلک سے اختلاف کیا بلکہ آپ کے سامنے میرے اخلاق و خصائل کا ایک بدترین پہلو نمایاں ہو گیا۔ میں نہ صرف ایک فرد واحد بلکہ تمام مسلمانوں پر بہتان لگانے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے کیا سمجھنا تھا؟ کیا ایک لمحہ کے لیے یہ توقع جائز ہو سکتی تھی کہ آپ بدستور اخلاص و محبت رکھیں گے؟ یقیناً مجھے یہ سمجھ لینا تھا کہ اس معاملے کے بعد آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر کریں گے تو مداہنت ہوگی اور نفاق۔ کیوں نہ میں خود آپ کو اس مخمصے سے نجات دلا دوں چنانچہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو میں نے یہی الفاظ اس خط میں لکھے تھے۔ میں آپ کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا، اگر سمجھتا کہ اب بھی آپ محبت و اخلاص رکھ سکتے ہیں اگر میں ایسی توقع رکھتا تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے تھے، میں آپ کو منافق تصور کرتا۔ میں آپ کو ایسا کبھی نہیں تصور کر سکتا۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ اس لیے میں نے محسوس کیا کہ اب آپ اپنے آپ کو مخمصے میں مبتلا پاتے ہوں گے میں کیوں اسے برداشت کروں کہ ایک شخص، جسے اپنا عزیز سمجھتا ہوں اس مخمصے میں مبتلا رہے؟ مجھے فوراً اس کی راہ کھول دینی چاہیے۔

مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مضمون آپ کا نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب آپ نے لکھا تو صورت حال معلوم ہوئی۔ اگر آپ کا ایسا خیال نہیں ہے کہ میں نے مسلمانوں پر افترا کیا تو ظاہر ہے کہ آپ کے لیے اس مخمصے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ آپ یقیناً مجھ سے اخلاص و محبت اب بھی رکھ سکتے ہیں، جیسا کہ ہمیشہ رکھتے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپ نے تاریخ پنجاب مانگی تھی، جو بھجوا دی گئی تھی۔ اس کی رسید نہیں ملی جب کام پورا ہو جائے تو بھیج دیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

منشی عبد القیوم صاحب خطّاط کے نام

(مولانا کے غیر مطبوعہ خطوط)

(۱)

۴ ۔ اسٹور روڈ ۔ کلکتہ

۲۵ مئی ۱۹۴۲ء

جمع بانی اللہ السلام علیکم خیال ہوا تھا کہ اب میں یہاں آ رہا ہوں اور آپ کو اطلاع دیدوں گا۔ وہاں بالمشافہ گفتگو ہو جائے گی۔ لیکن حالات نے مہلت نہیں دی، اور یہ خیال ختم ہو گیا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت کو ترجیح دی جائے۔

جو کام مجھے درپیش ہے، وہ اتنی مقدار میں ہے، کہ اگر آپ مشغول ہو گئے تو کئی سال تک آپ کو دوسرے کام کی احتیاج پیش نہیں آئے گی۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں کہ کم از کم ایک خوشنویس سے اس طرح کی معاملت کر لی جائے کہ وہ بے فکر ہو کر میرا کام انجام دیتا رہے۔ یہ معاملت خواہ کام کی معینہ اجرت پر ہو خواہ ماہوار تنخواہ پر۔ ہر صورت کے لئے میں طیار ہوں۔

لیکن اس کے لئے ضروری ہوگا کہ بیچ میں اور خوشنویسوں کا تعدد حائل نہ ہو۔ خوشنویس میرے ساتھ رہے اور مجھے کاپیوں کی نگرانی اور صحت کا فوری موقعہ ملتا رہے۔

کیا آپ اس کے لئے طیار ہیں؟ اگر طیار ہیں تو تفصیلات سے مطلع کیجئے۔ میں سردست آپ کو کلکتہ میں بلوا لوں گا اور اپنے ہی یہاں رکھوں گا۔ آپ کام شروع کر دیں گے، اور جوں جوں کاپیاں طیار ہوتی جائیں گی، بلا تاخیر چھپتی رہیں گی۔ چھپائی کا انتظام کر لیا ہے۔

آپ اگر چند ماہ کے بعد مکان جانا چاہیں گے۔ تو معین ایام کے لئے ضرور جا سکیں گے لیکن اس صورت میں ضروری ہوگا کہ کام ساتھ لے جائیں اور جاری رکھیں۔ اس کے بعد واپس آ کر پھر یہاں مشغول ہو جائیں۔

میری کوشش یہی ہوگی کہ آپ کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاؤں اور مجھے امید ہے کہ آپ اس معاملت کو ہر طرح خوش دلی سے انجام دینے پائیں گے۔

اگر آپ طیار ہوں تو بہ تفصیل صورت حال سے مطلع کیجئے۔ راقم کے متعلق آپ کی خواہش کیا ہوگی؟ آپ کے کام کی روزانہ مقدار عام طور پر کیا ہے؟ آپ کس وقت تک کلکتہ آسکیں گے؟

کیا آپ کو اپنے نسخ پر اب اطمینان ہے؟ کیا آپ ترجمان القرآن کا متن بھی لکھیں گے؟

حتی الوسع جلد جواب دیجئے۔

ابوالکلام

(۲)

۳ - اسٹور روڈ - کلکتہ

۲ ۵ ۴۴ء

جبی فی اللہ خط پہنچا۔ مکان کا بُعد اور علائق کا تفرقہ بلاشبہ ایک دقت ہے۔ مگر ایسی دقت نہیں ہے جو روپیہ سے حل نہ کی جا سکے۔ علاوہ بریں میں اس کے لئے بھی طیار ہو جاؤں گا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آپ کسی دوسری جگہ مقیم رہ کر سلسلہ بسلسلہ ہی کام کرتے رہیں۔

بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے مل لیں۔ میں دہلی جا رہا ہوں۔ آپ ۱۱۔ مئی سے ۱۵ تک مجھ سے وہاں مل سکتے ہیں۔ خط و کتابت میں تفصیلی گفتگو مشکل ہے۔ بالمشافہ ساری باتیں صاف ہو جا سکتی ہیں والسلام علیکم

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۳)

۱۹ - ۱/۷ بالی گنج سرکلر روڈ - کلکتہ

۲۴ شۂ ۴۴ء

جبی فی اللہ السلام علیکم قرآن کی کتابت کا نمونہ جو آپ نے بھیجا تھا مل گیا۔

دہلی میں آپ نے کہا تھا کہ جون میں آپ وہاں کے کاموں سے فارغ ہو جائیں گے اور کلکتہ کا قصد کریں گے لیکن اب میں ارادہ کر رہا ہوں کہ چند ماہ کے لئے مسوری چلا جاؤں اور وہیں آپ کو بلاؤں۔ زیادہ سے زیادہ مجھے تاخیر ہوئی تو جون کے آخر میں روانہ ہوں پس آپ مجھے لکھیں کہ وہاں آپ کی مشغولیت کا کیا حال ہے اور کب تک فارغ ہوں گے۔

ابوالکلام

(۴)

۱۹- ۱، ۷- بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۹ ۶/۴۳ء

حبی فی اللہ　　جواب میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ ڈاک کئی دنوں کے بعد آج دیکھی پچھلے سفر کے بعد سے طبیعت بے حد مضمحل ہوگئی ہے اور اختلاج کی شکایت عود کر رہی ہے۔ ڈاکٹر مُصر ہیں کہ کسی سرد مقام پر چلا جاؤں لیکن علائق مختلف صورتوں میں نمایاں ہو کر مانع ہو رہے ہیں۔ بہر حال میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ تین چار ماہ کے لئے بالکل یکسو ہو کر مسوری یا نینی تال میں مقیم ہو جاؤں۔ چاہتا ہوں کہ وہیں آپ کو بھی بلالوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ بصورت مہلت آپ کام لے سکتے ہیں۔ آپ ضرور کام لے لیں۔ اس میں تامل نہ کریں۔ مجھے اگر دیر ہوئی جب بھی امید ہے جولائی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یعنی جولائی کے اوائل میں ضرور روانہ ہو جاؤں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا۔　　والسلام علیکم

ابوالکلام کان اللہ لہ

(۵)

۱۹- بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۳ ۶/۴۳

حبی فی اللہ　　السلام علیکم　　تاخیر کے لئے عذر خواہ ہوں۔ بلاشبہ آپ کو کام لے لینا چاہئے تاکہ وقت کا نقصان نہ ہو۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں میرے کام میں بوجوہ تاخیر ہوگی کم از کم یہ ماہ ضرور نکل جائے گا اگر آپ کو ایسا کام لے لینا پڑا کہ جلد فرصت نہ نکل سکی، تو یقیناً مجھے شکایت کا حق نہ ہونا چاہئے آپ طیار رہئے بلانے میں میری جانب سے تاخیر ہوئی اور ہو رہی ہے۔ آپ اس کے لئے کسی طرح ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔

ابوالکلام

(۶)

کلکتہ

۱۴ ۸/۴۳ء

حبی فی اللہ　　کارڈ پہنچا　　مجھے اس تاخیر کا جتنا رنج ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے لیکن

بعض مجبوریوں [illegible] نے اسے گوارا کرنے پر مجبور کر دیا، اگر آپ ابھی لاہور میں رہیں گے تو میں انشاء اللہ اگست کے اندر اندر [illegible] کہ میرے کاموں کی کیا صورت ہے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

تاج کمپنی سے ترجمان القرآن کے لئے نہیں بلکہ صرف تفسیر سورۂ فاتحہ کے لئے گفتگو ہوئی تھی۔ تفسیر کا جو حصہ ترجمان القرآن میں نکلا ہے وہ خلاصہ ہے پوری تفسیر مع بعض اضافوں کے موجود ہے اور اس کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی اشاعت کا حق انھیں دے دیا جائے لیکن میں نے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ معاوضہ کی رقم کا فوری انتظام نہیں کر سکتے اور میں پسند نہیں کرتا کہ بغیر اس کے کوئی معاملت کروں جس دوسرے پریس کا آپ نے ذکر کیا ہے اس نے اس وقت تک کوئی اس طرح کی خواہش نہیں کی ہے۔

(۷)

جی فی اللہ　　جب پچھلی دفعہ کاغذ کی نسبت پریس سے اطلاع ملی تھی تو میں نے اسی وقت دہلی تار بھیج دیا تھا کہ حسب معمول سو ریم اور بھیج دیں۔ اور خیال یہ تھا کہ انھوں نے بھیج دیا ہوگا لیکن پہلے آپ کے خط موسومہ سیف صاحب سے اور پھر خود کاغذ والے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے نہیں بھیجا، اور وہ منتظر رہے کہ جب رقم پہنچ جائے تب بھیجیں۔ افسوس ہے کہ اس طرح یہ وقت نکل گیا لیکن جتنے فرموں کا کاغذ موجود تھا وہ بھی تو نہیں چھپے۔ کاش وہی چھپ جاتے ۔

بہرحال اب کاغذ جا رہا ہے۔

فہرست کا ابتدائی حصہ میں نے اس لئے نہیں بھیجا کہ اتنی کاپیاں ابھی پڑی ہیں جبھی تک نہیں مزید کتابت میں اتنی جلدی کیوں کی جائے اور فارم آ جائیں تو مکمل فہرست بن جائے۔

اب آپ کے کارڈ سے معلوم ہوا کہ دو کاپیاں اور خراب نکلیں براہِ عنایت ان کی کتابت میں صحت کا التزام کیجئے کیونکہ انھیں یہاں منگوا کر تصحیح کرنا غالباً ممکن نہ ہوگا۔

روپیہ پرسوں پیر کے دن بھیج دیا جائے گا۔　　والسلام علیکم

ابوالکلام

کلکتہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء

(۸)

کلکتہ

۱۸ مئی ۴۷

جی فی اللہ آپ اب طیار ہیں کہ ترجمان القرآن جلد سوم کی کتابت فوراً شروع کر دیں۔ براہِ خیر جواب دیجئے تا کہ مسودہ بھیج دوں ۔ والسلام علیکم ۔

ابوالکلام

اگر کوئی ایسا کام ہاتھ میں لے لیا ہے کہ اب اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے ، اور وہ کام چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تو بلا تامل لکھ دیں تا کہ صورت حال کے مطابق انتظام کیا جائے ۔

(۹)

کلکتہ

۱۷ جون ۴۷ء

جی فی اللہ تعجب ہے کہ آپ خط کا جواب نہیں دیتے میں آپ پر اعتماد کئے بیٹھا ہوں کاپیوں کے لئے کاغذ بھی بھیج دیئے تھے لیکن آپ نے رسید تک نہ بھیجی ۔ کیا آپ کا ہاتھ ابھی تک خالی نہیں ہوا ؟ براہ عنایت صورت حال سے مطلع کیجئے میں نے لکھا تھا کہ جوں ہی کام ختم ہونے پر آئے مجھے اطلاع دیجئے تا کہ مسودہ بھیج دوں لیکن ایک ماہ گزر گیا ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی ۔

آپ نے لکھا تھا کہ مئی کے اواخر تک کا کام ہاتھ میں ہے اوائل جون سے ہاتھ خالی ہو جائے گا ۔ اب تو جون بھی ختم ہونے پر آیا ہے ۔

میں نہیں چاہتا کہ ہاتھ خالی نہ ہو اور آپ اس کام کو بھی ہاتھ لگا دیں ضروری ہے کہ پوری طرح وقت وقت دیا جائے ۔ بہرحال صورت حال سے مطلع کیجئے ۔ اگر کچھ اور دیر ہے تو مضائقہ نہیں لیکن آپ خاموش کیوں رہیں ؟ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۰)

کلکتہ

۳۱ مئی ۵۹ء

جمی فی اللہ آپ کے نام دہلی خط بھیجا گیا جامعہ کے پتے سے مگر کوئی جواب نہیں ملا شاید آپ مراد آباد میں ہیں۔ میں اب بلا تاخیر جلد سوم کا کام شروع کر دینا چاہتا ہوں مسودہ نئی ترتیب کے ساتھ طیار ہے۔ اگر آپ مستعد ہیں تو فوراً مطلع کیجئے۔ مسودۂ نور کے اوراق آپ کے پاس ہیں ان کی کتابت از سرِ نو شروع کر دیجئے۔ مزید مسودہ فوراً بھیج دیا جائے گا۔

خط دیکھتے ہی صورت حال سے مطلع کیجئے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۱)

مہر

(وائسریگل لاج۔ شملہ)

۲۰ جولائی ۴۵ء

عزیزی خط پہنچا۔ ایک تار بھیج چکا ہوں کہ شملہ آکر مل لیجئے۔ اگر ابھی آپ روانہ نہیں ہوئے ہیں تو روانہ ہو جائیے۔ مجھے بہت ضروری بات آپ سے کرنی ہے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا)

(۱۲)

۲۸ جولائی ۴۵ء

عزیزی میں تو سمجھتا تھا آپ نے کتابت فوراً شروع کر دی ہوگی لیکن معلوم ہوا کہ سطر کا انتظام اب ہوا ہے بہرحال اب تیز رفتاری سے کام لیجئے۔ دو مکتوب چند دن ہوئے بھیج چکا ہوں۔ دو آج بھیج رہا ہوں۔ آج کشمیر جا رہا ہوں۔ وہاں کا پتہ گلمرگ کشمیر رہے گا وہاں سے بقیہ مسودہ بھیجوں گا۔ اگست کے آخر میں کشمیر سے واپس ہوں گا اس وقت تک آپ مراد آباد ہی میں رہ کر کتابت کرتے رہیں۔

کشمیر سے واپسی پر یکسوئی ہو جائے گی اور میں آپ کو فوراً بلالوں گا۔
اور تمام باتوں سے مطمئن رہیئے۔
ترجمان جلد اول عنقریب زمزم والوں کو مل جائے گا۔ والسلام علیکم
ابوالکلام

(۱۳)

گلمرگ کشمیر
۶ر اگست ۴۵ء

عزیزی خط پہنچا آج دو مکتوب رجسٹرڈ اور بھیجتا ہوں۔ مکاتیب کی تاریخوں کی ترتیب دیکھ لیجئے گا۔ بہ ترتیب نقل کرنا چاہیئے۔

کاپیوں کی تصحیح کے لئے یہ صورت پیش نظر ہے کہ جب واپس ہوں تو آپ کو تار کے ذریعے اطلاع دیدوں آپ تمام کاپیاں لے کر لاہور آجائیں۔ وہاں چند دن ٹھہروں گا اور تمام کاپیاں دیکھ لوں گا۔ آپ ساتھ ساتھ تصحیح کرتے جایئے گا۔ پھر آپ وہیں لاہور میں کسی پریس کو دیدیں یا مدینہ بھیج دیں۔

نظریۂ اضافیہ کا میں نے احمد نگر میں از سر نو مطالعہ کیا اور بعض مسودات مرتب بھی ہوئے لیکن وہ مزید وقت کے محتاج ہیں۔ غبار خاطر کے لئے دہلی کے ایک صاحب مفتی کفایت اللہ صاحب کا خط لے کر آئے تھے معلوم نہیں وہ یکمشت قیمت دے کر تمام اڈیشن لے سکیں گے یا نہیں۔ اگر آمادہ ہوئے تو میں پہلا موقعہ انھیں دوں گا۔

ترجمان القرآن جلد اول کا نسخہ مع مسودات میں نے میاں افتخار الدین کو دیدیا ہے کہ اپنے منشی کے ذریعہ حاصل کرلیں غالباً آج کل میں ہو جائے گا۔ والسلام
ابوالکلام

(۱۴)

دہلی ۲۳۔ اگست ۴۶ء

عزیزی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے یہ فروگذاشت محسوس کرلی اور درستگی کا موقعہ دیا آیت کا ترجمہ آپ کے خط پر لکھ کر بھیج رہا ہوں درج کر دیجئے۔

لاہور لکھیئے کہ جتنے فارم چھپ چکے ہوں، وہ مجھے رجسٹرڈ بلا تاخیر بھیج دیں۔ یہ بات طے پا گئی تھی کہ جوں جوں کاپیاں جمتی جائیں گی وہ مطبوعہ فارم بھیجتے رہیں گے۔ والسلام
ابوالکلام

منشی عبدالقیوم صاحب خطاط
محلہ گلی شہید مراد آباد

فارم IV

دیکھو رول ۸

اُردُو اَدَب علی گڑھ

مقام اشاعت	سلطان جہاں منزل ، علی گڑھ
نوعیت اشاعت	سہ ماہی
نام پرنٹر	سید انصار حسین
قومیت	ہندوستانی
پتہ	سرفراز قومی پریس لکھنؤ
نام پبلشر	ایضاً
قومیت	"
پتہ	"
نام اڈیٹر	آل احمد سرور
قومیت	ہندوستانی
پتہ	بدر باغ علی گڑھ
نام و پتہ مالک رسالہ	انجمن ترقی اُردو ہند سلطان جہاں منزل

میں سید انصار حسین تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں ۔

انصار حسین

یکم مارچ ۱۹۶۰ء

سید انصار حسین پرنٹر و پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھاپا اور مہتمم رسالہ نے دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

"اُردُو اَدَب"

۱- انجمن ترقی اردو کا یہ سہ ماہی رسالہ جون، ستمبر، دسمبر اور مارچ میں شائع ہوتا ہے -
۲- یہ خالص ادبی و تنقیدی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے ہر پہلو پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحات ہوتا ہے -
۳- قیمت سالانہ دس روپیہ، فی پرچہ ڈھائی روپیہ -
۴- مضامین کے متعلق آل احمد سرور انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ سے خط و کتابت کرنا چاہئے اور خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق مہتمم مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کو لکھنا چاہئے -

---

اُردُو اَدَب
کے
پچھلے پرچے

۱- اُردو ادب کے پچھلے تمام پرچے مجلد مل سکتے ہیں -
۲- یہ پرچے چار جلدوں پر مشتمل ہیں -
۳- ہر جلد کی قیمت دس روپیہ ہے -

شعراء کا انتخابی سلسلہ

مجاز — فیض — اختر شیرانی — احمد ندیم قاسمی — مجروح — سکندر علی وجد — اختر انصاری
مخدوم محی الدین — فراق — اثر — شاد عارفی — جان نثار اختر — عرش ملسیانی — جگن ناتھ آزاد

ہر کتاب کی قیمت ۵، نئے پیسے ہے

مہتمم مطبوعات:- انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ

دیوان غالب اردو

مرتبہ

امتیاز علی عرشی

- غالب کا تمام اردو کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ
- متن ، دیوان غالب کے بارہ مختلف قلمی و مطبوعہ نسخوں اور دیگر حوالوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے ۔ خاص خاص اشعار کی شرح غالب کے الفاظ میں، مرتب کا بصیرت افروز مقدمہ، نسخوں کے اختلافات کی نشاندہی ۔
- غالب کی اصل تصویر کے ساتھ، ممتاز فن کار عبدالرحمن چغتائی کی بنائی ہوئی تصویر بھی شامل ہے ۔
- ضخامت ۶۳۲ صفحے ، کپڑے کی مضبوط جلد ، پانچ رنگ کے ٹائیٹل اور ٹائپ کی خوبصورت طباعت کا مجموعہ ۔

قیمت بیس روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ